UNIVERSAL
LIBRARY

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۵۵ ویں جلد

از جنوری ۱۹۴۵ء تا جون ۱۹۴۵ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۵۵

جنوری ۱۹۴۵ء تا جون ۱۹۴۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی	۱۳۵، ۱۵۴
۱/۲	جناب سید ابو عاصم صاحب ایم۔اے، دیسنہ	۱۵۹
۲	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈھ،	۵۰، ۸۷، ۱۱۴
۳	جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جونا گڈھی	۴۳، ۹۳
۴	مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی	۱۸
۵	جناب ریاض الحسن صاحب	۱۲۰
۶	سید سلیمان ندوی	۳، ۴۳، ۷۵، ۹، ۹۹، ۱۲۹
۷	جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے	۱۲۴
۸	جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی،	۱۰۷
۹	جناب غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی، برار	۶۷
۱۰	جناب محمد خلیل صاحب تجاروی بی ایس سی کالج علیگ، تجارہ، راجپوتانہ،	۱۵
۱۱	جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے لاہور،	۹
۱۲	جناب مولوی محمد صابر صاحب سماٹری ندوی متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،	۱۴۲
۱۳	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۱، ۲۵، ۴۷، ۴۹، ۷۲، ۹۲، ۱۲۴، ۱۲۷
۱۴	مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،	۲۷، ۵۱
۱۵	جناب ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی لکچرار اردو لکھنؤ یونیورسٹی،	۱۵۶
۱۶	جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعۂ عثمانیہ	۱۳۱

شعراء

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈھ،	۱۷
۲	جناب روشؔ صدیقی،	۴۶
۳	سہیلؔ :- جناب اقبال احمد خان صاحب سہیلؔ، اعظم گڈھ	۱۵۸
۴	ہلالؔ :- جناب عزیز احمد صاحب بلالؔ، جھانسی	۱۵۸
۵	جناب یحییٰ اعظمی	۴۶

فہرست مضامین

جلد ۵۵

جنوری سنہ ۱۹۴۵ء تا جون سنہ ۱۹۴۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۳،۵،۲۵۹ ۹،۷۳ ۱۲۹
	مقالات	
۱	ابن خلکان کے فارسی ترجمے،	۴۳
۲	اردو کی دو قدیم کتابین اوران کا زمانۂ تصنیف،	۱۵
۳	اردو کی دو قدیم کتابین،	۱۵۶
۴	استدراک بر ترجمۂ ابن خلکان،	۱۵۴
۵	انڈونیسیا،	۱۴۲
۶	خطبۂ صدارت	۷۵،۹۹
۷	رومہ کا ایک خط	۱۲۰
۸	زمانۂ حاضر کا انسان اور اقبال	۱۳۱
۹	سوزنی	۶۷
۱۰	شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا نظریۂ علم،	۲۷،۵۱
۱۱	"عرفانیاتِ فانی"،	۵۸،۸۷ ۱۱۴
۱۲	غیر اسلامی ممالک مین سود و قمار کا حکم	۱۰۷
۱۳	کیا مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے،	۹۳
۱۴	مقبرۂ ابوالحسن تربتی	۹
۱۵	واگھ بھٹ یا شفاے محمودی	۳۵
۱۶	ہندوستان مین مسلمانون کا نظام تعلیم و تربیت	۳
	ادبیات	
۱	تابشِ سہیل	۱۵۸
۲	غزل دوشش	۴۶
۳	غزل ہلال	۱۵۸
۴	کلامِ احسان	۱۷
۵	غزل یحییٰ اعظمی	۴۶
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	"ادب اور زندگی"	۱۲۴
۲	مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر،	۱۸
	مطبوعاتِ جدیدہ	۷،۲۴ ۱،۷۲ ۱۲۷ ۱۵۹

جلد ۵۵ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۵ء عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱ - ۲
ہندوستان مین مسلمانون کا نظام تعلیم و تربیت	سید سلیمان ندوی،	۳ - ۸
مقبرہ ابوالحسن تربتی	جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے (لاہور)	۹ - ۱۴
اردو کی دو قدیم کتابین اور ان کا زمانۂ تصنیف	جناب محمد خلیل صاحب تجاروی، بی اس سی علیگ، (تجارہ، راجپوتانہ)	۱۵ - ۱۶
کلامِ احسان	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی (اعظم گڈھ)	۱۷
مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر	مولانا سید ریاست علی ندوی	۱۸ - ۲۳
مطبوعاتِ جدیدہ	"ض ع"	۲۴

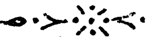
بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

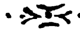
مالوہ کی ریاست دھار کا علاقہ نوین اور دسوین صدی ہجری مین تقریبًا دو صدیون تک اسلامی حکومت کا مرکز رہ چکا ہے، اور وہان مالوہ کے خلجی سلاطین اور ان کے جانشین دوسرے مسلمان فرمانرواون کی بہت سی تاریخی عمارتین ہین، جو محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی مین ہین، ان مین خلجی سلاطین کی تعمیر کردہ ایک جامع مسجد ہے، اس سے متصل سلطان محمود خلجی المتوفی ۸۷۳ھ کا مقبرہ ہے جس مین اس کے قریب زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ سعد اللہ المتوفی ۹۰۲ھ بھی محوِ خواب ہین، اس کے دوسری سمت ایک دوسرے بزرگ مولانا کمال الدین کا مقبرہ ہے، ان کے علاوہ مسجد کے آس پاس اور بہت سے مقابر و مزارات ہین، ریاست دھار اور محکمۂ آثارِ قدیمہ دونون نے جامع مسجد مین مسلمانون کا نماز پنجگانہ ادا کرنے کا حق قائم رکھا ہے، اور وہ برابر اس مین نماز پڑھتے چلے آتے ہین،

ہم کو دھار کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ آج سے آٹھ دس سال پیشتر بعض شرارت پسند اشخاص نے مسجد کو بھوج شالہ

بنانے کی تحریک اٹھائی تھی، جو ریاست کی انصاف پسندی اور عاقبت اندیشی سے کامیاب نہ ہو سکی، اور ۱۹۳۵ء میں اس نے مسجد کی حیثیت اور مسلمانوں کے حق نماز کو قانونی طور سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ اب پھر یہ فتنہ انگیز تحریک اٹھائی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں گذشتہ نومبر کو دھار کے ہندو مسلمانوں میں فساد بھی ہوا جس میں ریاست کے حکام کا رویہ مسلمانوں کے لئے ناقابل اطمینان تھا، اور ان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے، کہ یہ مسجد بھوج شالہ کی شکل نہ اختیار کر لے، ہم کو ریاست دھار کی عاقبت اندیشی سے امید ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء کے منصفانہ فیصلہ کے مطابق مسجد کی حیثیت اور اس میں مسلمانوں کے حق نماز کو قائم رکھے گی، اور اس میں کسی ایسے تغیر کو راہ نہ دے گی، جس سے کسی نئے فتنہ کا دروازہ کھل سکے، محکمہ آثار قدیمہ کا مقصد قدیم تاریخی عمارتوں کا تحفظ ہے اس لئے مذکورۂ بالا مسجد میں اس کے قانون کی رو سے بھی کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا،



آنریبل پرشوتم داس ٹنڈن ہندی ساہتیہ سمیلن کے پرجوش رکن ہیں، اس لئے ان کی ہندی نوازی محل تعجب نہیں، اب انھوں نے ہندی کی حمایت کا ایک نیا اور اچھوتا پہلو پیدا کیا ہے، اور منطقی استدلال سے سوراج کا ہندی زبان سے تعلق ثابت کر دکھایا ہے، چنانچہ آل انڈیا ہندی جرنلسٹ کانفرنس کانپور کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ہے، کہ "ہندی قومیت ہے، قومیت کانگریس ہے، اور کانگریس سوراج ہے۔ (لیڈر ۲۵ دسمبر ۱۹۴۴ء) گویا دوسرے الفاظ میں ہندی سوراج ہے، اس استدلال کے بعد کس ہندستانی کے لئے اختلاف کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، معلوم نہیں سوراج کی اس نئی تعبیر سے کانگریس کے دوسرے ذمہ دار ارکان کو کہاں تک اتفاق ہے، اگر کل کو ٹنڈن جی نے ہندو مذہب کو سوراج قرار دیدیا، تو ہندوستان کی دوسری قوموں کا ٹھکانا کہاں ہوگا، ٹنڈن جی کو ہندی کے پرچار کی پوری آزادی حاصل ہے لیکن کانگریس کے ذمہ دار رکن کی حیثیت سے اس قسم کے مسائل میں کانگریس اور سوراج کو درمیان میں لانا کانگریس کے ساتھ نادانی کی دوستی ہے،



ان کے ایک دوسرے ہم مشرب مسٹر ساورکر نے ہندو مہاسبھا کے اجلاس بلاسپور میں ہندوستان کی تقسیم کے جواب میں گندھار (افغانستان) کو بھی ہندوستان میں شامل کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے، (لیڈر ۲۸ دسمبر ۱۹۴۴ء) یہ ارادہ نہایت مبارک اور تجویز بہت معقول ہے غالباً پاکستان کے حامیوں کو بھی اس کے ماننے میں کوئی تامل نہ ہو، بلکہ اگر مسٹر ساورکر ایران و ترکستان کو بھی جہاں تک کسی زمانہ میں بدھ مذہب کا اثر پہونچا تھا شامل کر لیں تو اور زیادہ مناسب ہے، لیکن اس بارہ میں ان کو پہلے مالوی جی اور ڈاکٹر مونجے سے مشورہ کر لینا چاہئے، ورنہ کہیں سعدی از دست خویشتن فریاد" کی مثل نہ صادق آجائے،



ناظرین کو معلوم ہے کہ معارف کی ضخامت اب کل ایک تہائی رہ گئی ہے، گو صفحات کی سطریں زیادہ کر دی گئی ہیں، اور خط خفی کر دیا گیا ہے، لیکن اس سے اس کمی کی پوری تلافی نہیں ہو سکی ہے، اس لئے معارف کے ابواب کے صفحات بھی گھٹا دینا پڑا اور اسکے متعلق مضامین، استفسارات، ادبیات و مطبوعات جدیدہ کی آمد کا سلسلہ ویسے ہی جاری ہے، اور ان کی اشاعت و جواب خصوصاً ریویو کے تقاضے کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں اس لئے گذارش ہے کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے کچھ تاخیر ضروری ہوگی لیکن انشاء اللہ دیر سویر مضامین و منظومات کی اشاعت و استفسارات کے جوابات اور کتابوں پر تبصرہ ہوتا رہے گا، اور یہ جبری تاخیر قابل معافی تصور کی جائے گی،



مقالات

ہندوستان مین مسلمانون کا نظام تعلیم وتربیت

(۲)

مصنف کے نزدیک جدید و قدیم کے توازن کی یہ شکل ہے کہ مثل سابق نصاب تعلیم مین دینیات تفسیر وحدیث وفقہ کی ایک ایک کتاب مثلاً جلالین ومشکوٰۃ وشرح وقایہ رکھکر باقی دینی کتابون کو ہٹا کر ان کی جگہ غیر دینیاتی علوم منطق وفلسفہ وریاضی وہندسہ واصول وکلام وادب کو دی جائے، ان کا منشا یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ اسلامی حکومتون کے زمانہ مین تعلیم کی صورت یہ تھی، کہ فارسی اور متوسطات تک تعلیم کاروباری اور مذہبی اشخاص دونون کی مشترک تھی، کاروباری، وسرکاری ملازمت پیشہ یہان تک پہنچ کر اپنے کاروبار مین لگ جاتے تھے، اور جو باقاعدہ عالم ہونا چاہتے تھے، وہ پھر باقی علوم کی تکمیل کرتے تھے، اسی طرح اب بھی ہوسکتا ہو کہ ایک ہی نظام تعلیم ونصاب تعلیم ساری قوم مین جاری ہو جس مین ابتدائی دینی واخلاقی تعلیم اردو وفارسی وعربی یا انگریزی اور قدیم وجدید علوم کی تعلیم متوسطات کی حد تک بشمول کتب مختصرہ تفسیر وحدیث وفقہ مشترک سب کو یکسان دی جائے، اور اس کے بعد کاروباری لوگ کاروبار مین لگ جائین، اور علوم وفنون کی تکمیل والے اپنی تکمیل کے اسباق وعلوم پڑھیں، بات کہنے مین تو صاف ہو لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ گذشتہ اسلامی حکومتون اور ان کے زمانون کو بھی واپس لایا جائے، یا موجودہ حکومت کو اس اصلاح کے قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے، یا پھر نمونہ کے طور پر کوئی ایسی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی کامیابی کو آزمایا جائے، اور دیکھا جائے کہ مصنف نے اپنے اس نظریہ سے جو دینی ودنیاوی کامیابی وابستہ کی ہے، وہ کہان تک درست ہے، دارالعلوم ندوہ مین اوس کے قریب قریب ایک طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہان عالمیت کے نام سے چھ برس کی تعلیم مشترک ہے جس مین صرف ونحو وادب وفقہ واصول وحدیث وقرآن پاک وعقائد اور انگریزی حساب وجغرافیہ تاریخ و جومیٹری کی تعلیم ہوتی ہے اس کے ختم کرنے کے بعد عالمیت کی سند دی جاتی ہے، اب اس کے بعد یا طالب علم یہین تین برس کی فضیلت کی تعلیم پاکر عالم ہوتا ہے، اور یا انگریزی اسکول مین داخل ہوکر کاروباری تعلیم حاصل کرتا ہے، لیکن نتیجہ اس کا یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ چھ برس کی تعلیم اسکول جاکر بالکل دھل جاتی ہے،

اب ایک نیا نظامنامہ تعلیم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی نے پیش کیا ہو، جس کو انھون نے آج سے چار سال بیشتر دارالعلوم ندوہ کے ایک جلسہ مین پیش کیا تھا، اب وہ اسی اساس پر خود ایک درس گاہ قائم کرنا چاہتے ہین، جس مین دینی ودنیاوی کی تقسیم نہ ہوگی، بلکہ ایک تعلیم ہوگی، اور یکسان ہوگی،

بہرحال ایک خیال ہو جب وہ مجسم ہو تو اُس کا عیب و ہنر معلوم ہو، خود راقم نے ۱۹۲۶ء مین خطبہ صدارت مجلس العلماء ترچناپلی مین جو کچھ بیان کیا ہے اور "مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے عنوان سے ۱۹۳۲ء مین جامعہ ملیہ مین جو مقالہ پڑھا تھا، اور ۱۹۳۷ء مین شعبہ علوم وفنون ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت اور ۱۹۳۸ء مین جامعہ دارالسلام عمر آباد کے خطبہ اسناد مین جو کچھ عرض کیا ہے وہ پرانے

ہونے کے باوجود بھی اس وقت پڑھنے کے قابل ہے،

مصنف نے اس کے بعد اپنی ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ کھینچا ہے، اور پانچ امور اساسی بیان کئے ہین، (۱) صرف وہی چیزین پڑھائی جائین، جو استادون سے پڑھے بغیر نہین آتین (۲) اردو کی تقویت کے لئے فارسی اور فارسی کی تقویت کیلئے عربی پڑھائی جائے (۳) صرف وہ عربی پڑھائی جائے جس مین ہماری دینی کتابین ہین، (۴) اس عربی کو قرآنی پارون اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعہ سے پڑھایا جائے (۵) صرفی و نحوی طول طویل مباحث کی جگہ صرف کام کے مسائل کے رسالے پڑھائے جائین، مصنف کا خیال ہے کہ ان پانچ اصولون کے زیر نظر نو سال کا کورس میٹرک تک انگریزی زبان اور حساب کے ساتھ پڑھایا جائے، اور اس کے بعد قرآن و حدیث و فقہ کی تعلیم جلالین، مشکوٰۃ اور شرح وقایہ کے ذریعہ سے بی اے تک دی جائے، اور اس کے ساتھ چار سال مین دوسرے جدید اختیاری و مناسب مضامین پڑھائے جائین، اس کے بعد ایم اے کا اختصاصی درجہ آئے گا، جس مین کسی ایک مضمون کی تخصیص کی جائے گی،

مصنف نے جو کچھ اوپر فرمایا ہے اس کے روسے جامعۂ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ تھیالوجی ایم اے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اس کے قریب کا خاکہ ہے، مصنف کا خیال ہے کہ اس وحدت تعلیم سے قدیم و جدید دینی اور دنیاوی اور علما، اور تعلیم یافتہ کے سارے فرق مراتب ختم ہو جائین گے، فنعم الوفاق،

اس کے بعد مصنف نے بعض اون علما، کا تذکرہ چھیڑا ہے، جنھون نے ہندوستان سے باہر جا کر ناموری حاصل کی، اس سلسلہ کے لکھتے وقت خود مصنف کو بھی شک تھا کہ یہ بیان یہان بے محل تو نہین، مگر افادہ کا سیلاب محل اور بے محل کو نہین دیکھتا، وہ تو اپنی روانی مین آپ بہتا ہے،

آخر مین درجۂ فضیلت کی تعلیم کے متعلق گفتگو فرمائی ہے (صفحہ ۳۰۵) سے یہ گفتگو شروع ہوئی ہے، مصنف کے خیال کے مطابق اس درجہ کی تعلیم حسب ذیل چند اساسی اصول پر قائم کی گئی تھی،

۱- علوم عالیہ سے پہلے چند علوم آلیہ یعنی ورزشی علوم سکھائے جاتے تھے، یعنی ایسے علوم جن کے مسائل اور دعاوی واضح اور صاف نہ ہون، بلکہ ان مین ابہام، پیچ اور پیچیدگی زیادہ ہو، جن کا ہر دعوی آسانی سے ثابت نہ ہو سکتا ہو، بلکہ جو کلیہ بھی بنایا جائے، وہ ٹوٹ سکتا ہو، اعتراض اور جواب کے سلسلہ کی اپنے اندر کافی گنجایش رکھتا ہو، مقصد یہ تھا کہ طلبہ مین خود سوچنے اور تنقید کرنے اور مسائل کے دقیق پہلوؤن تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو، لیکن مصنف اپنی نئی تجویز مین دوبارہ اوس کو لانے کی کوشش کرکے اپنے بیان مین تضاد پیدا کرنا چاہتے ہین،

پھر معلوم نہین ان علوم آلیہ یا ورزشی علوم سے مصنف کی مراد کیا ہے، عام طور سے تو صرف و نحو اور منطق کو علوم آلیہ کہا جاتا ہے، مگر علوم آلیہ کی یہ تعریف تو ان علوم پر صادق نہین آتی، ہان یہ سچ ہے کہ ان علوم آلیہ پر جو کتابین زیر درس تھین اون کتابون مین یہ اغلاق و اجمال اور پیچیدگی اور سوال و جواب کے ایک سلسلۂ دراز کی صورت . . . . . موجود تھی، دوسرے قدیم علما، کی طرح مصنف کا بھی یہ خیال ہے کہ ان مغلق و پیچیدہ اور اعتراض در اعتراض کتابون کے رکھنے سے غرض محض طالب علم کے ذہن کی تشحید اور جولانی تھی، ہوگی، اس وقت اس کی ضرورت ہوگی، مگر اب تو وہ نقائص سے معمور ہے، اول یہ کہ طالب علم اسی اعتراض در اعتراض کی بھول بھلیون مین پھنس کر رہ جاتا ہے، اور اصل حقیقت سے کوسون دور ہو جاتا ہے، دوم یہ کہ شروع ہی سے اوسکی ذہنیت اس طریقۂ تعلیم کے بدولت کج ہو جاتی تھی، سیدھی بات بھی ان کو الٹی معلوم ہوتی تھی، ہر بحث

کو سمجھنے کے بجائے اوس کے توڑنے کی فکر غالب ہوتی ہے، سوم یہ ہے کہ فنی مسائل کے بجائے حواشی و شروح و قال اقول کو علم سمجھا جاتا ہے، یہ علوم آلیہ اب بھی پڑھائے جاتے ہیں، مگر ندوہ نے اس میں یہ اصلاح کی ہے کہ متعلق کتابوں پر سہل و رواں کتابوں کو ترجیح دی جائے، فن کے اصل مسائل پر زور دیا جائے، ان علوم سے جو غرض ہے، وہ حاصل ہو، شروح و حواشی تنبیہات و قال اقول سے پرہیز کیا جائے، ہم کو تسلیم ہے کہ ہمارا نیا مولوی پرانے درس یافتہ مولویوں کی طرح بات میں بات اور بال کی کھال نہیں نکال سکتا، اور نہ ہر سیدھی بات کو ٹیڑھے طور سے کہنے کا خوگر ہوتا ہے، اور اسی لئے وہ اس نظر سے اگلوں کے مقابلہ میں سطحی ہوتا ہے، لیکن یہ علم کے باب میں قدیم و جدید خیال کے نقطۂ نظر کا فرق ہے،

۲- دوسری اساسی بنیاد مصنف نے یہ بتائی ہے، کہ تلاش کرکے ایسی کتابیں ان فنون میں رکھی جاتی تھیں، جو نسبتہً تفصیل کے بجائے مجمل زیادہ ہوں، عبارت اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھا جاسکے، اور اوس سے مقصود ان کے خیال میں یہ تھا، کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے میں تعلیم سے فراغت کے بعد طلبہ کو دشواری نہ ہو،

درس نظامی میں اس قسم کی کتابوں کے رکھنے کا جو حاصل بتایا گیا ہے، اس کا دوسرا مخالف رُخ دکھانا بھی ضرور ہے، اس طرزِ تعلیم کے عیوب یہ ہیں کہ ہمارے طلبہ فن کے مسائل کے علم کے بجائے مشکل کتابوں کی عبارت کے حل کرنے ہی کو علم سمجھنے لگے، فصولِ اکبری، شافیہ، کافیہ، ملا جامی تہذیب، سلم اور مسلم، میر زاہد، افق المبین میں مسائل سے زیادہ وقت عبارتوں کے اجمال و اشکال کے دفع اور فقروں سے مضمون کا مطلب نکالنے میں صرف ہوتا ہے، اور اوس سے جو حاصل ہوا، یعنی دقتِ نظر اوس سے عملی کام لینے کا موقع بہی ملتا ہے، کہ اسی قسم اور اسی ذوق کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا کام جاری رکھا جائے، اور فن جاننے کے بجائے کتاب جاننے کا نام علم رکھا جائے، اور لفظی گورکھ دھندوں میں پھنس کر پھر نہ نکل سکے، مصنف نے اپنے خیال کی تائید میں یہاں تمثیلات کے استدلال سے کام لیا ہے، مگر انہی نے ہم کو بتایا ہے، کہ تمثیل کا درجہ شاعری سے زیادہ نہیں، تمثیلات اس کے خلاف بھی پیش کیجا سکتی ہیں، اور اب اعادۂ معدوم انہی کے اصول پر محال ہے،

۳- مصنف نے اس تیسرے نمبر پر "بحث و جدال" کو رکھا ہے، جس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ شاگرد اور استاد دونوں مل کر مسائل کی تحقیق اور شبہات کے ازالہ میں زورآزمائی کریں، تاآنکہ بحث منفصل ہو جائے، بات بالکل ٹھیک ہے اور درس نظامی کے ممتاز طالب علموں کے قصوں میں یہ ذکر بار بار آیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس بحث و جدال کی قوت بھی فن کے مسائل میں کم اور کتاب کے مطلب میں زیادہ صرف ہوتی ہے، یہ تحقیق و تدقیق کتاب کی صحت و خطا اور ایک خاص کتاب کے مصنف کے الفاظ کے درست کے سمجھنے کے بجائے اصل مسئلۂ زیربحث پر صرف ہونی چاہئے، ہمارے اساتذہ میں جناب مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی، اور مولانا شبلی نعمانی کا یہی طریق تھا، وہ کتاب سے نہیں بلکہ اصل مسئلہ سے بحث کرتے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ درس نظامی کے طریق میں فن دانی سے زیادہ کتاب خوانی پر وقت صرف ہوتا تھا، اس دور سے پہلے قدما کا دستور کتاب پڑھائے جانے کے بجائے فن پڑھانے کا تھا، اور اسی کا نام طریق املا تھا، قرآن و حدیث و فقہ سے لیکر صرف و نحو و ادب اور علوم عقلیہ تک اسی طرح پڑھائے جاتے تھے، اور اس طریق تعلیم کی قوت و افادہ کا حال سب کو معلوم ہے تاہم مسائل زیر درس میں طلبہ اور اساتذہ کا کبھی کبھی بحث و مباحثہ اور ازالۂ شبہات کی کوشش کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے اور تعلیم کا یہ گر جیسا کہ ابن خلدون کے بیان سے بھی مصنف نے ثابت کیا ہے، بہت مفید ہے، مگر اسی کے ساتھ بے مغزی کی گفتگو کج فہمی کی خو کی درستی، اور گفتن برائے گفتن کی عادت سے بچانا بھی بیحد ضروری ہے،

۴- چوتھا قدیم اصول درس اعادہ و تکرار تھا یعنی یہ طریقہ تھا کہ مدرس جب درس دے چکے، تو ممتاز طلبہ مین سے کوئی ایک استاد کی تقریر کو دوبارہ باقی طلبہ کو سمجھا جاتا تھا، یہ بیحد ضروری اور مفید اصول درس تھا، جس کو افسوس کہ کتاب چھوڑا جا رہا ہے۔

۵- پانچوان اصول یہ تھا کہ ممتاز طلبہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ مین اپنے نیچے کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، یہ بیحد مفید طریقہ تھا اس سے دو فائدے ہوتے تھے، ایک تو یہ کہ پڑھانے والے طلبہ کی کتابین منجھتی تھین، پھر کسی چیز کو پڑھاتے وقت نفسیاتی طور سے پڑھانے والے کے ذہن پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ اس وقت وہ سمجھنے لگتا ہے جس کو وہ پڑھتے وقت نہین سمجھ سکا تھا، یا نہین سمجھ سکتا تھا، اور دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ہر درس گاہ مین صرف ایک دو مدرس کی اعلیٰ جماعتون کے لئے ضرورت پڑتی تھی، اور نیچے کے طلبہ اوپر کے طلبہ سے پڑھ لیتے تھے، اور اس طرح درس گاہون کے مصارف مین بہت کمی ہوتی تھی،

آج کل مدارس مین ندوہ کی مصطلحہ تکمیل کا جو ذوق پھیل رہا ہے، یہ بھی کوئی نئی چیز نہین، یہ وہی چیز ہے جس کی صورت ہمارے بزرگون کے ہان یہ تھی، کہ ممتاز طلبہ فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کے زیر نظر اور ان کی صحبت مین رہکر چند سال درس تدریس کا کام انجام دیتے تھے، اور آخر وہ ایسے تیار ہو جاتے تھے، کہ بعد کو بڑے بڑے شہرون اور بڑے بڑے مدرسون مین جاکر اپنا حلقۂ درس قائم کرتے تھے، اور ایک عالم کو اپنے فیوض سے سیراب کرتے تھے، اب مدارس سے یہ چیز تقریباً مفقود ہو رہی ہے، اب انگریزی کی تقلید مین طالب علم امتحانات کے کاغذی اسناد کے پھیر مین مبتلا ہے، اور اسی کو حاصل علم سمجھ رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سفینہ اسناد سے معمور ہے، لیکن سینہ علم سے خالی ہے، یہی سبب ہو کہ آج ہمارے عربی مدرسون مین کامیاب مدرسین کی بیحد کمی محسوس ہوتی ہے، ایک بھی کامل مدرس جب اٹھ جاتا ہے، تو دوسرا اس کا قائم مقام نہین ملتا، انگریزی تعلیم نے اس نقص کا ازالہ ٹریننگ اسکولون اور کالجون، اور ڈاکٹریٹ کے طریقہ سے کر لیا ہے، مگر ہمارے عربی مدارس مین اس کا علاج یہی ہے، کہ ممتاز طلبہ کو فراغت کے بعد روک لیا جائے، اور ان کو مزید دو تین سال پڑھنے پڑھانے اور توسیع علم، مطالعۂ کتب اور تحقیق مسائل کا موقع دیا جائے، خوشی کی بات ہو کہ اب دار العلوم ندوہ کے علاوہ بعض دوسرے مدرسون میں اس تجویز پر عمل کیا جا رہا ہے،

جاگیرداری سسٹم مصنف نے کتاب کے آخر مین طالب علمی کے پرانے "طریق جاگیرداری" کی حمایت کی ہے، اور اس کے لئے آیندہ کچھ زیادہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے، اور اوس کو اس زمانہ کے "فیمیلی اسٹوڈنٹ" کے طریقہ کا معزز نام دیا ہے، بے شبہہ ایک محدود تعداد کی حیثیت سے اس طریقہ پر عمل کیا جا سکتا ہے، مگر اس زمانہ مین اس کو اگلی سی مقبولیت حاصل نہین ہوسکتی، درس گاہون کا بڑے بڑے شہرون مین ہونا، آبادی سے دور واقع ہونا، امرار و اہل ثروت کا شہر کے دور دور مقام پر ہونا، امرار کے طریق تمدن اور طریق تفکر اور طریق معیشت اور جنس و نقد کے معیارون کے اختلاف کے سبب سے پرانا "جاگیرداری سسٹم" اب دوبارہ قائم نہین ہوسکتا، اب اوس کی جگہ زیادہ آسان یہ ہے کہ وظائف نقدی کو جس پر اب عمل ہو رہا ہے وسعت دی جائے،

امتحان مصنف نے موجودہ امتحان کی گرانباری اور زیرباری کو جس کا ذاتی تجربہ انکو حاصل ہے پوری طرح دکھایا ہے، آجکل کے ماہران تعلیم نے بھی اس مسئلہ کو اہمیت دی ہے، اور اوس کے نقائص اور معائب پر بحث کی ہے، ہمارے عربی مدرسون مین جہان جدید نظام تعلیم انگریزی کی تقلید مین دوسری بلائین پھیلی ہین، اور پھیل رہی ہین، وہان ایک یہ امتحان بھی ہے،

ہمارا قدیم طریق تعلیم اس بلا سے واقف نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عربی طالب علم کا مقصود بھی فضل و کمال کا اکتساب نہین، بلکہ امتحان مین نمبرون کا حصول رہ گیا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ طالب علم سال بھر سوتا ہے، اور صرف امتحان

کے دنون مین جاگتا ہے، اور جس کو سال بھر مین لقمہ بہ لقمہ چبا کر کھانا چاہئے تھا، اس کو ایک دم ایک ساتھ اور ایک ہی مہینہ مین کچا پکا کھا کر ہمیشہ کے لئے سوء ہضم کی بیماری اپنے معدہ مین پیدا کر لیتا ہے،

امتحان کی یہ بلا جیسا کہ مولانا شبلی فرماتے تھے، ہمارے عربی مدرسون مین دیوبند سے شروع ہوئی، اور ہر جگہ پھیل گئی، میرے خیال مین اوس کی وجہ یہ ہوئی، کہ مدرسۂ دیوبند کے بانیانِ کرام اور ارکانِ عظام عموماً سرکاری مدرسون سے پہلے متعلق رہ چکے تھے، مولانا مملوک العلی صاحب مولانا یعقوب کے والد اور مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ کے استاد عربک کالج دہلی مین مدرس تھے، اور ان دونون بزرگون نے بھی اسی کالج مین تعلیم پائی تھی، اور امتحانات دیئے تھے، مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے، خود مولانا یعقوب صاحب مدرس اوّل دیوبند سرکاری مدارس کے انسپکٹر رہے تھے، اس لئے ان جدیدیات کی بعض باتین جن مین سے ایک امتحان بھی ہے، ان مقدس ہاتھون سے عربی مدارس مین داخل ہو گئین،

یہ بے شبہہ صحیح ہے کہ امتحان یا کسی اور معیار کے کلیۃً نہ ہونے کے سبب سے پچھلے زمانہ مین بلا امتیاز ہر قسم کے طالب علم ایک ہی درجہ مین یکسان پڑھتے چلے جاتے تھے، مگر اس تدبیر سے اس بیماری کا علاج کسی طرح مفید نہین، چنانچہ یہ اختلاط و عدم امتیاز اگر پہلے بے قاعدہ تھا، تو اب باقاعدہ ہے، موجودہ امتحان ایک گر ہے، جو طالب علم اس کو جانتا ہے، یا جان گیا ہے، وہ بے پڑھے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور جو نہیں جانتا وہ جاننے پر بھی گر جاتا ہے، پھر اس امتیاز کے جاننے کے لئے جس قدر وقت، روپیہ اور محنت اور کاغذ صرف کیا جاتا ہے، اوس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ کچھ پاس ہون اور کچھ فیل ہون، حضرات ممتحنین کی سہل انگاریان اور تشدد آمیزیان دونون کے نتائج ہر سال سامنے آتے ہین، اور جن معیارون سے غریب طالب علمون کو جانچا جاتا ہے، اور ان کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اور فضل و کمال اور استعداد و عدم استعداد کو ہندسی رقمون کے ذریعہ سے تولا اور ناپا جاتا ہے، وہ تمامتر اجنبی اشخاص کے ذاتی میلان کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی لئے ایک ہی کاپی کا نمبر دو ممتحن دو دو دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں،

ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا کہ خود استاد اپنی معرفت اور تجربہ سے ہر طالب علم کو خوب جانتا اور سمجھتا تھا، اور اپنے ہر طالب علم کو ایک دن کے امتحان کے بعد نہین، بلکہ تین سو ساٹھ دنون کے امتحان سے اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، اور ہر ایک کا مخصوص علاج اپنے روزانہ کے اسباق مین کرتا رہتا تھا، ہم نے ندوہ مین خود مدرسین کے زیر نگرانی اسی لئے ماہوار امتحانون کے سلسلہ کا آغاز کیا ہے، اور انہی کو معیار بنایا جا رہا ہے،

درجہ بندی انگریزی کی تقلید مین عربی مدارس مین دوسری بلا درجہ بندی کی پھیل رہی ہے، عربی مدرسون مین یہ بلا سب سے پہلے دار العلوم ندوہ سے شروع ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مدرسون مین طالب العلمی ایک طرح سے پیشہ اور ذریعۂ رزق بن گئی تھی، بڑے بڑے طالب علم اپنی پوری عمر مدرسہ کی روٹیون پر ایک کتاب سے دوسری کتاب اور دوسری کتاب سے تیسری کتاب، اور پھر پہلی کتاب پڑھنے مین صرف کر دیتے تھے، اور فراغت نہین پانا چاہتے تھے، اس کا اندازہ آپ کو بھوپال کے سرکاری عربی مدرسون کی اوس روداد اور مولانا شبلی مرحوم کی اصلاحات سے ہوگا، جس کو حیاتِ شبلی مین قصداً شائع کر دیا گیا،

اس درجہ بندی سے اس طالب علمی کے مرض کا تو سدباب ہو گیا، مگر اوس سے اور امراض پیدا ہو گئے، یعنی کہ ایک ہی درجہ مین ناقص و کامل، غبی و ذہین، اور چھوٹے اور بڑے طالب علمون کو ایک ہی مدت معینہ کے اندر متعینہ کتابون کو ختم کرنا ضروری ہے،

حالانکہ یہ علانیہ فطرت سے اعلانِ جنگ ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ذہین غبی کے سبب سے اپنے وقت کے ضائع کرنے پر، اور غبی ذہین کے سبب سے بے سمجھے بوجھے تیز قدم بڑھانے پر مجبور ہوتا ہے،

دوسری خرابی یہ ہے کہ ہر طالب علم کو خواہ اوس کا ذوق کچھ ہی ہو، اور اس کا میلان طبع کسی طرف ہو، اوس کو زبردستی درجہ کے متعینہ علوم و فنون پڑھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، حالانکہ پڑھنے کے بعد بھی وہ ان سے کورا ہی رہتا ہے، اگر درجہ بندی نہ ہوتی جیسا کہ پہلے تھا، تو فرداً فرداً ہر طالب علم کو اپنے مذاق اور میلان کے مطابق مختلف علوم و فنون میں انتخاب کا موقع رہتا، اور خاطر خواہ فائدہ ہوتا، اور بے توجہی کے ساتھ بے مذاق اور بے میل کتابوں کے پڑھنے کا بار جو اس پر عائد ہوتا ہے، وہ اس پر نہ ہوتا،

امتحان اور درجہ بندی سے مل کر جو بلائے عظیم آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک کتاب میں بھی ۳۳ کی مقدارِ مبرم سے چند نمبر کم آگئے تو اس کی ساری کتابوں کی کامیابی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی، اور اس کی عمر کا ایک سال ضائع کر دیا گیا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان ناکام لڑکوں کا یہ امتحان ہی نہیں بلکہ تعلیم ہی ناتمام رہ جاتی، اور عمر ہی ناکام ہو جاتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ درجۂ اخیر کے علاوہ نیچے کے درجات میں مدرسین کے ماہانہ امتحانات کے نتیجہ کو فیصلہ میں اہمیت دی جائے،

ہمارے عربی مدارس میں قلبی مرض النوم

مصنف نے اپنے مقدمہ میں قلبی نوم کے نام کی بیماری کا تو تذکرہ کیا ہے، مگر اوس کی تفصیل اور تشریح اور علاج کا ذکر نہیں کیا ہے، شاید آئندہ کریں،

عربی مدارس کی بنا خالص دینی و مذہبی غایت پر رکھی گئی تھی، مگر جیسے جیسے انگریزی مدارس کی پیروی میں جدید اصلاحات مدرسون میں پھیل رہے ہیں، انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی ہر چیز کی ارادی اور غیر ارادی نقالی کی بلا بھی عام طور سے پھیل رہی ہے، یہاں تک کہ بڑے بڑے عربی مدرسوں تک میں یہ بلا پہنچ گئی ہے، دین کا جذبہ مفقود ہو رہا ہے، اساتذہ کی عزت اور قدر دلوں سے رخصت ہو رہی ہے، کسبِ کمال کی جگہ کسبِ مال کا جذبہ بڑھ رہا ہے، عمق اور گہرائی کی جگہ سطحیت آ رہی ہے، اور حریت و آزادی کا جھوٹا طوفان اس قدیم طریق نظم و نسق کو جو بزرگوں کے احترام اور خوردوں پر شفقت پر قائم تھا یا تو بالکل مٹا چکا، یا مٹا رہا ہے، الزام خورد و بزرگ کو اور بزرگ خورد کو دے رہے ہیں، اور دونوں ہی الزام صحیح ہیں کیونکہ یہ اصول دونوں طرف سے یکساں ہی برتے اور توڑے جا سکتے ہیں، اس سے زیادہ قابلِ افسوس حالت یہ ہے کہ ہمارے عربی مدرسے بے مقصد ہو رہے ہیں، اور اکثر کی بنا للّٰہیت کے بجائے پیٹ پر ہے، کہیں اہلِ حدیث و حنفیت کے دنگل بنے ہوئے ہیں، کہیں سرکاری امتحانات کے میلان کو بڑھایا جا رہا ہے، کہیں مولوی کی جگہ بڑے مولوی بنانے کی تیاری ہو رہی ہے، کہیں انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ کی تیاری ہے، مگر دین کا دلولہ، دین کی خدمت، ایمان کا مل، حصولِ دین کی خدمت، علم نافع کا سوال، اور عمل صالح کا خیال قلوب سے محو ہو رہا ہے، مدرسین میں بھی اخلاص و قناعت کی جگہ جو ہمارے علما کا جوہر تھا، داد و ستد اور گریڈ اور ترقی اور عہدہ اور منصب و لفظی اعزاز و اکرام کے حصول کا شوق نمایاں ہے، پرنسپل اور پروفیسر اور لکچرر بننے اور کہنے اور کہلانے پر مٹ رہے ہیں، فانی تسحروں، طلبہ میں انگریزی طالب علموں کی نقالی میں آرائش و نمائش اور فیشن اور مال کی خدمت اور کپڑوں کی نئی تراش و خراش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور سیر و تماشا کا شوق اتنا نمایاں ہے کہ اس کے پیچھے علم کی سچی طلب دلوں سے رخصت ہو رہی ہے، ہم جن باتوں کا الزام کبھی انگریزی طالب علموں کو دیتے تھے اب ان میں سے ایک ایک عربی طالب علموں میں پایا جا رہا ہے، اگر کمی ہے تو اس لئے کہ ہمارے طالب علموں کے پاس وافر روپیہ نہیں، عصمت بی بی از بے چادری کیا یہ امور ہمارے علما کے سوچنے اور غور کرنے کے قابل نہیں، ان صفحات میں کتاب کے اہم مباحث پر اجمالی گفتگو آگئی ہے لیکن مصنف کا قلم چونکہ منطقی ترتیب اور مصطلحہ تصنیفی رسوم کے بجائے افادیت کا خوگر ہے، اس لئے کتاب میں ضمناً بہت سے معلومات، فوائد، اور مباحث بھی آگئے ہیں جن کا علم بجائے خود مفید ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے قدیم طریقۂ تعلیم اور اصولِ تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں لکھی گئی، مگر ضرورت تھی کہ جامع کے ساتھ مانع بھی ہوتی، ان معلومات و نتائج کو سامنے رکھ کر آئندہ تعلیم کا نقشہ بنایا جا سکتا ہے،

مقبرۂ ابو الحسن تربتی

از

جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے، لاہور

بیا و نقش عمارات شہریاران بین
کہ این سپہر جفا پیشہ چون بہ بست و شکست

عہدِ مغلیہ مین اکثر با کمال ایران خراسان اور توران وغیرہ ممالک سے تلاشِ روزگار کے سلسلہ مین واردِ ہندوستان
ا کرتے تھے، اور ان کی قسمت کا ستارہ فضائے ہند مین چمک کر شامِ غربت کو صبحِ وطن سے زیادہ تابناک بنا دیتا تھا، اکثر کا
ت رسا انھین سپہ سالاری صوبہ داری اور وزارتِ عظمیٰ کے عہدون تک پہنچا دیتا تھا، علما ہون یا شعراء، ماہرانِ انتظام ملکی
ن یا نبرد آزمایانِ جنگی، ہر جوہر قابل کے لئے سرزمین ہندوستان کئی موجود تھی، یہ الگ بات ہے کہ بعض تیرہ بختون کا حال
نی زشتی جیسا بھی ہوتا ہو،

بہرکیف ابو الحسن تربتی کو آب و دانہ اور خاکِ گور اس کے وطنِ مالوف تربت حیدری سے اکبر اعظم کے عہد مین ہندستان
کھینچ لائی، تربتِ حیدری اُن دنون خراسان کا مشہور اور مردم خیز شہر تھا، اور آج بھی مملکت ایران کے شمال مشرقی حصہ مین
صوبہ خراسان کے دار السلطنت حضرت امام رضاؒ کے مشہد مقدس سے جنوب کی سمت مائل مغرب تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر
باد ہے، اور ایک متوسط درجے کا قصبہ ہے،

جوہر شناس اکبر نے ابو الحسن کو ہاتھوں ہاتھ لیا[1] اور دکن کے نو مفتوحہ علاقون کا دیوان مقرر کیا، اکبری دور کی دکنی
م ۱۶۰۰ء مین احمد نگر اور ۱۶۰۱ء میں اسیر گڑھ کی فتح کے بعد مکمل ہوئی، چنانچہ اسی زمانے مین ابو الحسن یہان آیا، اس کے
ا و اجداد اس کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہم کوئی واقفیت نہین رکھتے، لیکن اس کی کامیاب زندگی، بڑے
مدون کے فرائض کی خوش اسلوبی سے بجا آوری یہ ظاہر کرتی ہے، کہ وہ کسی اچھی کان کا بے بہا لعل اور کسی بلند فلک کا درخشان
تارہ تھا، ابو الحسن پانچ چھ سال تک بطور دیوانِ دکن اپنے فرائض منصبی کو جانفشانی اور تندہی سے بجا لاتا رہا، دورِ جہانگیری
، دوسرے سال جب آصف خان میرزا جعفر کو وکیلِ سلطنت کا عہدہ تفویض ہوا، تو یہ اس کا سررشتہ دار بنا یا گیا، اور
۱۰۱۷ھ مین میر بخشی کے عہدے پر فائز کیا گیا، اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد ابو الحسن اس کی جگہ دیوانِ کل مقرر ہوا، اُسے
پنج ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا، جلوس جہانگیری کے انیسوین سال دیوانی کا عہدہ نور جہان کے
ائی آصف خان کو اور کابل کی صوبہ داری ابو الحسن تربتی کو مرحمت ہوئی، مگر یہ خود دربار ہی مین رہا، اور اپنے فرزند
ن اللہ ظفر خان کو نائب مقرر کرکے کابل روانہ کیا، مہابت خان کے ہنگامے میں ابو الحسن نے نہایت دلیری اور اولوالعزمی
، ملکہ نور جہان کی حمایت مین جنگ کی اور دریاے جہلم مین ڈوبتا ہوا بمشکل بچا،

---

[1] ماثر الامراء، جلد اول صفحہ ۳،

شاہ جہان کے عہد مین اُسے چھ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا، ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۲ء مین ابو الحسن کو کشمیر کا صوبہ دار بنایا گیا، مگر یہان بھی اُس کا فرزند ظفر خان ہی باپ کا نائب بن کر گیا، اور وہ شاہی دربار مین رہا، اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۶۳۳ء مطابق ۱۰۴۳ھ مین ابو الحسن تربتی ستر سال کی عمر مین راہیِ ملکِ عدم ہوا، صاحب مآثر الامراء اس کے فرزند ظفر خان کے حالات مین لکھتا ہے[۵۱] کہ

"در لاہور بساطِ ہستی در نوردہ در مقبرۂ پدر مدفون گشت"۔

اس سے معلوم ہوا کہ (ابو الحسن تربتی) کا لاہور مین مقبرہ تھا، جس مین اس کا فرزند ظفر خان بھی دفن ہوا،

دورِ مغلیہ مین دستور تھا، کہ جو غیر ملکی یہان آکر شاہی ملازمت کے سلسلہ مین منسلک ہوتے، وہ پھر اپنے وطن واپس نہ جاسکتے تھے، اور اس صورت مین ان کو اپنی کل دولت یہین چھوڑنا پڑتی تھی، اس لئے وہ ہندوستان ہی کے کسی شہر مین عمارتین بنواکر اقامت اختیار کر لیتے تھے، اگرچہ سرکاری خدمات کی ادائیگی کے سلسلے مین انھین مختلف شہرون مین پھرنا پڑتا تھا، مگر پیرانہ سالی کا زمانہ اور ایام تعطیلات بسر کرنے کے لئے اسی شہر مین آجاتے جسے اپنا مستقر قرار دے کر عمارتین بنوائی ہوتین، لاہور کی آب و ہوا دہلی اور آگرہ سے بہتر اور ایران و خراسان سے مقابلۃً نزدیک تر ہونے کی وجہ سے اکثر غریب الوطن اُمرا نے اسی شہر کو اپنا وطن قرار دیا تھا، اور یہان فلک بوس محلات، رشکِ فردوس باغات اور عالیشان مقابر بنوا کر اس شہر کی گوناگون خوبیون کو چار چاند لگا دئیے تھے، موسم گرما بسر کرنے کے لئے لاہور کے پاس ہی کشمیر کی حسین سرزمین تھی، مگر اس تمام سامانِ تعیش کے باوجود جو انھین میسّر ہوتا تھا، وطن کی یاد ان کے دل سے نہ جاتی تھی، اور ہندوستان مین "بادشاہی" کرنے کے باوجود خراسان و ترکستان کا گدا بننے کی خواہش ان کے دل مین چٹکیان لیتی تھی، جیسا کہ خود ابو الحسن تربتی کے فرزند ظفر خان احسن کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے،

زبعد اکبر آباد است لاہور	کہ در خوبی بعالم گشتہ مشہور
برون آرد ہوایش از فراقت	دہد یاد از خراسان و عراقت

(۲)

الٰہی تا بود کشمیر آباد	تو از باغ خراسانم مدہ یاد
بہر کس ہرچہ خواہد بےسخن دہ	مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

چنانچہ بہت سے مقامی اور غریب الدیار امرار کی سر بہ فلک عمارتون نے اس شہر کو عروس البلاد بنا دیا تھا، جن مین ملا نظام الدین تجنشی، شیخ فرید بخاری، امانت خان خوافی، آصف خان، علی مردان خان، علامی افضل خان، نواب میان خان، وزیر خان جیسے جلیل القدر امرار شامل تھے، ابو الحسن تربتی بھی جب ہندوستان آیا، تو اس نے بھی اسی شہر مین عمارتین بنوائین مغل امرار کے مشہور محلہ مغل پورہ مین واقع تھین، اور اسی جگہ اس کا مقبرہ بھی تھا،

اس وقت لاہور مین مقبرہ ابو الحسن کے نام سے کوئی عمارت نامزد نہین، لیکن لاہور کی قدیم یادگارون کے متعلق پچھلی صدی کی لکھی ہوئی کتابون مین اس کا ذکر ملتا ہے، صاحب تحقیقاتِ چشتی[۵۲] اپنی کتاب مین ابو الحسن کے مقبرے کا ذکر

---

[۵۱] مآثر الامراء جلد دوم ص ۶۵، [۵۲] تحقیقاتِ چشتی صفحہ ۵-۲۷۷، ۱۸۶۲-۶۴ء مین یہ کتاب مولوی نور احمد چشتی نے جو لاہور ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انگریز حکام کے ایما پر لکھی تھی، اس مین اُن تمام قدیم یادگارون کے حالات درج ہین جو مو

کرتے ہیں، مگر کسی جگہ اس کو ابو الحسن آصف خان برادر نورجہان سے خلط ملط کیا ہے، اور کہیں ان کا فرزند بتایا ہے، ایک جگہ البتہ اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ ابو الحسن آصف خان سے علیحدہ کوئی اور ابو الحسن تھا، غرض

ع شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

رائے بہادر کنہیا لال[۱] کا یستھ کے بیان کے مطابق صاحب مقبرہ ابو الحسن یوسف خان طرانی نورجہان کے ماموں تھے، سید محمد لطیف صاحب بھی اس مقبرے کا ذکر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ یہ ابو الحسن، ابو الحسن آصف خان برادر نورجہان سے علیحدہ کوئی اور شخص تھا، مگر چشتی اور لطیف میں سے کوئی صاحب اس امر کی توضیح نہیں کرتے ہیں، کہ یہ ابو الحسن، رکن السلطنہ خواجہ ابو الحسن تربتی تھے، مگر جب یہ تمام مورخ مقامی روایات کی بنا پر ایک مقبرے کو "ابو الحسن" سے منسوب کرتے ہیں، اور مآثر الامراء جیسی معتبر کتاب میں خواجہ ابو الحسن تربتی کے مقبرے کا لاہور میں واقع ہونا تحریر ہے، تو اس "مقبرہ ابو الحسن" کو خواجہ ابو الحسن تربتی کا مقبرہ قرار دینے میں کیوں شک و شبہ کیا جائے، ذیل میں اس مقبرہ کا حال بالترتیب قلمبند کیا جاتا ہے،

۱۰۴۲ھ میں ابو الحسن اس دار فانی سے رخصت ہوا، اور شاہجہانی عہد کے لاہور کے خوب ترین علاقے یعنی محلہ مغل پورہ میں ایک عالیشان مقبرہ اُس کی آرامگاہ قرار پایا، یہ ظاہر نہیں ہوتا، کہ یہ مقبرہ علی مردان خان کی طرح وہ اپنی زندگی میں خود تعمیر کرا چکا تھا، یا بعد میں بنوایا گیا، خان مذکور کے مقبرے کی طرح یہ بھی اندر سے دومنزلہ تھا، اور چاروں طرف آٹھ کمرے تھے جن کی چھت پر خوبصورت چھوٹے گنبد، اور ان کے درمیان میں بڑا گنبد تھا، جن پر سنگ سُرخ لگا ہوا تھا، مقبرہ میں اندر اور باہر نہایت اعلیٰ قسم کی پچے کاری گلکاری اور کاشی کاری تھی، مقبرے کے گرد ایک باغ تھا، اور اس باغ کو سیراب کرنے کے لئے اتنا بڑا کنواں تھا، جس پر دس رہٹ "باسائش و فراغت" چل سکتے تھے، مقبرہ مذکور کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ تھا، جو اندر ہی اندر کنوئیں تک آیا ہوا تھا، اور کنوئیں میں اس کی کھڑکی بھی تھی، مولوی نور احمد معمر لوگوں کی زبانی لکھتے ہیں، کہ اس وسیع تہ خانے کے اندر بھی گلکاری کی ہوئی تھی[۲]،

اسی باغ میں مذکورہ بالا مقبرہ کے شمالی جانب ایک اور میانہ کاشی کار گنبد تھا، اس میں ابو الحسن کی بیوی مخدومہ بیگم تہ خاک محو خواب تھی، اس نے یہ مقبرہ اپنی زندگی میں خاوند کی وفات کے بعد بنوایا تھا، اور اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا مقبرہ بہت چھوٹا بنوایا، مخدومہ بیگم اس زمانے کی دیگر خاندانی بیگمات کی طرح بہت ہی قابل اور فاضل خاتون تھی، دیگر علوم و فنون کے علاوہ فن شعر گوئی میں بھی دسترس رکھتی تھی، ابو الحسن تربتی جیسے امیر کی بیوی اور ظفر خان احسن جیسے شخص کی ماں کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا، مخدومہ بیگم نے بروز دوشنبہ بتاریخ ۴ شعبان ۱۰۵۸ھ میں اس عشرت کدۂ فانی کو الوداع کہی، ظفر خان احسن ۱۰۸۴ھ میں عالمگیر کے عہد حکومت میں فوت ہوا، اور اسی جگہ باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا، ہو سکتا ہو کہ ظفر خان احسن کی بیوی بزرگ خانم بنت سیف خان (جو کہ ممتاز زمانی زوجہ شاہنشاہ شاہجہان کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی) بھی اسی خاک کا پیوند بنی ہو، اور اپنی ساس کے پاس دفن ہوئی ہو، مخدومہ بیگم نے اپنی زندگی میں اپنے جلیل القدر فرزند کے ایما سے اس مقبرے میں ایک مدرسہ قائم کرکے بہت سی جائداد

(بقیہ حاشیہ ص ۸) زمانے میں شہر لاہور کے باہر موجود تھیں، چونکہ یہ کتاب محض باخبر لوگوں اور مجاوروں کے بیانات سے مرتب کی گئی تھی، اس لئے اس میں تضاد بیان بہت زیادہ ہے، تاہم اس سے لاہور کے متعلق بہت سی بے بہا اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں [۱] تاریخ لاہور (مطبوعہ ۱۸۸۴ء) ص ۲۶۲ و ۲۶۳ [۲] لاہور (بزبان انگریزی مطبوعہ ۱۸۹۲ء عیسوی) صفحہ ۱۵۲،

وقف کی تھی، مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ مقبرے کی جملہ عمارات مین رہتے تھے، ان کے تمام اخراجات اوقاف کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے، اس مدرسہ مین تمام دینی اور اوس زمانہ کے مروجہ علوم سکھائے جاتے تھے، اور اس عہد کے لاہور کے دوسرے مدارس کی طرح اس میں بھی دور دور سے طلبہ آتے تھے، ایک ہزار نغز خوان قاری[۵۱] نواب کی قبر پر شب و روز قرآن خوانی کے لئے مقرر ہوئے،

اس مقبرے اور باغ کے پاس ہی نواب کے عالی شان سنگین اور کاشی کار محلات تھے، جن کے ساتھ دیگر امرا کے ایوانات مقابر اور باغات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا، بازارون کی رونق محلات کی شان وشوکت، دولت وثروت کی افراط اور تجارت وصنعت کی بہتات کی وجہ سے یہ محلہ مغل پورہ لاہور کے تمام محلون سے گوے سبقت لے گیا تھا، اور اس کی گلی کوچوں میں تیب وزینت بستی تھی،

ذرا چشم تصور سے ملاحظہ فرمائیے کہ فلک بوس محلات عالی شان مساجد اور جنت نظیر باغات کے حامل اور پاکیزہ محلہ مین ایک فرحت افزا مقام تھا، جس مین کاشی کار دیوارون، سنگ سرخ کے فرشون اور سرخ پتھر کے گنبدون والے مکانون کے اندر ایک پرطرب اور رنگین ماحول مین طلبہ تمام تفکرات سے بے نیاز ہو کر تحصیل علوم مین مشغول رہتے تھے،

شہنشاہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد مین جب غازی عبد الصمد خان اور نواب زکریا خان دونون باپ بیٹے یکے بعد دیگرے ناظم لاہور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، تو اس مدرسہ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اس کے قریب ہی بیگم پورہ کے فلک رفعت محلات مین ان کا قیام تھا، اونھون نے اس دار العلوم کی سرپرستی قبول کی، اور ہمیشہ طلبہ اور اساتذہ پر انعامات واکرامات کی بارش کرتے رہتے تھے، اس زمانہ میں اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ حضرت حامد قاری تھے، یہ بزرگوار اس مبارک زمانہ کے جید علما مین سے تھے، تبحر علمی کے علاوہ قدرت کی طرف سے انھین لحن داؤدی بھی عطا ہوا تھا اور اون کے زہد وتقویٰ کا ایک عالم معترف تھا،

جب تک سرزمین پنجاب اسلامی حکومت کے سایۂ عاطفت مین رہی، اس مقبرے کی رونق اور آبادی قائم رہی، لیکن جب نا اتفاقی اور دون ہمتی کے سبب ہندی مسلمانون کی سطوت اور ثروت نکبت وعسرت مین بدل گئی، تو اون کی ہیبت سے لرزہ بر اندام رہنے والے اسلامی حکومت کی لاش کے گرد بھوکے گدھوں کی طرح منڈلانے لگے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ دُرّانیون کے بیرونی حملون نے پنجاب کی مسلم حکومت کی رہی سہی طاقت کو بھی ملیامیٹ کر دیا، اور یہاں سکھوں کا اقتدار قائم ہو گیا،

اس گیرو دار مین جہان شہروں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، اور بے گناہ مسلمانون کے خون سے پنجاب کی سرزمین لالہ زار ہو گئی، وہان مقبرے اور مدرسہ بھی اس کی زد مین آ گئے، اور اٹھارہویں صدی کے آخری ربع مین محلہ مغل پورہ کے ساتھ ہی یہ مدرسہ بھی ختم ہو گیا،

رنجیت سنگھ کے عہد مین نواح لاہور کی تمام اسلامی یادگارون سے سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر نوچ لئے گئے، اور انھین دربار صاحب امرتسر اور دوسری عمارتون کی تعمیر مین خرچ کیا گیا، مفتی غلام سرور مرحوم[۵۲] کا بیان ہے، کہ اس پرآشوب دور مین دو ہزار کے قریب مقبرے مسجدین اور دیگر اسلامی یادگارین تباہ وبرباد ہو گئین، بہت سی یادگارین پتھر اتارتے ہوئے گر گئین اور بقیہ عمارات جن مین مسجدین مقبرے حمام، سرائیں اور حویلیاں وغیرہ سب شامل تھین، حکومت کے قبضے میں تھیں اور ان میں سے کسی میں چھاؤنی تھی کسی مین

---

۵۱ یہ بیان تحقیقات چشتی کا ہے (ص ۸۰، ۳) جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، تاہم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے حافظ اور قاری باری باری سے قرآن شریف کی تلاوت کے لئے ملازم رکھے گئے ہون گے ۵۲ تاریخ مخزن پنجاب (۱۸۶۹ء) ص ۲۰۰،

سرکاری گودام یا کارخانہ کسی مین گولہ بارود کا ذخیرہ تھا کسی مین فوجی افسرون کی رہایش گاہ تھی، مقبرہ ابو الحسن مین رنجیت سنگھ کے فرنگی جرنیل[1] ایوی ٹیبل (Avetabile) کی ماتحت فوجون کا ذخیرۂ بارود رہتا تھا، اوربھوپ سنگھ کمیدان اس کا محافظ تھا، زمانہ کی نیرنگیان دیکھئے، کہ جس پاکیزہ عمارت مین تقریباً سوا سو سال تک خوش الحان قاری شب و روز قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے، اس مین بارود بھردی گئی، زمانہ نے اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ شیر سنگھ کے عہدِ حکومت مین بجلی گری، اس سے بارود کے ذخیرہ مین آگ لگ گئی، دھماکے کی آواز دور دور تک سنائی دی، بہت سے محافظ جل مرے، مقبرے کی عمارت کو از حد نقصان پہنچا، اس کا بہت سا حصہ جل گیا، اور دیوارین بارود کے پھٹنے سے اڑ گیئن،

قفس مین مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیون ہو

مگر مغلیہ عمارتون کی سخت جانی اور استحکام ملاحظہ ہو کہ سوختہ محرابون پر سیاہ رنگ کا جھلسا ہوا گنبد پھر بھی قائم رہا، اگر یہی بچا رہتا، تو بھی غنیمت ہوتا کہ اسلامی آثار کے فریفتہ اسی کو دیکھ کر عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کر لیتے، لیکن زمانہ نے اس نقش کو بھی نہ چھوڑا، ۱۸۴۹ء مین پنجاب مین انگریزی حکومت کا آغاز ہوا، یہ وہ دور ہے جس مین محققین آثارِ عتیقہ اور علماے تاریخ نے قدیم ٹیلون کو کھود کر، جنگلون اور ویرانون کی خاک چھان کر، پتھرون، شکستہ برتنون، اور سنگ ریزون کی زبانی عہدِ عتیق کی تاریخ مدون کی ہے، لیکن شومئی بخت دیکھئے، کہ اسی عہد مین لاہور کی اکثر قدیم اسلامی یادگارین تباہ و برباد ہوئین، یا کارکنانِ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تغافل شعاری کا شکار ہو کر کس مپرسی کی حالت مین بہت جلد مٹنے کو ہین،

جدا ہے مقسوم اپنا اپنا الگ ہے تقدیر اپنی اپنی
دیا ہے اس شوخ دلستان نے کسی کو بوسہ کسی کو گالی

بہرکیف ۱۸۶۴ء تک مقبرے کی عمارت موجود تھی، تحقیقاتِ چشتی مین اس کے حالات مرقوم ہین، مگر ۱۸۸۴ء کی شائع شدہ تاریخ لاہور مؤلفہ راے بہادر کنہیا لال سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس وقت اس مقبرے کا نشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا، اور صرف محترمہ مخدومہ بیگم صاحبہ کا مقبرہ اور کنوان باقی رہ گئے تھے، مقابر کی فصیل اور ملحقہ محلات کے کھنڈرات بھی

---

[1] رنجیت سنگھ کی ملازمت مین بہت سے افرنجی لاصل جرنیل تھے، جن مین سے اکثر نپولین شاہ فرانس کے قدیم ملازم تھے، اور اس کی وفات کے بعد تلاشِ روزگار مین ادھر آگئے تھے، ان مین ونتورا، الارڈ کورٹ اور ایوی ٹیبل وغیرہ مشہور ہین، ان کی مدد سے رنجیت سنگھ نے اپنی فوجی قوت کو پنجاب کی جنگجو اقوام پر مسلط کرنے کے لئے ایک زبردست لشکر تیار کیا تھا، جب ایوی ٹیبل پشاور کا فوجی گورنر ہوا، تو اس نے غیور پٹھانون کو غلامی پر رضامند کرنے کے لئے ان پر بڑے ستم ڈھائے، روزانہ بیسیون پٹھانون کو پھانسی دینا اس کا معمول تھا، عوام اس کا نام بگاڑ کر اسے طوبلیہ صاحب کہا کرتے تھے [2] اٹھارہوین صدی عیسوی کے دوسرے نصف مین جب پیہم بیرونی حملون سے مسلمانانِ پنجاب کا شیرازہ بکھر گیا، تو سکھون نے موقع پا کر پنجاب کے شہرون کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا، اسی دور مین لاہور بھی جو کہ ایک وسیع اور خوبصورت شہر تھا، لٹ گیا، ۱۷۹۹ء مین جب رنجیت سنگھ نے اس شہر پر قبضہ کیا، تو تمام شہر بے چراغ تھا، اور میلون تک کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے، اوس نے قدیم اکبری شہر کے گرد خندق اور دوہری فصیل بنوا کر اسے آباد کیا، اور بیرونِ شہر کے کھنڈرات کی اینٹین نئی عمارات مین استعمال کی جانے لگین، کھنڈرات کے علاوہ اینٹ پتھر کے لالچ نے بہت سی دیدہ زیب یادگارین بھی صفحۂ ہستی سے محو کر دین، انگریزی عہد مین بھی کئی سال تک یہ اینٹین بکتی رہین، اکثر عمارات کی بنیادین کھودتے کھودتے گہرے گڑھے

کی اینٹین بک چکی تھین، اور باغ نذرِ خزان ہو گیا تھا، ۱۸۵۰ء کے بعد مخدومہ بیگم کا مقبرہ بھی نیلام ہو کر گرا دیا گیا،

ترے کمال ستم کی یہ یادگار رہے

نہ ہم رہین نہ ہمارا کہیں مزار رہے

سید محمد لطیف کی کتاب "لاہور" مطبوعہ ۱۸۹۲ء سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس فلک نشان عمارت کی یادگار صرف اسکا بڑا کنوان باقی رہ گیا تھا، باغ مقابر اور حویلیون نے لق ودق میدان کی صورت اختیار کر لی تھی، مگر آج اس کنوین کا نشان بھی ڈھونڈے نہین ملتا، جس جگہ یہ مقابر تھے، وہان اب ریلوے جنرل سٹورز اور کارخانے تعمیر ہو چکے ہین،

محلہ مغل پورہ کی شوکتِ رفتہ کی یادگار اب صرف علی مردان خان کا فلک بوس مقبرہ، مدرسۂ ابو الحسن تربتی کے مذکورہ بالا معلم اعلیٰ حضرت حامد قاری کا مزار اور نصرت خان کا مقبرہ باقی رہ گئے، اوّل الذکر دونون یادگارین ریلوے سٹور کے اندر ہین، انھین بلند دیوارون مین محصور کر کے ایک چھوٹا سا راستہ بنا دیا گیا ہے، اور ہر شخص ان کی زیارت کر سکتا ہے، مقبرہ نصرت خان ریلوے کیرج شاپ کے اندر ہے، اس کی ملحقہ مسجد اور دیگر مکانات گرائے جا چکے ہین، اور وہان تک جانے کے لئے کوئی راستہ نہین، ان کارخانون کے پاس ہی لاہور سے امرتسر کی جانب جانے والی ریلوے لائن کا پہلا اسٹیشن واقع ہے، جس کا نام قدیم مغلیہ محلے کے نام پر مغل پورہ رکھا گیا ہے،

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

رفت منزل بدیگرے پرداخت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) بن گئے تھے، مگر اینٹیں ختم نہ ہوتی تھی، آخر انگریزون نے شہر مین ان گڑھون کا وجود حفظ صحت وجان کے لئے خطرہ قرار دے کر انھین بند کرا دیا، اور اینٹون کا نکالنا حکماً روک دیا، انگریزی عہد کے آغاز مین جو مایۂ ناز یادگارین سرکاری محکمۂ نزول یا بعض افراد کی مہربانی سے برباد ہوئین، ان مین ان مقابر کے علاوہ جامع مسجد جہانگیر (عیدگاہ) مقبرہ قاسم خان، دروازہ نخاس، مسجد داراشکوہ، مسجد شاہ بدر، سرائے گوسیان والی، مسجد خواجہ نور اللہ وغیرہ قابلِ ذکر ہین، ۵۲ یہ مقابر یکے بعد دیگرے بعض دیگر یادگارون کی طرح حکومت پنجاب کے محکمۂ نزول نے نیلام کرا دیئے، اور خریدنے والے ٹھیکہ دارون نے انھین گرا کر اینٹین فروخت کر دین،

خط و کتابت کے لئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اوران کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمایشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کی جائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائیں گے

سید سلیمان ندوی

اردو کی دو قدیم کتابین

اور

ان کا زمانۂ تصنیف

از

جناب محمد خلیل صاحب تجاروی بی ایس سی علیگ

رسالۂ معارف بابت ماہ مارچ ۱۹۴۴ء مین جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیوانِ منعم کے متعلق چند شبہات ظاہر فرمائے ہین، تحریر اب میرے مطالعہ مین آئی ہی جواباً اس کے متعلق اپنے معلومات پیش کرنے کا خیال ہوا،

(۱) تاریخ ادب اردو مطبوعہ نولکشور پریس، جو اس وقت پیش نظر ہے اس مین صفحہ ۶۳ پر سلطان محمد قلی قطب شاہ ولد براہیم قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۱۱ء لکھا ہے، اور سلطان محمد قطب شاہ کا سنہ وفات صفحہ ۶۷ پر ۱۶۲۵ء ہی لیکن ہاشمی صاحب نے اسی تاب کے حوالہ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۲۵ء تحریر فرمایا ہی، اسی طرح ہاشمی صاحب کو کتاب سب رس کے بارہ ین بھی شاید سہو ہوگیا، ورنہ تاریخ ادب کے صفحہ ۷۰ پر سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۰ھ تا ۱۰۴۵ھ تحریر ہے، اور محمد قلی قطب شاہ کی وفات سنہ ہجری ہاشمی صاحب نے ۱۰۲۰ھ لکھا ہے، بہار منظر مین ۱۰۲۲ھ ہی،

(۲) مثنوی واقعات امامیہ کے تصنیف رسولی ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے تو واضح ہو کہ مثنوی مین مصنف کا نام وطن بادشا قت ہمایون بادشاہ کا نام اور اسکی تعریف موجود ہے، جس سے زمانہ کا تعین ہوتا ہے، اور ایک جگہ سنہ تحریر ہے، پھر کتاب مراۃ الانساب، مراۃ احمدی، نسب نامہ مفتیان ریواڑی ارمغان دلی وغیرہ سے مصنف اور اس کے آبا و اجداد کے حالات علم مین آتے ب جس مین ان کا شجرۂ نسبی و شجرۂ قرآنی و شجرۂ شاعری وغیرہ بھی درج ہین، اور اس کے بعد کا سلسلۂ شاگردی قاری حافظ حکیم ید شاہ نجم الدین صاحب نصیری کوڑی کے شاگرد تک پہنچا ہے،

حضرت شاہ غلام رسولؒ کے مزار شریف کے متصل قلندری مسجد کی دیوار پر (جس کو قناتی مسجد بھی کہتے ہین) اس کا قطعۂ تاریخ رنے کے ابھرے ہوئے حرفون مین لکھا ہی، دیوار گرجانے سے کچھ عبارت کے حروف ٹوٹ گئے ہین، بقیہ یہ ہین ؎

زگلزارِ نظام الدین گلے رفت رسولش نام می گویند باغم

سیہ دل ماند لالہ از رحیلش ......فخر دین از گشت داغم

(۳) دیوان منعم کی بابتہ لکھتے ہین، کہ اس کو ۹۳۰ھ ۹۴۴ یا اس زمانہ کا دیوان قرار دینے کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی، رسکتا ہے کہ محمد اشرف منعم تخلص رکھتے ہون، مگر کسی اور شخص کا تخلص منعم ہونا خارج از قیاس نہین ہو سکتا، الخ

اس سلسلہ مین عرض ہی کہ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف، حضرت شاہ غلام رسول (قدس اللہ اسرارہما) کے برادرزادہ ، ، (کتب مسطورۂ بالا) اور حضرت سجادہ نشین صاحب خانقاہ شعیبیہ تجارہ آفتاب میوات کے بزرگان گذشتہ سے ہین، یہان سوا اور کہین یہ دیوان موجود نہین، مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بھی اپنے گرامی نامہ نمبر ۵۳۴۹ مین ارقام

فرماتے ہین کہ

"میرے کتب خانہ مین قدیم اردو کے کئی سو قلمی نسخے موجود ہین، مگر آپ کے حضرت شاہ غلام رسول اور دیوان منعم کا کلام نہین ملا، آپ کی بدولت اس کی اطلاع پہلی بار ملی، کیا یہ ممکن ہے کہ مین آپ کی وساطت سے اس کی زیارت کر سکون، مثنوی مین ہمایون بادشاہ کا نام اور اس کی مدح موجود ہے، جو کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس وقت کی لکھی ہوئی ہے، مین آپ سے مل کر اس مثنوی اور دیوان منعم کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا، یا یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ اُن کی نقلین مل جائین"

رہا بعض شعرون کا کچھ صاف ہونا تو ہو سکتا ہے مضمون نگار نے صاف اشعار خاص طور پر منتخب کرکے اس نے لکھے ہون کہ جس طرح کلام ولی و مثنوی میرحسن مین جو ڈیڑھ سو سال پیشتر کی زبان مین ہے، بہت سے اشعار کس قدر صاف ہین، ولی کے بعض اشعار بالکل آج کل کے معلوم ہوتے ہین، جیسے:-

خوبرو خوب کام کرتے ہین   اک نگہ مین غلام کرتے ہین

آرزوے چشمۂ کوثر نہین   ہون پیاسا شربت دیدار کا

اے ولی رہنے کو دنیا مین مقام عاشق   کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

مثنوی میرحسن کے متعلق مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہین "کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتین سُنائی دیتی تھین کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے، جواب ہم تم بول رہے ہین" اور یہی کتاب "دکن مین اردو" کے اندر خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ متوفی ۸۲۵ھ کا یہ شعر موجود ہے،

پانی مین نمک ڈال مزا دیکھنا اسے   جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے   (از بیاز مظہر)

اس کے ساتھ کلام منعم پڑھا جائے :-

منعم جو نشہ سبز سین سرخوش ہین ان کے تئین   می سیتی زیادہ بخشتے ہین دیکھو بہار خط

تو نمک والے شعر سے کہین زیادہ قدامت کلام منعم مین پائی جاتی ہے،

اسی طرح سلطان محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۲ھ یا ۱۰۲۰ھ کا یہ شعر ہے :-

کرتے ہین دعوی شعر کا سب اپنی طبع سون   بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

اور سلطان محمد قطب شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ کا یہ شعر لکھا ہے،

ساقیا آ شراب ناب کہان   چندر کی پیالی مین آفتاب کہان

سلطان عبد اللہ قطب شاہ متوفی ۱۰۸۳ھ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ے

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا   کرتے ہین تجھ سے خضر علیہ السلام بحث

اس کے مقابلہ مین کلام منعم دیکھئے :-

منعم جو نشہ سبز سین سرخوش ہین ان کے تئین   می سیتی زیادہ بخشتے ہے، دیکھو بہار خط

جس سے اشعار مذکورۂ بالا سے کہین زیادہ قدیم زمانہ کا اندازہ ہوتا ہے،

ادبیات

کلامِ احسان

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ال ال بی، علیگ، اعظم گڈھ

عبث ہوش و خرد کا ادعا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ جنون ہی زندگی کا رہنما معلوم ہوتا ہے

یہ کیسا اب سکونِ جانفزا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ مگر دل وقفِ تسلیم و رضا معلوم ہوتا ہے

کوئی شوریدہ سر محوِ دعا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ کہ جنبش مین حریمِ کبریا معلوم ہوتا ہے

نظر سے گرچہ وہ میری جدا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ مگر پھر بھی عجب اک ربط سا معلوم ہوتا ہے

یہ ریزش اشکِ پیہم کی، یہ سوزش جانِ پرغم کی ۔۔۔ تمھاری یاد مین سب کچھ بھلا معلوم ہوتا ہے

زبان آمادۂ شکوہ سرائی ہو تو کیونکر ہو ۔۔۔ کہ مجھ کو حسن بالکل بے خطا معلوم ہوتا ہے

کسی محمل نشین کی جنبشِ ابرو سے کیا ہوتا ۔۔۔ غبارِ قیس خود اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے

کرون کیا درد کو مرہونِ منت چارہ سازون کا ۔۔۔ کہ آپ اپنا یہ خود مشکل کشا معلوم ہوتا ہے

نظر آتی کسی کو ہو گی ذوقِ عشق کی منزل ۔۔۔ مجھے تو اک غمِ لا انتہا معلوم ہوتا ہے

یہ سازِ دہر گو خاموش ہے لیکن پسِ پردہ ۔۔۔ عجب اک مطرب آتش نوا معلوم ہوتا ہے

عجب ذرہ ہے یہ دل بھی کہ جس کی قید سے جلبان ۔۔۔ یہ سارا عرصۂ ارض و سما معلوم ہوتا ہے

غبارِ زندگی ہے خود ترا اک پردۂ حائل ۔۔۔ دگرنہ اس کا جلوہ برملا معلوم ہوتا ہے

بچاتا پھر رہا ہے یون جو کشتی موجِ طوفان سے ۔۔۔ عجب بے زادہ رو یہ ناخدا معلوم ہوتا ہے

چلا ہے ساتھ شاید لیکے عقلِ مصلحت بین کو ۔۔۔ یہ دل کیون ٹھوکرین کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

یہ کیسی ہو رہی ہے آج جنبش چشمِ ساقی کو ۔۔۔ کہ اک خمخانۂ اسرار وا معلوم ہوتا ہے

یہ ہے کس کے تصور کی تجلی سامنے جس کے ۔۔۔ مجھے سب محوِ نقشِ ماسوا معلوم ہوتا ہے

اشارہ اس نظر کا دیکھتا ہون وجد کرتا ہون ۔۔۔ عجب اک نغمۂ بے ساز و صدا معلوم ہوتا ہے

نظر حیران، زبان خاموش، دل مجبور، جان عاجز ۔۔۔ بس اب تو کچھ ترا ہی آسرا معلوم ہوتا ہے

جنون کیسے کہوں تیرے جنون کو مین کہ تو اب تک ۔۔۔ غمِ سود و زیان مین مبتلا معلوم ہوتا ہے

جہان تک ان کے اندازِ ستم پر غور کرتا ہون ۔۔۔ سراپا عالمِ مہر و وفا معلوم ہوتا ہے

کہان جائیں کسے دیکھیں کہ ہم شوریدہ جانون کو ۔۔۔ ترے ہی در پہ ہو جانا فنا معلوم ہوتا ہے

نظر کیا پردہ ہائے ساز کی جنبش یہ ہے تیری ۔۔۔ یہ سب کیفِ دلِ رنگین ادا معلوم ہوتا ہے

یہ کیون آزردہ دل بیٹھے ہین اربابِ چمن آخر ۔۔۔ خزان کا رنگ بھی کچھ دلربا معلوم ہوتا ہے

ادائین تو ذرا احسان کی اہلِ نظر دیکھین ۔۔۔ بظاہر گو فقیرِ بے نوا معلوم ہوتا ہے

باب التقریظ والانتقاد

"مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر"

مرتبہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، حجم ۱۹۰ صفحے، تقطیع چھوٹی ناشر مکتبہ دین و دانش، کھنیاں کنوان بانکی پور پٹنہ قیمت عہ

از

سید ریاست علی ندوی

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے افکار و خیالات پر چند مستقل کتابیں شائع ہوئی ہیں، زیر نظر رسالہ ان کے جواب و نقد میں ترتیب پایا ہے، مولانا سے مرحوم اپنی پوری زندگی میں پرشور انقلابی حوادث سے دوچار ہوتے رہے، اور ان کی زندگی کے ہر نئے موڑ پر نیا ماحول اور نئے افکار اُن کے سامنے آتے گئے، دیوبند کی دینی و مذہبی فضا سے نکل کر لادینیت کے مرکز ماسکو میں پہنچے، پھر ترکی میں عین اُسی زمانہ میں جا پہنچے جب کہ تجدد پسند ترک پوری ترکی قوم کی قلب ماہیت میں مصروف تھے، پھر اچانک حجاز میں چلا آنا جہاں نجد کی دینی تحریک کو نیا غلبہ حاصل ہوا تھا، ان کے افکار میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے کچھ کم موثرات نہ تھے، ان سب ملکوں میں دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار و خیالات میں شکست و ریخت کا عمل غیر معمولی سرگرمی سے جاری تھا، مولانا مرحوم نے ان متضاد ماحولوں میں اپنی غیر معمولی فطری ذہانت پر اعتماد رکھ کر ان متضاد افکار و خیالات کو تولنے اور انھیں رد و قبول کرنے کا عمل جاری رکھا، اور اپنی فطری ذہانت سے متضاد افکار نظریوں اور رایوں کو ہم آہنگ کرنے اور اپنے فہم کے مطابق ان میں باہم رابطہ قائم کرنے میں اپنی ذہانت کا حیرت انگیز کمال دکھایا،

اتفاق کی بات ان کے خیالات کی ترجمانی کے لئے جو ذی علم نوجوان پروفیسر محمد سرور (جامعی) نامزد کیے گئے، انھیں بھی چھوٹے پیمانہ پر تقریباً اسی قسم کے متضاد ماحول سے سابقہ رہ چکا تھا، ایک طرف وہ جامعہ ملیہ سے وابستہ تھے، دوسری طرف وہ اسی چہار دیواری میں مولانا سورتی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے جنھیں بقول موصوف "اسلاف کے تتبع میں بڑا تشدد تھا، اور طالب علم کے لئے شریعت کی معمولی سے معمولی شعار کی بھی عدم پابندی کو گوارا نہ کر سکتے تھے"، پھر وہ مصر پہنچے، اور ایک طرف وہ جامعہ ازہر کے شیوخ کے حلقۂ درس میں بیٹھے، اور دوسری طرف مشہور مصری بے دین ملحد، ڈاکٹر طہٰ حسین کے لکچروں میں شریک رہے، اور جب وہ مصر سے لوٹے تو بقول خود "ایک مسلسل ذہنی کوفت، ہر لمحہ اضطراب کی کیفیت، نہ کامل یقین، اور نہ پورا انکار، تشکک جو ہر وقت دماغ کو مصروف اور دل کو پریشان رکھے، ...... یہ حاصل تھا، جو وادی نیل سے لیکر راقم الحروف وطن لوٹا" (مقدمہ مولانا عبیداللہ سندھی ص ۱۴) در اصل یہ موزون ترین ذہنی آئینہ ہو سکتا تھا جس میں مولانا سندھی کے متضاد افکار و خیالات کی عکاسی کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ ترجمان نے بڑی دلکشی و خوش سلیقگی سے اپنا فرض انجام دیا، متضاد افکار و خیالات کو ایک سلسلہ میں پرونے انھیں تشبیہات و تمثیلات سے سنوارنے، کسی ایک ہی واقعہ کو دو متضاد زاویوں سے دیکھنے، اور دونوں کو بظاہر دلنشیں انداز میں سمجھا دینے کی ایسی کم مثالیں ملیں گی، لیکن حق و باطل کو

خواہ جتنے پردون مین چھپایا جائے جس قسم کا آب ورنگ دیا جائے، اور ذہانت کی مدد سے جیسے نتائج مرتب کئے جائین، اہل نظر پران کی حقیقتین آشکارا رہین گی ۔ مگر اسلام اور مسلمانون کی مذہبی، تمدنی اور ملی زندگی کے لئے ایسی کتابین زیادہ نقصان رسان نہین، جو کھلے طور پر الگ شاہراہ اختیار کرکے تیار کی گئی ہون لیکن ایسی کتابون سے جیسی کہ مولانا سندھی کے سلسلہ مین شائع ہوئی ہین، خصوصاً نوجوان اور دین اور اسلامی تاریخ و تمدن سے ناواقف مسلمان طبقون مین جس قسم کے زہریلے اثرات کے پھیلنے کا امکان ہوسکتا ہے، اس کا حقیقی اندازہ لگانا بھی دشوار ہے،

مولانا سندھی نے جب ابتداءً اپنے خیالات ظاہر کئے، تو ان کے دیرینہ عقیدت مند حلقون مین ان کے مفہوم و معانی پر شک و شبہ کی نظر ڈالی گئی، الفرقان کے ولی اللہ نمبر مین مدیر الفرقان نے ان کی عبارتون کے مختلف مفہومون کے اعتبار سے ایسے پہلوؤن کو اختیار کرنا چاہا، جو مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہون، اور دبی زبان سے ان کے مخالف پہلوؤن کے مطالب سے اختلاف کرکے ان کی تردید کی، لیکن مولانا سندھی اپنے افکار کی اشاعت کے لئے ایک مستقل مجلس کی تاسیس عمل مین لا چکے تھے، جنانچہ مستقل تصنیفات کی شکل مین بڑی آب و تاب سے شائع کئے گئے، اور ملک کے سنجیدہ حلقون مین ان کی مستقل تردید کی ضرورت محسوس کی گئی، چنانچہ اس سلسلہ مین سب سے پہلے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے معارف مین ان کی دو کتابون پر اپنا سلسلۂ مقالات شائع کرایا، اب ان مضامین کا مجموعہ عام افادہ کے لئے عنوان بالا سے رسالہ کی شکل مین شائع کیا گیا ہے، موصوف کا پہلا سلسلۂ مضامین مولانا سندھی کی زندگی مین شائع ہوا تھا، چنانچہ مولانا سے مرحوم اور ناقد کے درمیان بعض خیالات کی تشریح و توضیح مین مراسلت بھی ہوئی، یہ خطوط بھی رسالہ مین منسلک کر دیئے گئے ہین جن سے رسالہ کی افادیت مین اضافہ ہوگیا ہے، نیز رسالہ کی ابتدا مین حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا ایک مختصر و جامع مقدمہ ثبت ہے، جس مین ہندوستان مین مسلمانون کے دور تنزل اور اس کے دور کرنے کے لئے مختلف مصلحین و مفکرین کی مساعی کا ذکر آیا ہے، اور اُن کے نتائج اختصار سے پیش کئے گئے ہین پھر مولانا سندھی کے سوانح حیات کے پس منظر سے ان کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کی بعض غلطیان نمایان طور پر دکھائی گئی ہین، افسوس ہے کہ اس سلسلہ مین صفحہ ۵ پر مولانا ے موصوف کے افکار کے تذکرہ مین اُن کے ماخذ کا حوالہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے انشاءاللہ معارف کے کسی آیندہ نمبر مین یہ مقدمہ مع حوالون کے نقل کرلیا جائے گا،

مولانا مسعود عالم کا پہلا سلسلۂ مضمون مولانا سندھی کی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" پر استدراک وتنقیح" کے عنوان سے ہے، مولانا سندھی نے اس تصنیف مین حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کو ایک منظم سیاسی تحریک چلانے والے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ناقد نے اس پر فاضلانہ نقد کیا ہے، اور اس سلسلہ مین مولانا ے مرحوم نے مرکزیت ثابت کرنے کے لئے واقعات کو جس رنگ مین پیش کیا ہے، اس کی اصل حقیقت ظاہر کی ہے، مولانا نے "پارٹی" کی اس تشکیل مین حضرت مولانا سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کے ان مجاہدانہ خدمات کو جوان کے ہاتھون انجام پائے، اور جس کا غلغلہ ایک زمانہ مین پورے ہندوستان مین بلند ہوا، گویا ایک ضمنی حیثیت دے دی ہے، پھر اس تحریک کے بڑے بڑے اکابر جو مختلف صوبون مین گذرے، ان کا تذکرہ بھی ایسے اسلوب مین کیا ہے، جو حقیقت سے دور تھا، ناقد نے تاریخی حقائق و شواہد سے ان بزرگون کا اصل مقام دکھایا ہے، نیز چونکہ اس تحریک کے اکابر اپنے عقائد کے لحاظ سے مولانا سندھی کے بقول اسلام کی حجازی تعبیر کے بجائے "عجمی" یا "ایرانی بائی لاز" کے پیرو نہ تھے، اس لئے مختلف موقعون پر ان کے ساتھ انصاف قائم نہ رہ سکا ہے، ناقد نے اپنی بحث و نظر مین ان مسائل کو بھی صاف کیا ہے، نیز بعض دوسری تحقیقی بحثین بھی آئی ہین،

دوسرا مقالہ "مولانا عبید اللہ سندھی" نام تصنیف پر لکھا گیا ہے، اس کتاب مین مولانا کے مختلف نوعیتون کے افکار پیش کئے گئے ہین، جن کا تعلق عقائد، کلام، تصوف، فقہ، تاریخ وسیاست سب ہی سے ہے، اس کے ساتھ مولانا کے چند خاص مذہب آمیز سیاسی افکار وخیالات ہین، اس سلسلہ مین مولانا نے ایک طرف پوری اسلامی تاریخ اور دوسری طرف ہندوستان کے پورے اسلامی عہد حکومت کا اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے، اور عجیب وغریب تضاد کے ساتھ اپنے نظریے بیان کئے ہین، ناقد نے اسلامی علوم وعقائد کے مباحث پر جامعیت سے نقد کیا ہے، اور اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، اور تاریخی مباحث مین اجمالی تبصرہ کر دیا ہے، اور واضح اغلاط کو نمایان کیا ہے،

مولانا کے افکار کا جائزہ لینے کے لئے مستقل تصانیف کی ضرورت ہے، وہ ایک ہی سانس مین متضاد باتین کہہ جانے مین اپنا ثانی نہین رکھتے، ایک ہی بات کو جداگانہ زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہین، اور ایک دوسرے سے متضاد نتائج نکالتے ہین، مثلاً ایک طرف تو وہ اسلام کو "انٹرنیشنل مذہب" کی صورت مین پیش کرتے ہین دوسری طرف "فی کل ارض ادم مثل آدمکم و نوح مثل نوحکم" ایک حدیث کا حوالہ دیکر کہتے ہین :-

"یہان ارض سے مراد قوم ہے اور دنیا کو سات بڑی بڑی قومون، تہذیبون یا عالمین مین تقسیم کیا جاسکتا ہے، توریت انجیل اور قرآن صرف اس طرح کی ایک قوم کی تاریخ ہے، اسی قسم کے واقعات تقریباً سب قومون مین گذرے ہین" (مولانا عبید اللہ سندھی ص)

اس طرح قرآن مجید صرف ایک قوم یعنی عرب کی تاریخ بن گیا،

پھر فرماتے ہین :-

"مخاطبین کی رعایت سے اسے ایک خاص زبان اور مکان سے مخصوص کرنا ہوتا ہے، قرآن کے پیرایۂ بیان کی محدودیت بھی اسی بنا پر ہے" (ص ۸۶)

اس کے بعد عالمگیریت اور جامعیت کے تصور کو لاتے ہین، مگر محض "بین السطور مفہوم" کے اعتبار سے چنانچہ فرماتے ہین،

"لیکن اس کے باوجود جابجا بین السطور مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت نمایان ہے، اگر آدمی قرآن کے مطالعہ مین تدبر وتعمق سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا، کہ کل نوع انسانی قرآن مین اپنا مافی الضمیر اور مقصد پا سکتی ہے" (ص ۸۶، ۸۷)

گویا اس کا "کافۃ للناس" ہونا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا وغیرہ سب کے سب قرآن مجید کے بین السطور مفاہیم ہین، اور اس کے اصل مخاطب محض عرب ہین، بااین ہمہ وہ انٹرنیشنل مذہب ہے،

اسی طرح مولانا کے نزدیک حقیقی مومن وکافر کی وہ نشانیان نہیں، جو قرآن مجید نے اپنی واضح آیات مین پیش کی ہین، بلکہ "انانیت کا بیدار نہ ہونا مولانا کے نزدیک کفر ہے، اور جس کی انانیت بیدار ہو جائے، گو رسمی طور پر اسے لوگ کافر کہتے ہون، وہ حقیقت مین مسلمان ہوتا ہے" (ص ۱۱۰)

گویا خواہ کوئی توحید ذات وصفات کا قائل ہو یا نہ ہو، رسالتِ محمدی کا خواہ کوئی اقرار کرے یا انکار، یا بدرجۂ اعلیٰ سکوت اختیار کرے، لیکن اس کی انانیت بیدار ہو چکی ہے، تو وہ مسلمان ہے، اور عند اللہ بری الذمہ ظاہر ہے، کہ ان عقائد کو اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، ؟

مولانا کے نزدیک "اسلامی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے" (ص ۱۱۱) حالانکہ اسلامی تصوف کا

استوار و مدار خالصتہً کتاب وسنت پر ہے۔ تصوف وہی ہے جس کو شریعت کی اصطلاح مین احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کو مولانا جذبہ تصوف سے موسوم کرتے ہین (ص ۱۳۰) البتہ یکسوئی کے حاصل کرنے کے لئے ذریعہ و آلہ کے طور پر بعض طریق عمل اگر سے اختیار کئے گئے ہین، لیکن ان کی حیثیت ویسی ہی ہے، جیسے کہ بعض بزرگون کی تمثیل کے مطابق نماز کے اوقات کے انضباط کے لئے گھڑی سے مدد لی جاتی ہے' اس طریقِ عمل کو عقائد و روحانیات سے تو کوئی علاقہ نہین ہے،

مولانا مرحوم کا خیال ہے کہ ایران و ہندوستان کے مسلمانون مین "آریائی ذہنیت" ہمیشہ باقی رہی، "عقیدہ کی تبدیلی سے فرد یا جماعت کی ذہنیت نہیں بدلا کرتی، ایرانی و ہندوستانی مسلمان ہوئے تو انھون نے پیرون اور پیغمبرون کو وہ درجہ دیا، جو قبل از اسلام اپنے بزرگون کو دیتے تھے، اور پیر کا حکم خدا کا حکم سمجھا جاتا تھا" (ایضاً ۱۵۶)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق ارشاد ہے کہ "انھون نے تجلی کا مسئلہ حل کرکے ایک طرف تو آرین فلسفی (… حکمت) اور سامی نبوت مین اس اختلاف کو رفع کر دیا، اور دوسری طرف غیر مسلمون پر اسلام کی حقانیت ثابت کر دیا" (ایضاً ۱۵۶)

ان مسائل مین جن کا تعلق خالصتہً کتاب و سنت اور نفس اسلام سے ہے، ان مین آریائی ذہنیت کا سراغ لگانا اور ان بزرگون پر وطنیت کے جذبہ و اثر سے آریائی ذہنیت کو قبول کرنے کا الزام لگانا کیسی صریح ناانصافی ہے، اگر اس موقع پر اسلام مین اتباعِ رسالت کی جو تشریح کی گئی ہے، اور تصوف مین شیخ کا جن اوصاف سے متصف ہونا، اور اس کے بارے مین جن جن قیود و حدود کے قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، مولانا انھین اپنی نگاہ مین رکھتے، تو وہ اس قسم کے نظریے قائم نہ کر سکتے تھے،

مولانا فرماتے ہین:-

"نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول سے ہی بنتی ہے، مثلاً ہندوستان مین فطرۃً "ذبح حیوانات" پسندیدہ نہین، اس لئے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے، تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہ ہوگا، کیونکہ انسانون کی جو فطرت ہوتی ہے نبوت اس کے خلاف نہیں جاتی نبوت کا کام یہ ہے، کہ وہ افراد کے فطری رجحانات اور ان کی جبلی استعدادون کے مطابق ان کے لئے ترقی کی راہین بتائے (ص ۵۵-۲)

یہان اوّلاً یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ یہ کلیتہً صحیح کیونکر ہے، کہ ہندوستان مین قدرۃً "ذبح حیوانات پسندیدہ نہین" اگر ایسا ہوتا، تو قربانی کے جو احکام ویدون مین آئے ہین، وہ کیون پائے جاتے، یا آج بھی ہندوؤن (جینی بودھ نہین) مین عام طور پر قربانی کی رسمین کیون انجام پاتی ہین، ان مین رسومِ قربانی کے ترک کرنے کی تلقین تو صرف پارس ناتھ مہابیر اور بودھ نے کی ہے، لیکن نرگرنتھ جین اور بودھ مت کے ماننے والون کی کتنی تعداد ہندوستان مین پائی جاتی ہے، بودھ مت کے فروغ کے بعد جب برہمنون کے دورِ حکومت مین اس کے خلاف تلقین کی گئی، تو ہندوستان کی فطرت وجبلت کے مخالف ہونے کے باوجود قربانی کی رسمون کو دوبارہ کیون فروغ حاصل ہوا،

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ویدک دھرم کے کچھ پیروؤن نے جین اور بدھ مت کے ایک اصول "اہنسا" کو اپنے دھرم مین وسعت دے کر قبول کر لیا، لیکن ان کی فطرت وجبلت سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے، یہ تو قربانی کے سلسلہ مین ویدون مین جو بے شمار خرافات رسمین پھیل گئی تھین، اور جن سے ان کا دھرم رسمون کا ایک گورکھ دھندا بن گیا تھا، اس کے خلاف

اہنسا کے اصول کا پرچار ایک موثر اصلاحی قدم تھا، اگر آریوں کی فطرت جبلت ذبح حیوانات کو ناپسند کرتی، تو ان مین قربانی اور اس سلسلہ مین بے شمار رسمون کو مقبولیت مہرے سے حاصل ہی نہ ہوتی، اور نہ ان مصلحین کو ان کی اصلاح کی ضرورت پیش آتی، علاوہ ازین کسی خاص مصلحت سے کسی خاص جانور کے ذبح سے دستکش ہو جانا بھی نفس ذبح حیوانات سے جبلۃً انکار کرنے کے مترادف نہین ہے،

علاوہ ازین اگر ہندستان مین ذبح حیوانات کی ممانعت "خلاف نبوت" نہین تھی تو مولانا کے بقول فقہ حنفی کی تشکیل "تدوین آریائی نہ ورتون اور ذہنیتون کے لحاظ سے آریائی نسل کے مسلمان اکابر کے ہاتھون ہی انجام پائی تھی) اور ان کے بقول فقہ حنفی در اصل "ایرانی بائی لاز" ہو جو آگے چل کر روسی بولنے والی قومون کے مرکز دہلی مین اسلام کی ایک مستقل فقہ کی حیثیت سے نو پذیر ہوئی (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ) اور "قرآن کے بین الاقوامی قانون کی حجازی تعبیر عربون کیلئے قومی مذہب تھی اور اس کی حنفی تعبیر عجم کا قومی دین قرار پائی (ص ۲۶۲) اور اسی سبب سے اسے معانی ہی کو قرآن سمجھے (ص ۲۶۰) باین ہمہ ان ایرین نژاد مسلمان فقہا نے اسلام کے اس ایرانی بائی لاز یا عجم کے اس اسلامی "قومی دین" مین بھی جو مدون ہوا اور احکام نبوت کے خلاف بھی نہ تھا، پھر بھی ذبح حیوانات کو اس فقہ مین بھی ممنوع یا ناپسندیدہ نہین کیا گیا جب اس ایرانی بائی لاز نے ایرین قومون میں سے ایک بڑی قوم کی جبلت و فطرت تک کا کوئی لحاظ نہین کیا تو آخر کس قسم کی وطنی نسلی رعایتین ان بائی لاز مین رکھی گئی ہین، کہ اس کو "ایرانی بائی لاز" سے موسوم کیا جائے مولانا اپنے خیالات کے تولنے کے لئے جو ترازو تیار کرتے ہین ان کے نظریے اس ترازو پر بھی پورے نہین اترتے، مولانا کے افکار و خیالات اسی قسم کے خلاف واقعہ و خلاف قیاس تعبیرات کا ایک خوشنما انبار ہے،

اکبر کے متعلق مولانا کا دلچسپ نظریہ ہو وہ اس کے دین الٰہی کے بڑے مداح اور اسکو فکر کی عظیم ترین ہندی تصو فرماتے ہین دین الٰہی مبادی عقائد اور اسلام کی تعلیمات مین جو بین تضاد ہو وہ اہل علم پر پوشیدہ نہین ناقدنے اس کی طرف اشارے کیے ہین نیز اس سلسلہ مین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق جو غلط فہمی پھیلائی گئی تھی، کہ ان کے نزدیک اس کا اقدام عین صواب تھا (ص ۳۲) اس کے متعلق حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ مین شاہ صاحب کی کتاب انفاس العارفین کے اقتباس کو پیش کر کے اس کا پردہ چاک کیا ہے،

اکبر کے سلسلہ مین مولانا سندھی کے افکار عجیب قسم کے تضاد کے حامل ہین، ایک طرف وہ فرماتے ہین :-

"اکبر پہلا مسلمان فرمانروا تھا جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی، اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع، یہ مسلمانون کی قیادت مین ہندوستان مین قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور اس کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش" (ص ۲۹۳)

پھر اسی سانس مین فرماتے ہین :-

"حکومت کا دین اسلام نہ رہا، اکبر اب صرف مسلمانون کا بادشاہ نہ تھا، بلکہ سارے ہندستانیون کا فرمانروا تھا، اور ساری رعایا بادشاہ کی نظر مین یکسان اور مساوی تھی" (ص ۲۹)

اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس حکومت کا دین اسلام نہ رہا ہو، اور جس کی نظر مین مسلم اور غیر مسلم مین کوئی ذاتی امتیاز نہ ہو اس کو آزاد اسلامی ہندستانی سلطنت (ص ۲۹۳ ص ۳۱۹ ص ۳۱۳) وغیرہ سے کیونکر موسوم کیا گیا، وہ آزاد ہندوستانی سلطنت تو کہی جا سکتی ہو مگر اس پر اسلامی کا اطلاق کس حیثیت سے کیا جا سکتا ہے،

اسی سلسلہ مین دوسری دلچسپ بات یہ ہو کہ مولانا کے بقول "اکبر کے دین الٰہی کی بنیاد عقیدۂ وحدۃ الوجود کی اصل حقیقت پر ہے" (ص ۲۹) پھر خود ہی ارشاد فرماتے ہین کہ "ابن عربی جو مسلمانون مین اس فکر کے بانی اور مبلغ ہین ان کی اپنی زندگی اتباع حدیث کا نمونہ تھی، چنانچہ وہ (ابن عربی) خود فرماتے ہین، کہ ہر حقیقت جو خلاف شریعت ہو گمراہی ہے" (ص ۲۵)

یہان یہ سوال ہوسکتا ہی کہ اکبر کا دینِ الٰہی خلاف شریعت تھا یا نہین، اگر خلاف شریعت تھا تو اس فکر کے بانی و مبلغ ابن عربی کے فیصلہ مطابق وہ گمراہی قرار پاتا ہی، یعنی انہی کے فلسفہ پر اس کی بنیاد ہی، اور انہی کی نظر مین وہ گمراہی ہے،

اورنگ زیب کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ اس کی خواہش تھی، کہ

"وہ اس ہندستانی اسلامی سلطنت کے دائرۂ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آجائین اور حجاز پر بھی اس کا اقتدار ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا، جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا، اور اکبری سیاست کے بارے مین اسلامی دنیا مین جو غلط فہمیان پیدا ہوگئی تھین، ان کو رفع نہ کرتا" (ایضاً ص ۳۱۴)

اس طرح غریب اورنگ زیب عالمگیر نے اسلامی آئین و احکام کی جو کچھ پابندی کی، اور اپنے حدود حکومت مین شریعت کے نفاذ کے لئے قدم اٹھایا، وہ للّٰہیت و اخلاص کے بجاے تمامتر سیاسی حکمتِ عملی پر مبنی قرار پاتا ہی، اور اکبر کی روش کی جو انہے مذمت کی، وہ اسلئے نہیں کہ اسکے دینی نقطۂ نظر سے ایسا کرنا ضروری تھا، بلکہ وہ "غلط فہمیون" کو دور کرکے عالم اسلامی پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی فضا کو ساز گار بنانا چاہتا تھا، اور کے سیاسی تدبر و دوراندیشی، اور فکر عالی کے پردہ مین اوس کے یہ سارے بہتان اس لئے تھوپے گئے، کہ اس کے ہاتھون ہندوستان سی و ذہنی ارتقار کی اس منزل پر پہونچ سکے، کہ وہ ایشیائی ممالک مین بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم مرکز بن سکے (ص ۳۱۲) لیکن گیر کے ہاتھون ہندوستان کو بین الاقوامی سیاست کا مرکز دکھانے کی کوششون مین خود غریب عالمگیر کے دین و اخلاق کا دامن کس قدر دار ہوگیا، اس پر نگاہ نہ جاسکی، اور نہ اس نظریہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے مین یہ نظر آسکا کہ ایسی حالت مین حکمران و کشورکشا کی یت سے خود عالمگیر کا مرتبہ کس قدر گر جاتا ہے، کہ وہ اپنے ۵۰ سالہ دورِ حکومت کے باوجود اس مقصد کے حصول مین اس قدر ناکام مغرب میں اپنے حدودِ حکومت سے باہر کی سرزمین کا ایک چپہ بھی اپنے قبضہ مین نہ لاسکا، بلکہ اپنے خیال کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے یائی حکومتون مین سے کسی ایک حکومت کے حدود مین بھی قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کرسکا، اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ صرف ہندوستان ایشیائی سلطنتون مین بین الاقوامی مرکزیت کا طغراے امتیاز حاصل کرنے کے لئے عالمگیر کی ثناخوانی ہی کے پردے مین اس کے دین ب، سیرت و کردار کو کس قدر مسخ کیا گیا ہی، اور اس مرقع مین اس کی جیسی تصویر اتاری گئی ہے، کیا اس کے عہد کی تاریخ کے پڑھنے والے لمحہ کے لئے بھی اس کو صحیح باور کرسکتے ہین،

لائق ناقد نے اس رسالہ مین مولانا کے اسی قسم کے افکار و خیالات کا جائزہ پوری کامیابی کے ساتھ لیا ہے، اور مختلف دینی ی، و تاریخی مسائل و مباحث مین ان کے بے بنیاد نظریون، اور قیاسون، اور غیر صحیح دلیلون کی نشان دہی کی ہے، امید ہی کہ حلقون مین مولانا کے افکار پڑھے گئے ہین، ان مین اس رسالہ کو خاص طور پر مطالعہ مین لایا جائے گا، کہ اہل نظر حقائق کے صحیح سراغ ب اجمالی خاکہ دیکھ لین، اور غلطیون کی انہی نشان دہیون پر مولانا کے بے شمار نت نئے افکار اور نظریون کا اجمالی تصور کرسکین، اور لامی حلقے ان مضرتون کے پھیلنے سے محفوظ رہین، جو ان افکار کی ترویج سے پیدا ہوسکتی ہین،

مطبوعات جدیدہ

مارننگ نیوز کا عید نمبر (انگریزی) ترتیب جناب عبدالرحمن صدیقی صاحب تقطیع بڑی ٹائیٹل پیج رنگین و دیدہ زیب

کاغذ کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۸۰ صفحے قیمت عہ ملنے کا پتہ، مارننگ نیوز، ۲۵، چورنگی، کلکتہ،

مارننگ نیوز کلکتہ کا روزانہ انگریزی اخبار ہے، جو جناب عبدالرحمن صاحب صدیقی کی ادارت میں کئی سال سے برابر نکل رہا ہے اور اپنے طرز نگارش اور پالیسی کے لحاظ سے معاصر اخبارون مین امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ہر سال عید کے موقع پر اس کا ایک عید نمبر بھی نکلتا ہے جس مین مختلف قسم کے مفید مضامین ہوتے ہین چنانچہ اس سال کے عید نمبر مین نہ صرف سیاسی، بلکہ تاریخی، ادبی اور مذہبی مقالات بھی ہین جن کے لکھنے والے بیشتر ملک کے مشاہیر ہین، نیاز احمد خان صاحب آئی سی، ایس نے جاوید نامہ اقبال کے لفظ مین" کے عنوان سے جاوید نامہ کی اس تلخیص کو پیش کیا ہے، جو اقبال مرحوم نے گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن مین ان کو لکھائی تھی، مضمون نگار کا بیان ہے کہ جاوید نامہ کی تلخیص ختم کرتے وقت اقبال مرحوم کی آنکھون سے آنسو روان ہوگئے، جو دیر تک نہ رک سکے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے اقبال کے فلسفہ خودی کی روشنی مین دل نشین انداز سے "شخصیت" پر بحث کی ہے، اخبار کے فاضل اڈیٹر نے محمد علی شاہ قاچار سے استنبول مین اپنی ملاقات کا حال بہت دلچسپ پیرایہ مین بیان کیا ہو، ایک یورپین اہل قلم نے مغربی موسیقی پر مسلمانون کے اثرات بتائے ہین، قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک فرانسیسی مصنف کی ایک کتاب سے انگریزی زبان کے کچھ اقتباسات پیش کئے ہین، جس سے چینی مسلمانون کے متعلق بعض تفصیلات معلوم ہوتی ہین، جناب مودودالرحمن صاحب بیرسٹرایٹ لانے بنگال کے اردو کے ہندو اور مسلمان شعرا پر ایک اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے دعوی کیا ہو کہ بنگال اردو کی خدمت میں کسی دوسرے صوبہ سے پیچھے نہین رہا، اے، اے فیضی صاحب نے اپنے مقالہ "ہندوستانی زبان کا لسانی جائزہ" مین یہ رائے ظاہر کی ہو کہ ہندوستان کی عام بول چال کے لئے ایک ایسی آسان ہندوستانی زبان ہونی چاہئے جس کے ایک ہزار بنیادی الفاظ ہون، ڈاکٹر محمود حسین نے اپنے مضمون مین ہندوستان کی وہابی تحریک کی اجمالی تاریخ بیان کی ہو، ان خاص مضامین کے علاوہ حیدر آباد، بھوپال، رامپور، بھاولپور، اور پالن پور کی صنعتی وتجارتی ترقیون پر پُر از معلومات مقالات ہین، مجموعی حیثیت سے اس کو صحیح معنون مین عید کا قابل قدر علمی تحفہ کہا جاسکتا ہو،

رزم نامہ مصور اڈیشن (انگریزی) مولفہ جناب ام عبداللہ چغتائی صاحب تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر ضخامت ۴۰ صفحے، قیمت ندارد، ملنے کا پتہ دکن کالج ریسرچ انسٹیٹوٹ، پونا،

جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی (دکن کالج، پونا) کا اسم گرامی ہندوستان کی علمی دنیا مین کافی روشناس ہو ہندوستان کے اسلامی عہد کا تعمیری آرٹ اور مصوری موصوف کا خاص موضوع ہو، جس پر انگریزی مین برابر ان کے مضامین نکلتے رہتے ہین، ان کا ایک مقالہ مندرجۂ بالا عنوان سے دکن کالج ریسرچ انسٹیٹوٹ کے جرنل مین شائع ہوا تھا، جو کتاب کی صورت مین زیر نظر ہو اکبر کے حکم سے مہابھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ کے نام سے کیا گیا تھا، اور اس کے کئی مصور نسخے بھی اکبر اور اس کے درباریون کی خواہش سے تیار کئے گئے تھے، فاضل مولف نے اس مقالہ مین ان نسخون کی مصوری پر ناقدانہ بحث کی ہو، جو تیموری عہد کی مصوری سے ذوق رکھنے والوں کے لئے مفید ودلچسپ ہے، کتاب مین رزم نامہ کی تصویرون کی مختلف پلیٹین بھی دی ہین، مگر کسی وجہ سے تمام پلیٹین شامل نہین ہوسکی ہین اس لئے فاضل مولف نے پلیٹوں کی روشنی مین جو تنقیدین کی ہین، ان کو سمجھنے مین جابجا دقت محسوس ہوتی ہے۔ "ص ع"

جلد ۵۵ ماہ صفر ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۵ء عدد ۲

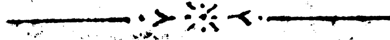
مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۵ - ۲۶
شیخ اکبر محی الدین بن عربی کا نظریۂ علم،	مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ	۲۷ - ۳۴
واگھ بھٹ یا شفائے محمودی،	مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد	۳۵ - ۴۲
ابن خلکان کے فارسی ترجمے،	جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی	۴۳ - ۴۵
غزل	از جناب روش صدیقی	۴۶
	از جناب یحیٰی اعظمی	"
مطبوعات جدیدہ	" م "	۴۷ - ۴۸

شذرات

ہندوستان کے مسلمانون مین اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور اسلامیات سے متعلق تحقیقات کا ذوق اب خاصہ ترقی
ر گیا ہے، اور بہت سے اصحاب علم اور متعدد ادارے اس کام کو انجام دے رہے ہین، لیکن کام کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے
بھی اس کی رفتار نا کافی ہے، خصوصاً مسلمانون کے علمی و تعلیمی مرکزون مین جہان اصحاب علم کی جماعتین موجود ہین تحقیقاتی ادارون
ا بڑی ضرورت ہے، اس کی توقع سب سے زیادہ علی گڈہ سے ہو سکتی تھی، لیکن اس میدان مین اس کا قدم سب سے پیچھے تھا، مگر اب وہان
، فضا بھی بدلنے لگی ہے، اور ادھر چند برسون کے اندر سنجیدہ علمی کامون کی طرف بھی کافی توجہ ہو گئی ہے جس کا ایک مفید نتیجہ انڈین ہسٹاریکل
سٹی ٹیوٹ ہے، اس نے تھوڑی مدت مین متعدد مفید علمی کتابین شائع کین، مجلس مصنفین کے نام سے اردو کی بھی ایک علمی مجلس قائم
ئی ہے جس کا رسالہ مصنف کئی سال سے علمی و ادبی خدمت انجام دے رہا ہے، مجلس مذکور مین وقتاً فوقتاً مفید مقالات بھی پڑھے
تے ہین، جو رسالہ مصنف کے علاوہ علحدہ کتابی صورت مین بھی شائع ہوتے رہتے ہین،

تازہ خوشخبری یہ ہے کہ کمال یار جنگ تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے مطابق آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر نگرانی ایک آل انڈیا اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی اسکیم منظور ہوئی ہے جو ابتدائی تعمیری مراحل سے گذر رہی ہے، یہ انسٹی ٹیوٹ اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور اسلامیات سے متعلق تحقیقات کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، کانفرنس کو ایک ایسے علم دوست بزرگ نواب ... کی سرپرستی حاصل ہے، اسلامی علوم و فنون کے ساتھ جن کی شیفتگی معلوم و مشہور رہے، اس لئے امید ہے کہ یہ مجوزہ اسکیم جلد عملی شکل اختیار کرے گی، ہم علمی برادری مین اس قیمتی اضافہ کا دلی مسرت سے خیرمقدم کرتے ہین،



انسٹی ٹیوٹ مذکور کے مقاصد مین علمی کتابون کی اشاعت کے لئے اس کے ذاتی پریس کا قیام بھی ہے، یہ سب سے مقدم اور ضروری چیز تھی، اب علمی کام کرنے والون کی اتنی کمی نہین جتنی اس کی طباعت و اشاعت کی دشواریان ہین، عموماً مصنفین کو تصنیف کی محنت و جانکاہی کے ساتھ اس کے طبع و اشاعت کی زحمتون کا بار بھی اٹھانا پڑتا ہے جس کے متحمل کم اشخاص ہو سکتے ہین، گو اب بعض ناشرین کتب ایسے پیدا ہوگئے ہین جنھون نے کسی حد تک مصنفین کو اس زحمت سے بچا لیا ہے، لیکن اس سے دشواری کا پورا حل نہین ہوا ہے، اور ایک ایسے پریس کی ضرورت باقی تھی جس کا مقصد صرف علم و فن کی خدمت و اشاعت ہو، امید ہے، کہ اس انسٹی ٹیوٹ سے یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی،



یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ بنگال کے مسلمانون مین اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے وہان انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہے، اردو سے متعلق تقریبین اور یادگارین بھی منائی جاتی ہین، بنگالی زبان مین اردو کی بعض مفید کتابون کے تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے لیکن اوّلاً یہ ذوق شوق زیادہ تر کلکتہ کے اندر محدود ہے، دوسرے صرف اتنی دلچسپی سے اردو زبان سے واقفیت کا مسئلہ جو اصل مقصود ہے حل نہین ہوتا، ضرورت ہے کہ اس کے وسائل اختیار کئے جائین اور ان کو تعلیم یافتہ طبقون مین پھیلایا جائے



بنگال کے مسلمانون کے لئے مختلف حیثیتون سے اردو سے واقفیت ضروری ہے، مذہب کے بعد اردو ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو مختلف صوبون کے مسلمانون کو باہم مربوط اور ایک دوسرے سے قریب کر سکتا ہے، اس سے بیگانگی کا نتیجہ یہ ہے کہ بنگال مین مسلمانون کی بڑی آبادی کے باوجود دوسرے صوبون کے مسلمانون سے ان کا رابطہ بہت کم ہے، ان کے مقابلہ مین ان صوبون کے مسلمان جو اقلیت مین ہین، اور جن کی صوبائی زبانین بھی ہین محض اردو سے واقفیت کے بدولت ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہین، ہندوستان کی تمام زبانون مین اسلامی علوم و مذہبیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو ہی مین ہے جس سے بنگالی مسلمان بہت کم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس لئے قومی اور مذہبی دونون حیثیتون سے ان کے لئے اردو کی جانب توجہ کی ضرورت ہے،



ابھی حال مین بنگلہ کتابون کی ایک فہرست پر نظر پڑی، اس مین پارۂ عم کا منظوم ترجمہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کلام مجید کے کسی جزو کا بھی منظوم ترجمہ احتیاط کے سخت خلاف ہے، کلام مجید کا ایجاز یہ ہے، کہ اس کے نثر کے ترجمہ مین بہت سی آیات کا پورا اور صحیح مفہوم توضیحی و تشریحی الفاظ بڑھائے بغیر ادا نہین ہوتا، اور نظم کی پابندیون کی وجہ سے منظوم ترجمہ مین تو اصل الفاظ مین کمی و زیادتی اور حذف و اضافہ ناگزیر ہے، جس سے تحریف کا دروازہ کھلتا ہے اس لئے خواہ نیت کچھ بھی ہو کلام مجید کے کسی جزو کا منظوم ترجمہ نازیبا ہے،

مقالات

شیخ اکبر محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ

کا

نظریۂ علم (Theory of Knowledge)

از مولینا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات، جامعۂ عثمانیہ

مشہور اسلامی عارف حضرت شیخ محی الدین بن عربیؒ جو عموماً مسلمانوں میں شیخ اکبر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، خاکسار نے مجلس دائرۃ المعارف کی ایک علمی بزم میں جو غالباً ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد ہی میں منعقد ہوئی تھی، شیخ ہی کے متعلق ایک مقالہ عربی زبان میں سنایا تھا، اس مقالہ میں حضرت شیخ کے علمی نقاط نظر پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا تھا، جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے، منجملہ اور باتوں کے اُن کے متعلق میں نے یہ بھی لکھا تھا:-

"منجملہ ان امور کے جن کی طرف شیخ نے خاص توجہ مبذول کی ہے، جہاں تک میرا خیال ہے، وہ انسانی فکر و نظر کی حد پرواز کا مسئلہ ہے"

میں نے اسی سلسلہ میں اس پر بھی تنبیہ کی تھی، کہ:-

"جس چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اور آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ یورپ والے اور جو، ان یورپ والوں کے طفیلی یا ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں، ان سبھوں نے اس مسئلہ کی ایجاد و تنقیح کا سہرا جرمنی کے حکیم کانٹ کے سر باندھا ہے، اپنی اور اپنی قوم کے لئے اس چیز کو یہ مایۂ فخر و فضل بنائے ہوئے ہیں"

(مقالۃ الشیخ الاکبر و طریقہ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

پھر عرض کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں شیخ اکبر کے نظریات اور افکار پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ حکیم کانٹ انسانی ... سے وہ کم اہمیت نہیں رکھتے،

مجھ سے خواہش کی گئی کہ آج کی مجلس مستشرقین کے شعبۂ اسلامیات[۱] میں شیخ اکبر کے اسی نظریہ کے متعلق بعض چیزیں ... کے سامنے پیش کروں، امتثالاً للامر اپنی محدود فہم کے مشورہ سے اس مجلس میں شیخ کے کلام سے جن اجزاء کا انتخاب میں نے کیا ہے آپ کے سامنے ہے، علماء قدیم کے حلقوں میں اگرچہ شیخ اکبر کی ذات والاصفات کسی تعریف سے یقیناً مستغنی ہے، لیکن ظاہر ہے ... کی اس مجلس میں قدیم عناصر کے ساتھ جدید اصطلاحات بھی ملے جلے ہیں، ہو سکتا ہے، کہ ان میں بعض حضرات کے لئے ... کا نام نیا ہو، اس لئے کام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے نام کا تعارف کرا لیا جائے اور اب تو جدید کے ساتھ علماً ...

---

[۱] گذشتہ سال سے پیوستہ سال انڈین اورنٹیل کانفرنس کا سالانہ اجلاس حیدرآباد ہی میں جامعہ عثمانیہ کی زیر نگرانی منعقد ہوا تھا، خاکسار نے بھی اس ... نفرنس میں ایک مختصر مقالہ پڑھا تھا، اسی کا مسودہ پڑا ہوا تھا، آج خیال آیا کہ معارف میں بھیجدوں شاید کسی کے لئے سینکرا و ربیعہ ذکری کا کلام ...

کا قدیم طبقہ بھی جہان تک مین جانتا ہون شیخ اور ان کے کارنامون سے تقریباً نا مانوس ہو چکا ہے، اس تعارف کی ضرورت اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے،

شیخ اکبر کا اجمالی تعارف | مرسیہ جو اندلس کے مشرقی علاقہ کا ایک مشہور شہر ہے، حضرت شیخ کی ولادت اس شہر مین ۵۶۰ھ مین ہوئی اندلس کا یہ وہ زمانہ ہے جب اسلامی دولت اس سرزمین مین اپنے بچے کھچے وقار و اقتدار کو بھی ختم کر رہی تھی، ملک مین عام طور سے طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، تھوڑے تھوڑے دن کے بعد مختلف علاقون مین مختلف خاندانون کی حکومتیں قائم ہو ہو کر ختم ہوتی رہتی تھین، بدامنی فتنہ و فساد کا ہر طرف بازار گرم تھا، چاہئے تو یہی کہ بے اطمینانی کے ایسے دور مین علم و کمال کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے، لیکن قدرت کا شاید یہ بھی قانون ہے کہ سحر کا چراغ دم توڑنے کے لئے جب آخری دفعہ بھڑکتا ہے، تو اس کی اسی روشنی مین بسا اوقات بعض عجیب و غریب ہستیان نمایان ہوئی ہین،

ہندوستان مین شاہ ولی اللہ، مغرب مین ابن خلدون اس نظریہ کی بہترین مثالین ہین،

شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مین موت کے اسی افاقہ کا ایک عجیب و غریب منظر سمجھتا ہون، یہ واقعہ ہے کہ جس جامعیت کو ہم شیخ اکبر مین پاتے ہین، اسلامی علماء و صوفیا کی طویل الذیل تاریخ مین اس کی نظیر صرف مشکل ہی نہین، بلکہ غالباً ناممکن ہے اُس زمانہ کے مروجہ علوم خواہ عقلی ہون یا نقلی، ادبی ہون یا دینی، شیخ کی کتابین بتا سکتی ہین، کہ مشکل ہی سے کوئی ایسا علم یا فن اس زمانہ مین پایا جاتا ہوگا جس سے صرف معمولی لگاؤ نہین، بلکہ تحقیقی رشتہ قائم نہ تھا،

شیخ کے تصنیفات کی تعداد | یون تو ان کی کتابین حدِ شمار سے باہر ہین، لیکن حروب صلیبیہ کے بطل اعظم سلطان صلاح الدین انار اللہ برہانہ کے صاحبزادے جن کا ذکر شیخ نے خود اپنی کتاب فتوحات مکیہ کی جلد ۴ ص ۰۰۰، مین بایں الفاظ کیا ہے،

"بعض بادشاہون کے پاس میری بات سنی جاتی تھی، اور یہ حلب کے بادشاہ ملک ظاہر غازی ہین، خدا کی ان پر رحمت ہو، الناصر لدین اللہ سلطان صلاح الدین بن ایوب کے یہ صاحبزادے ہین،" (ص ۰۰۰)

شیخ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ مین نے سلطان سے ایک سو اٹھارہ سفارشین مختلف معاملات مین کین، فقضاہا کلھا یعنی ہر بات منظور کی، آگے ایک طویل قصہ ہے، جس کے ذکر کی حاجت نہین، مجھے کہنا یہ ہے کہ اسی سلطان غازی کو شیخ نے ایک علمی سند دی تھی، جسے مشہور لغوی عالم مجد الدین فیروزآبادی صاحب قاموس نے خود دیکھا تھا، صاحب قاموس کا بیان ہے کہ اپنی تصنیفات کی اجازت کے سلسلہ مین کتابون کے نام درج کرتے ہوئے

عدّ نیفا و اربعمائۃ مصنف (مقدمہ فتوحات) — شیخ نے چار سو سے اوپر کتابین شمار کی ہین،

ان مین بعض ایسی کتابین بھی ہین مثلاً فتوحاتِ مکیہ جو مصر و قسطنطنیہ مین متعدد بار طبع ہو چکی ہے چار جلدون مین یہ کتاب ہے ابتدا کی دو جلدین تقریباً ہزار ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہین، اور آخر کی دو جلدین سات سات سو صفحات پر مشتمل ہین، گویا چار سو سے اوپر کتابون مین سے صرف یہی ایک کتاب تین ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اسی سے ان کی دوسری کتابون کا اندازہ کیجئے،

صاحب قاموس نے ان کی ایک تفسیر کا بھی ذکر ان الفاظ مین کیا ہے،

"جن مین ان کی کبیر تفسیر بھی ہے، جو سورہ کہف کی آیت وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا تک پہنچ کر رہ گئی کہ شیخ کی وفات ہو گئی، اس وجہ سے پوری نہ کر سکے، یہ ایک ایسی تفسیر ہے جس کا ہر حصہ اور اس کی ہر جلد ایک ایسے دریا کی شکل رکھتی ہے جس کا کنارہ نہ ہو،" (صفہ ۰۰)

اور غالبًا یہی تفسیر شیخ کی ہو جس کا ذکر البطل الغازی المجاہد صاحب السیف والقلم، الامیر عبد القادر الجزائری نے اپنی کتاب "المواقف" میں بایں الفاظ کیا ہے :-

"معلوم ہو کہ ایک تفسیر شیخ محی الدین بن عربی کی پائی گئی ہے، جس کا نام کتاب الجمع والتفصیل فی اسرار التنزیل ہے"

اور مقدار اس کتاب کی (۶۰) چھ سو ۶۰ جلدیں ہیں" (مواقف ص ۲۲۲)

الجزائری نے یہ بھی لکھا ہو کہ مصر میں سورۂ کہف تک اس تفسیر کے اجزاء ملے ہیں، "واللہ اعلم بالصواب" جس شخص کے لکھنے کا یہ حال ہو، کہ فتوحاتِ مکیہ جب لکھ رہے تھے تو

"جہاں کہیں ہوتے (غالبًا سفر وحضر ہر جگہ) روزانہ میں کراسہ (جز) لکھا لیا کرتے تھے"

اور اس کا اعتراف تو انھوں نے خود کیا ہے، کہ

"اپنی تصنیفوں میں سے کسی تصنیف کا میں نے مسودہ نہیں لکھا یعنی بس جو مسودہ ہوتا تھا، وہی مبیضہ بھی تھا" (فتوحات)

جس کے یہی معنی ہوے کہ ان کی کتابیں عمومًا برداشتہ قلم لکھی گئی ہیں، اور اس کا پتہ خود ان کی کتابوں سے بھی کچھ چلتا ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے،

بہرحال ان کی اسی ایک کتاب فتوحاتِ مکیہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اپنے زمانہ کے کسی علم میں ان کا پایہ معمولی نہ تھا، اگرچہ ظاہر ہے کہ ان پر اصلی مذاق جس علم کا غالب تھا، وہ تصوف ہی کا فن ہے، اور دنیا میں عام طور پر ان کی شہرت ایک صوفی عالم ہی کی حیثیت سے ہے بھی، شیخ کے ان سارے علمی اور قلمی مجاہدات کے پیچھے کیا چیز عمل کر رہی تھی، میں نے اس کا کچھ ذکر اپنے اس عربی مقالہ میں بھی کیا ہے، ان کے دل میں جس چیز کی آگ لگی ہوئی تھی، اور اسی سوزش کو ان عجیب وغریب کتابوں کا میں سبب قرار دیتا ہوں، کچھ اس کا اندازہ ان کے منظوم خط سے بھی ہوتا ہے، جو روم (ایشیاے کوچک) کے سلطان عزالدین کیکاؤس کے ایک مکتوب کے جواب میں اونھوں نے لکھا ہے، شیخ نے اپنے اس خط کو فتوحات ج ۴ کے ص ۹۲، مطبوعہ بولاق مصر میں درج فرمایا ہے خط منظوم ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

کتبت کتابی والدموع تسیل	ومالی الی ما ارتضیه سبیل
میں اپنا خط لکھ رہا ہوں اور آنسو بہ رہے ہیں	اور میرے بس میں نہیں ہو کہ ان کو راضی کروں
ارید اری دین النبی محمدًا	یقادو دین المبطلین یزول

چاہتا ہوں میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو دیکھوں کہ وہ بلند کیا جائے، اور جھوٹوں کا دین مٹ جائے

فلم ار الا الزور یعلو واهله	یعزون والدین القویم ذلیل

مگر بجز بناوٹی سخن سازیوں کے اور اس کے کاروبار کرنے والوں کے سوا کسی کو معزز ہوتے ہوے نہیں پا رہا ہوں

فیا عز دین اللہ سمعًا لناصح	شفیقًا نصاح الملوک قلیل

اے اللہ کی دین کی عزت ایک بہی خواہ کی نصیحت سُن، جو تجھ پر مہربان ہو، یاد رکھ کہ بادشاہ کو نصیحت کرنیوالے کم ہیں

وحاذر ربتا ئید الا له بطانة	یشیر بامر ما علیه دلیل

اور بچو اللہ کی مدد سے ایسوں کو رازدار بنانے سے، جو اشارے ایسی باتوں کی طرف کرتا ہو جس کی دلیل نہ ہو"

ان اشعار سے شیخ کے باطنی محرکات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کے مولد یعنی اندلس پر کفر کا تسلط دن بدن

بڑھتا جارہا تھا، اور جیسا کہ ان کا خیال تھا جس کا ذکر مختلف مقامات میں انھوں نے کیا بھی ہے، یعنی ان ساری تباہیوں کی ذمہ داری اسلام کے سلاطین اور علماء کے سر عائد ہوتی ہے، مختلف مضامین لکھتے لکھتے کہیں ان کے قلم سے ان پوشیدہ جذبات کا اظہار ہوجاتا ہی، خود اپنے وطن اندلس کو خیرباد کہہ کے جب وہ مشرقی ممالک کی طرف چلے آئے، اور اس طرح آئے جیسا کہ ان کے سوانح نگار نے لکھا ہے :-

"اپنے وطن مرسیہ سے شیخ ۵۹۸ھ میں اشبیلیہ روانہ ہوئے، اور ۵۹۸ھ تک وہیں رہے، پھر اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئے، حج کے ارادے سے جس کے بعد پھر اندلس واپس نہ ہوئے"

اندلس سے روانہ ہوکر جب جبل الطارق کی آبنائے کے پاس آئے ہیں تو سبتہ نامی شہر میں ان کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی، اس ملاقات میں شیخ کا ان سے جو مکالمہ ہوا ہے، اس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہی :-

"سمندر کے آبنائے کے پاس سبتہ میں بعض صالحین کے یہاں حاضر ہوا، مجھ میں اور حکومت میں بعض ایسی باتیں ہوئی تھیں جن کا نتیجہ قلب کی تنگی تھی، اور قدر و منزلت جس سے گرتی تھی، ان بزرگ کو اس کی خبر ملی تھی، مجھ پر ان کی جب نظر پڑی، تو بولے کہ بھائی ایسا آدمی ذلیل ہوجاتا ہے جس کی اعانت کوئی ظالم نہ کرے، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں ایسا بادشاہ بھی گمراہ ہوجاتا ہے جس کی رہنمائی کوئی عالم نہ کرے، بزرگ نے فرمایا کہ نرمی نرمی (یعنی ذرا نرمی اختیار کرنا چاہئے) میں نے عرض کیا کہ جی ہاں جب تک اصل پونجی پر آنچ نہ آئے، یعنی دین محفوظ ہو، بزرگ نے یہ سن کر فرمایا کہ سچ کہتے ہو، اور خاموش ہوگئے، (ج ۴ ص ۱۰)

جہاں تک میرا خیال ہے شیخ کی ان ہی تلخ نوائیوں اور اندرونی بےچینیوں نے ان کو اندلس چھوڑنے پر مجبور کیا، اور مشرق کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا، کیونکہ یہاں ان کو بعض ایسے سلاطین مل گئے، جو ان کی باتوں پر کان دھرتے تھے، شیخ ہمیشہ ان سلاطین کو اس طرف متوجہ کراتے تھے، کہ علماء سوء کی اصلاح کرو، دین ان ہی کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے، فتوحات ہی میں ایک جگہ انھوں نے علماء سوء کے متعلق ایک واقعہ درج کیا ہے، اس واقعہ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، فتوحات ج ۲ ص ۹۱ میں ارقام فرماتے ہیں :-

"دہی صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر غازی نے ایک دن مجھے خبر دی، یعنی مجھ سے اور ان سے بعض معاملات کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، اس وقت انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے ملک اور میری حکومت میں جو قابلِ اعتراض باتیں ہیں، اور جو مظالم ہو رہے ہیں ان کے متعلق آپ مجھے منع فرماتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اس باب میں آپ کا خیال ہے وہی میرا بھی ہے، کہ یقیناً یہ ساری باتیں غلط ہیں لیکن سیدی! خدا کی قسم یہ جتنی بری باتیں ہیں، ان سب کے متعلق فقیہ کا فتویٰ موجود ہے، یعنی ان کی صحت وجواز کا فقیہ (مولوی) نے فتویٰ دے رکھا ہے، ان کے دستخط میرے پاس موجود ہیں، تو خدا کی ان ہی پر لعنت ہو،

شیخ نے الملک الظاہر کے اس بیان کو نقل کرکے پھر اس نیک دل بادشاہ کا یہ بیان نقل کیا ہے :-

"خود ایک مولوی جو فلاں صاحب ہیں، انھوں نے مجھے یہ فتویٰ دیا ہے، سلطان نے اس مولوی کی شخصیت بھی متعین کی، یہ اس شہر کے بڑے نامی گرامی فاضل ہیں، دین اور مذہب میں سختی ان کا بھی خاص امتیاز ہے، ان مولوی صاحب نے (بادشاہ نے کہا کہ) مجھے یہ بتایا ہے کہ مجھ پر خاص رمضان کا روزہ فرض نہیں ہے، بلکہ سال کے کسی

یک مہینہ میں جس میں بھی چاہوں، روزہ رکھ سکتا ہوں (غالباً مولوی کی تاویل یہ ہو کہ بادشاہوں کو خصوصاً اس زمانہ میں جنگی مہموں میں مشغول رہنا پڑتا تھا، اس وجہ سے آج یہاں کل وہاں مارے مارے پھرتے تھے، یہ سفر کی حالت ہے، اور مسافر روزوں کو رمضان سے موخر کر سکتا ہے" (واللہ اعلم)

شیخ فرماتے ہیں کہ اس فقیہ کے اس فتویٰ کا ذکر کر کے الملک الظاہر نے کہا :-

"میں نے دل ہی دل میں اس مولوی پر لعنت کی، اور اس پر اس کو ظاہر نہ کیا، مولوی کا بادشاہ نے نام بھی بتایا، خدا ان لوگوں پر رحم کرے"

یہی بے دینیاں تھیں، جو عوام ہی نہیں بلکہ خواص امت میں انھیں محسوس ہو رہی تھیں، ملک کیکاؤس کے نام ایک طویل خط بھی شیخ نے لکھا تھا جس کو بجنسہ انھوں نے فتوحات میں نقل کر دیا ہے، شروع میں اس کے لکھتے ہیں،

"۶۰۰ھ میں یونان کے شمالی حصہ کا بادشاہ جس کا نام الغالب لامر اللہ کیکاؤس ہے، اس نے مجھے خط لکھا، (یونان کے شمالی حصہ سے ایشیائے کوچک کا حصہ مراد ہے، جہاں آج ترکوں کا پایہ تخت ہے اسی کو روم بھی کہتے تھے، مولانا روم اسی علاقہ کی طرف منسوب ہیں")

خط بہت طویل ہے، فتوحات کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں آیا ہے اس خط کے آخر میں بھی چند اشعار ہیں جن میں سے بعض شعر یہ ہیں، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ملک کیکاؤس نے اپنا سلطانی نام عزالدین رکھا تھا،

اذا انت اعززت الهدى وتبعته فانت لهذا الدين عزٌ کما تدعى

اگر دینی ہدایت کو تم سے عزت نصیب ہو، اور اسکی خود بھی تم پیروی کرو تو بیشک تم دین کی عزت ہو جیسا کہ تم پکارے جاتے ہو

وان انت لم تحفل به واهنته فانت تذل الدين تخفضه وضعا

اور اگر تم نے دین کو نہیں سمیٹا اور اسے ذلیل کیا تو پھر دین کے تم خوار کرنے والے، اور اسے تم نے پست کر دیا

فلا تاخذ الالقاب زوراً فانه لتسئل عنها يوم يجمعكم جمعا

پس جھوٹ موٹ کے القاب نہ اختیار کیا کرو کیونکہ جس دن تم لوگ (قیامت میں) جمع کئے جاؤ گے، اس کے متعلق پوچھے جاؤ گے

ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ خطاب تم پر اسی وقت پھبے گا، جب دین کے اعزاز کا کام کرو گے اور

وان قال دين الله كنت بملكه ذليلا واهلى فى ميادينه صرعى

اللہ سے دین نے اگر کہا کہ میں اس شخص کی حکومت میں ذلیل تھا، اور دیندار لوگ اس ملک میں پچھڑے پڑے تھے، تو قیامت کے دن تمھارا کیا جواب ہوگا،

اور آخر میں اسی بادشاہ کے کسی نائب السلطنت کی طرف ایما فرماتے ہوئے تنبہ کرتے ہیں :-

لكم نائب فى الامر اصبح ملحداً واضحى لاهل الدين يقطعهم قطعا

تمھاری حکومت میں تمھارا جو نائب ہے وہ بے دین ہو گیا ہے، ارباب دین کو اس نے "ٹکڑے ٹکڑے" کر کے رکھ دیا ہے

پھر اسی بادشاہ کا جو دوسرا خطاب الغالب لامر اللہ ہے، اس سے نفع اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں :-

فمالك لن تغلبه واسمك غالباً ومالك لم تعزله اذا اثرا لنقعا

آخر تم اس پر غالب کیوں نہیں ہوتے حالانکہ نام تو تمھارا غالب ہے اس کو معزول کیوں نہیں کرتے وہ گرد تو اڑا چکا ہے

الغرض یہ اور اسی قسم کی مختلف شہادتوں سے جن کا ذکر اس مختصر مقالہ مین موجب طوالت ہوگا، مین اس نتیجہ پر پہنچا ہون کہ شیخ کا عہد جس مین اسلام کے مغربی ممالک پر یورپ سے اور مشرقی ممالک پر تاتار سے کفر کے بادل امنڈا منڈ کر آگ برسا رہے تھے اور اسلام کی جو وقعت قلوب مین تھی، دن بدن اس کی دیوار کمزور ہوتی چلی جارہی تھی نہ صرف عوام بلکہ مسلمانون کے خواص جن مین علماء وسلاطین، وامراء سب ہی شریک تھے، اپنی اپنی ایمانی قوتون کو کھوتے چلے جارہے تھے، قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کا تعلق کمزور ہوتا چلا جاتا تھا، اور اسی کے یہ نتائج تھے، جن کا ذکر شیخ نے اپنے مذکورہ بالا بیانات مین فرمایا ہے،

حضرت شیخ نے، جہان تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے، یہ معلوم ہوتا ہے، کہ فکر وغور کے بعد ان امراض کا سراغ لگالیا تھا جو مسلمانون کو دین سے دور کرنے کے اسباب تھے، اور بجائے جدل یا مولویوں کے عام مناظرانہ عقیم طریقون کے انھون نے ان امراض کے علاج کے متعلق کلی تدبیرین سوچ کر اختیار فرمائی تھین، جیسا کہ مین نے عرض کیا، ان کی عام کتابون کی تعداد تو چار سو سے بھی متجاوز اور تفسیر کی چھ سو ساٹھ جلدون کو اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ تعداد دونی سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے مگر تفسیر پر میری نظر نہین پڑی، ان کے سوا سچی بات تو یہ ہے کہ بجز ایک دو کے عموماً ان کی کتابون کے مضامین ایک ہی قسم کے ہین، اجمالاً و تفصیلاً مختلف پیرایون مین وہ انہی مجوزہ علاجی تدبیرون کو دہرا دہرا کر بیان فرماتے ہین،

منجملہ ان کلی امور کے جن پر شیخ نے اپنی کتابون مین سیر حاصل بحثین فرمائی ہین، علم کا مسئلہ بھی ہے وہی جس کی تعبیر موجودہ اصطلاح مین تھیوری آف نالج (Theory of Knowledge) کے الفاظ سے کرتے ہین، مطلب یہ ہے کہ دین سے بغاوت کا وہ حصّہ جو علم کے جھوٹے ادعا پر مبنی ہے، شیخ نے چاہا ہے کہ لوگون کو یہ بتایا جائے کہ خود اس "علم" اور "دانش" کی حقیقت کیا ہے، ہم یہ جانتے ہین، وہ جانتے ہین، اور اپنے اسی جاننے کی بنیاد پر نہ سوچنے والون کے قلوب مین دین کا جو احتقار پیدا ہوتا ہے، شیخ نے سمجھانا چاہا ہے کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا، کہ خود یہ جاننا کیا چیز ہے، اور تمھارے اس "جاننے" کی رسائی کا آخری نقطہ کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ آدمی پر جب اپنی "دانش" کی اصلی حقیقت کھل جاتی ہے، تو وہ سارا نشہ کر کرا اور پھٹ کر ہوا ہو جاتا ہے، جس کے شکار عموماً وہی لوگ ہو جاتے ہین، جو تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد ہر چیز کی تنقید اپنے علم کی روشنی مین کرنا چاہتے ہین، لیکن علم و جہل کے سلسلہ مین آدمی کا جو صحیح مقام ہے، جب وہ اس پر واضح ہو جاتا ہے، تب سمجھ مین آتا ہے کہ

ع معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اس مسئلہ کو شیخ نے فتوحاتِ مکیہ، فصوص الحکم وغیرہ میں مختلف اسالیب مین ادا کیا ہے، سب کو اگر جمع کیا جائے اور انشاء اللہ جب وقت آئے گا تو وہ جمع کئے جائین گے، تو مین شاید مبالغہ نہین کر رہا ہون، کہ محض اس ایک مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات ونظریات ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات کی گنجایش سے کم کے متقاضی نہ ہون گے خصوصاً شیخ کا جو ایک خاص طریقہ ہے، یعنی وہ اپنے مسودہ پر نظر ثانی نہین کرتے، اور قلم اٹھا کر لکھتے چلے جاتے ہین، اس لئے کہین کہین اس کا شبہ بھی ہوتا ہے، کہ ان کے کلام مین تضاد ہے، کامل بحث کرنے والے کو ضرورت ہوگی، کہ سلسلہ کے ساتھ ان کے کلام کے مختلف اجزاء کو ایک خاص ترتیب کی شکل مین سمیٹے، جہان تک میرا تجربہ ہے اس تدبیر سے ان کے کلام مین بظاہر تناقض جو محسوس ہوتا ہے، عموماً وہ اٹھ جاتا ہے، ماسوا اس کے ایک بات یہ بھی ہے کہ شیخ بھی بہرحال آدمی ہین، اور آدمی کے خیالات مین کچھ رد و بدل اتار چڑھاؤ تو ہوتا ہی رہتا ہے، ہوسکتا ہے، کہ اپنی کسی کتاب مین انھون نے ایک خیال ظاہر کیا ہو، لیکن بعد کو ان کا خیال بدل گیا ہو، فتوحات مین اپنے خیال کی اس تبدیلی کا ایک دلچسپ قصہ خود ہی انھون نے نقل فرمایا ہے، ان کے

اس خیالی انقلاب کی نوعیت پر چونکہ روشنی پڑتی ہے، اس لئے تذکرہ کرتا ہون فرماتے ہین :-

"مین ان لوگون مین تھا، جو عورتون کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور پھر اسی اصول پر اٹھارہ سال تک قائم رہا، اس طریقہ (یعنی طریقۂ صوفیہ) مین جب ابتداءً داخل ہوا تو میرا بھی یہی خیال تھا"

(فتوحات ج ۴ ص ۱۰۴ مطبوعہ بولاق مصر)

گویا اٹھارہ سال تک ایک خاص خیال کا ان پر تسلط رہا، اس کے بعد ایک طویل بحث کے بعد اپنے اس خیال مین تبدیلی کے اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہین،

"مگر اب بحمد اللہ عورتون کی یہ نفرت مجھ سے نکل گئی ہے، اور خدا نے عورتون کو میرے لئے محبوب بنا دیا ہے، اور اب مین ان لوگون مین ہون، جو عورتون پر سب سے زیادہ مہربان ہین، اور ان کے حقوق کی سب سے زیادہ نگہداشت کرتے ہین، مین اب اس معاملہ مین بصیرت پر ہون، یہ بات خدا کی طرف سے ہے، یعنی اُسی نے عورتون کو میرے لئے محبوب بنا دیا ہے، یہ بات کوئی طبیعت کا اقتضا نہین ہے" (ج ۴ صفحہ ۱۰۴)

جہان تک میرا خیال ہے شیخ جب تک یورپ (اندلس) مین رہے اور اندلس کے صوفیہ پر قرب مکانی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ عیسائی رہبان اور تارک الدنیا فقراء کا اثر پڑتا ہی ہوگا، اور ظاہر ہے کہ عیسائی مذہب مین عورت ہی پر ان سارے مصائب کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، جن مین آدم اور اولاد آدم اس خاکدان ارضی مین مبتلا ہے، ارباب کلیسا کا فتویٰ ہی یہ تھا، کہ عورت صرف گندگی اور نجاست ہے، وہ شیطان ہے، اس مین روح نہین ہے، بلکہ باوجود ان حالات کے جن کا مظاہرہ یورپ اس وقت نسائیت کے مسئلہ مین کر رہا ہے، پھر بھی مذہبی طور پر محض یورپ کے عام باشندون ہی پر نہین بلکہ جن بیچارون کے نفس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی اثرات کو اپنے اندر جذب کیا، یا چرا لیا ہے، دنیا مین عورتون کے ساتھ وہ خواہ کسی قسم کا بھی تعلق رکھتے ہون، لیکن دیکھا یہی جا رہا ہے، کہ آنے والی آخرت کی زندگی مین عورتون کا تخیل ان کے لئے ناقابل برداشت بنا ہوا ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ قرآنی جنت کے سلسلے مین دوسری چیزون کے ساتھ جون ہی عورتون کا ذکر آتا ہے، ان کی پیشانیون پر شکن پڑ جاتی ہے، بجز اس نفسیاتی سبب کے کہ عیسائی ذہنیت جنت مین عورت کے تخیل کو برداشت نہین کر سکتی، گویا عورت کے ذکر کے ساتھ ہی خدا کی پاک بہشت ان کی نگاہون مین حیوانی جنت کی قالب مین ڈھل جاتی ہے، سوچنے والون نے کبھی اس پر بھی غور کیا، کہ اس کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے، کیا جنت اور دوزخ کے مسائل بھی سائنس اور کیمسٹری کے حدود مین آتے ہین، یا آسکتے ہین،

خیر یہ تو ایک ذیلی مسئلہ ہے مین یہ کہہ رہا تھا کہ شیخ کے خیالات مین تبدیلیان بھی ہوئی ہین، اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے، کہ اٹھارہ سال تک ایک خیال پر شیخ جمے رہے، لیکن مشرق کی زندگی نے ان پر ثابت کیا، کہ جنت تو عورتون ہی کے قدمون کے نیچے ہے، پھر ان کی راے اس باب مین بدل گئی، شیخ نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب کے مختلف مقامات پر بڑی دلچسپ بحثین فرمائی ہین، جن کے ذکر کا یہ موقع نہین ہے،

اسی کے ساتھ شیخ کے متعلق ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہون، ان کا ایک خاص طرز یہ ہے کہ اپنے مختلف مضامین کا مخاطب انھون نے مختلف طبقے کے لوگون کو قرار دیا ہے، ان کا نظریہ بھی یہ ہے جیسا کہ حدیثون مین بھی آیا ہے کہ کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم ایک یہ وجہ بھی ہے جو ان کے کلام سے بعض دفعہ لوگون مین الجھن پیدا ہونے لگتی ہے، سو

ہوتا ہے کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہین، شیخ نے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فتوحات ہی مین لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کے مفتی جن کا نام انھون نے ابوعبداللہ محمد بن ابی الصیف الیمنی نزیل مکہ بتایا ہے، ان مفتی صاحب کے سامنے ان کی کتاب جس کا نام "مشاہد قدسیہ" ہے، اس کی ایک ایسی عبارت پیش کی گئی، جو اپنے عنوان اور تعبیر مین کچھ وحشت رکھتی تھی، شیخ کو مفتی نے بلاکر دریافت کیا آپ نے اس کی ایک لطیف توجیہ کی لکھتے ہین، کہ سننے کے ساتھ،

"وہ بڑا خوش اور مسرور ہوا، خدا اس پر رحم کرے"

مفتی کو انھون نے گو مطمئن فرما دیا، لیکن اس کے بعد لکھتے ہین، کہ اس عبارت کا ایک اور دقیق پہلو بھی تھا،

مین نے اس پہلو کا ذکر اس لئے اس مجلس مین نہین کیا، کہ وہ نہ اس کو برداشت کر سکتا تھا، اور نہ اس کا انکار کر سکتا تھا"

اس لئے اندیشہ تھا کہ جھنجلا کر خواہ مخواہ بگڑ نہ بیٹھے، شیخ نے اس کے بعد ارقام فرمایا ہے، کہ

"اس کے پاس نہ تو قوی ایمان ہی تھا، اور نہ علم اور سلامت نظر تھی، وہ حیران ہو کر رہ جاتا اسی لئے مین نے اس کے سامنے ایسی بات کی جو اسکے عقلی مزاج کے مطابق تھی"

بہر حال اگر ان اجمالی نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے، تو شیخ اکبر کے کلام مین اس قسم کی پیچیدگیان جو محسوس ہوتی ہین وہ انشاء اللہ بآسانی زائل ہو سکتی ہین، اور سچی بات تو یہی ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لئے جیسا کہ شیخ نے خود بھی لکھا ہے، ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم مین ذرا وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگون کے لئے بسا اوقات ان کی باتین نقصان رسان ہو جاتی ہین، لیکن یہ ان کے کلام کا نہین پڑھنے والون کا نقص ہے،

اب ان تمہیدی باتون کے بعد جو باوجود ارادۂ اختصار کے کافی طویل ہوگئین، اصل مسئلہ کا ذکر حتی الوسع اجمال کو پیش نظر رکھکر کرنا چاہتا ہون کہ اجمال سے زیادہ کا یہ موقع بھی نہین ہے، خدا کرے میری کتاب وہ مکمل ہو جائے، جسے شیخ کے متعلق لکھنا چاہتا ہون، کہ تفصیل و بسط کا صحیح مقام وہی کتاب ہو سکتی ہے، واللہ یوفق لما یحب و یرضی، (باقی)

خط و کتابت کے لئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمائشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کی جائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائین گے

سید سلیمان ندوی

واگھ بھٹ یا شفائے محمودی

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی، ریسرچ اسکالر، گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد

ان دنون ایک نئی کتاب ہمارے کتب خانہ (گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد) مین داخل ہوئی ہے، اوس کا نام شفائے محمودی ہو زبان فارسی، خط واضح نستعلیق ½ ۸، انچ طویل، اور پانچ انچ عریض، کل اوراق پانچ سو، کاغذ دبیز غالباً پٹنی ہے؟ کتاب سنسکرت مین تھی، اس کے مصنف کا نام "واگھ بھٹ" ہے، ہندوستان مین واگھ بھٹ متعدد ہوئے ہین لیکن سب سے زیادہ شہرت اسی حکیم (وید) کی ہے، اس کا اصلی وطن سندھ ہے، اس کے باپ کا نام "سینھ گپتا"، اور دادا کا واگھ بھٹ تھا، یہ برہمن خاندان علم وفضل کے باعث مشہور تھا، اور طب مین ید طولی رکھتا تھا، اس کی شہرت کے باعث اس کی طرف بہت واقعات منسوب مین ہندوستان مین طب کی آٹھ شاخین تھین، ہر طبیب ایک شاخ کا ماہر ہوتا تھا، اور صرف اسی کا علاج کرتا تھا، اور اپنے تلامذہ کو اسی کی تعلیم دیتا تھا، واگھ بھٹ نے اس مسئلہ پر غور وخوض کے بعد یہ رائے قائم کی، کہ ان آٹھون کو ایک ہی جگہ جمع کرکے یکجا تعلیم دی جائے، تو ایک بید (طبیب) مجمع اوصاف ہوگا، چنانچہ اس نے اسی مقصد کو مد نظر رکھ کر تعلیم دینی شروع کردی، اور کئی کتابین لکھین، یہ ماہر طبیب کس سنہ مین تھا تاریخ سے اس کا کچھ پتہ نہین چلتا، اس کے خاندانی حالات بھی لوگون کو صرف اسی قدر معلوم ہین جس قدر اوس نے اپنی کتاب مین تحریر کر دئے جینی سیاح ہونگ شیانگ نے ایک مقام پر ذکر کیا ہے، کہ طب کی آٹھ شاخین تھین جس کی الگ الگ تعلیم ہوتی تھی، ابھی ایک آدمی نے ان سب کو جمع کر دیا ہے، اور اب ہندوستانی بید (طبیب) اسی کی تعلیم دیتے ہین، اور اپنے تجربات اسی سے بڑھاتے ہین، اور چونکہ اس سے پہلے اس قسم کی کوئی کتاب جو آٹھون قسمون کا مجموعہ ہو نہین تھی، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ جینی سیاح کا مطلب اسی واگھ بھٹ کی کتاب سے ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سیاح سے کچھ ہی پہلے یہ ماہر طبیب گذرا ہے، اسی لئے عام طور پر یہ مان لیا گیا ہے، کہ وہ چھٹی یا ساتوین صدی عیسوی کا ہے[1]

واگھ بھٹ کی مشہور ترین تصنیف صرف دو ہین (۱) اشٹ انگ سنگرہ (۲) اشٹ انگ ردی، شفائے محمودی اسی آخر الذکر کتاب کا ترجمہ ہے، کتاب کے مترجم کا نام علی محمد بن اسماعیل اساولی اصیلی ہے، چنانچہ دیباچہ مین ہے:-

"می گوید مترجم این طب مقبول ومبین غوامض این کتاب ماحول ومعمول، بندۂ دعاگوے بارگاہ علی محمد بن اسماعیل اساولی اصیلی اصلح اللہ شانہ ....."

شہر احمد آباد کی تعمیر سے پہلے "اساول" متوسط درجہ کا شہر تھا، بیرونی نے لکھا ہے، کہ تجارت کا مرکز ہے، کھنبائت سے پٹن (پایۂ تخت گجرات) کو جو تجارتی قافلہ جاتا ہے، وہ یہان سے ہو کر جاتا ہے، یہ درحقیقت بھیلون کا پایۂ تخت تھا، سلطان احمد شاہ کے ابتدائی عہد ۸۱۳ھ مین یہان آسا بھیل راجہ تھا، جو اپنی ترک تازیون سے لوگون کو پریشان رکھتا، اس لئے احمد شاہ نے اس سے یہ مقام چھین کر اسی سے متصل ایک نیا شہر احمد آباد کے نام سے آباد کیا، ابتدا مین دونون شہر علاحدہ رہے، لیکن

---

[1] ہسٹری آف انڈین میڈیسن مؤلفہ ڈاکٹر ہرنل،

آخر مین اساول احمد آباد کا ایک محلہ ہو کر گم نام ہوگیا، اور آج کل صرف ایک حصہ "آسا بھیل کا ٹیکرہ" کے نام سے مشہور ہے، جو قدیم روایات کی یاد تازہ کرتا ہے، اس مقام کے باشندے اپنے کو آساولی کہتے تھے، مترجم کتاب علی محمد اسی جگہ کے رہنے والے تھے، مترجم موصوف کے نام کا آخری جز "اصیلی" ہے، مراۃ احمدی مین ہے کہ :-

"ضابطہ ارباب التحاویل آنکہ تحویل دار باید کہ بندۂ بادشاہی باشد و مشرف اصیل ...."[۱] الخ

یعنی تحویل داری کا دستور اس طرح تھا کہ تحویل دار شاہی غلام ہو تو محرر اصیل و بالعکس، اس بنا پر جو لوگ سرکاری محکمۂ تحویل میں ہوتے، تو امتیاز کے لئے اپنے کو اصیلی کہتے تھے، غالباً ان کا خاندان اسی نام سے مشہور تھا، اسی لئے اپنے کو اصیلی لکھا ہے، علی محمد صاحب حکیم بھی تھے، چنانچہ دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"کہ این بندۂ دعاگو کہ در محل تلمیذ درین علم حکمت و طب قیام داد" الخ

اس کتاب کے ترجمہ کا کس طرح اتفاق ہوا، اس کے متعلق لکھا ہے کہ بعد فتح جنگ "جگت دوارکا"، مصطفےٰ آباد (جونا گڑھ) مین سلطان محمود مقیم تھا، اس نے حکم دیا کہ واگھبھٹ کے مجربات کا جو اطبائے ہند کے نزدیک معتبر اور مجرب ہین، ہندی (سنسکرت) سے پارسی مین ترجمہ کر ڈالو تاکہ لوگ عام طور سے اس سے مستفید ہون اور غیرون کے محتاج نہ رہین،

بندہ بعد ادائے شرط خادمانہ اس کام مین مصروف ہوگیا، اور اس کتاب کا نام شفائے محمودی رکھا الخ لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مترجم نے خود مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام لکھے ہین، دیباچہ مین اس نے شفائے محمودی لکھا ہے، اصل کتاب (واگھبھٹ) کی ابتدا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "آغاز طب محمود شاہی"، پھر دفتر اول کے اختتام پر اس کا نام کتاب طب شفائے محمود شاہی بتایا ہے، لیکن عام طور سے یہ شفائے محمودی ہی کے نام سے مشہور ہے،

"جگت دوارکا" کاٹھیاوار کے آخری نقطہ پر راس کی شکل مین واقع ہے، جس کو بر و بحر دونون سے تعلق ہے، یہ ہندؤن کے قدیم پاک اور قابل زیارت شہرون مین سے ہے، یہان کا راجہ خود مختار ہوتا تھا، گجراتی حاکمون کی سیادت برائے نام تسلیم کرتا تھا، سلطان محمود اعظم کے وقت مین چونکہ بحری تجارت بہت ترقی کر گئی تھی، اس لئے جہازون کی آمد و رفت بکثرت رہتی، یہ راجہ موقع پا کر ان کو لوٹ لیتا، چنانچہ مولانا محمود سمرقندی دکن سے اپنے وطن کو جا رہے تھے، کہ ان کا جہاز لٹ گیا، ان کی عورتین گرفتار کر لی گئین، یہ پیدل و بیچون کوے کر جونہ گڑھ پہونچے، اور دربار شاہی مین فریاد کی، سلطان محمود نے راجہ کی اس حرکت سے ناخوش ہو کر تری اور خشکی دونون طرف سے حملہ آور ہو کر اس شہر کو فتح کر لیا، یہ واقعہ ۸۷۶ھ[۲] کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ ۸۷۸ھ مین ہوا، موجودہ مخطوطہ کے پہلے مقام کے آخر مین تحریر ہے :-

"کتبہ العاصی محمد عزت اللہ بتاریخ ۸ر شہر شعبان المعظم ۱۱۹۲ھ"

اس سے معلوم ہوا کہ آج سے ایک سو ستتر سال قبل زیر تنقید مخطوطہ تحریر ہوا ہے، اس کی ابتدا یون ہوتی ہے :-

"ان احکم ما تصح بہ حدیث التصنیف و تدا وی بخا صیتہ المجربۃ حب التالیف"

اور آخر مین ہے :-

"و بعضے خشن باشد، و نیز سُرخ باشد و تپ سخت و داد بسیار پدید کند"

اس ترجمہ مین شاہی حکم سے چند پنڈت بھی شریک تھے، اغلب ہے کہ وہ گجرات کے ناگر ہون گے، جو فارسی دان ہوتے

---

[۱] مراۃ احمدی جلد اول ص ۱۴۰ کلکتہ، [۲] مراۃ سکندری ص ۹۵ بمبئی،

کے باعث سرکاری دربار میں دخیل تھے، لیکن یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مترجم کے ان پنڈتوں کے نام تحریر کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا ہے، مترجم نے اس کتاب کو سلطان محمود اعظم کے نام سے معنون کیا ہے، جو سلطان احمد بانی احمد آباد کا پوتا تھا، گجرات میں عام طور سے اس کو محمود بیگڑہ (بیگ ڑہ) کہتے ہیں، اور بیگڑہ کا صحیح ترین ترجمہ ذوالقرنین ہے یعنی بیلوں کی سینگوں کی طرح لمبی لمبی دو مونچھوں والا، اس بادشاہ نے گجرات میں ۵۴ برس بڑے امن و عدل کے ساتھ حکومت کی، اس نے ایک محکمہ تالیف و تراجم کا قائم کیا تھا، چنانچہ تاریخ ابن خلکان، شفاء، مشکوٰۃ شریف اور محمود شاہی وغیرہ کا ترجمہ فارسی میں اسی عہد میں ہوا[1] اسی محکمہ کے ماتحت یہ کتاب (شفائے محمودی) بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی،

واگھ بھٹ کی کتاب ہندوستان میں بہت مقبول ہوئی اور اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لوگوں نے کیں، مترجم نے بھی ان شرحوں سے فائدہ اٹھایا ہے، کیونکہ کسی جگہ شارح کا قول "شارح" لکھکر نقل کرتا ہے، اور کسی جگہ بغیر اس کے سوال و جواب کی صورت میں ادا کرتا ہے، اور ایک جگہ شارح کا نام ارون دت بھی تحریر کیا ہے، اصل یہ ہے کہ اس کی کل ۳۴ شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں دو مطبوعہ ہیں، (۱) اتنگ درپن، ہے، جس کا مصنف "واچس پتی" نامی ہے، (۲) آیورویدرسائن ہے جس کا مصنف" ہماردی "مشہور بید ہے، مگر افسوس ہے کہ آخرالذکر کتاب نامکمل ہے، اور اسی لئے ناقص طبع ہوئی ہے، ان ۳۴ شرحوں میں سے ایک شرح کا نام "سرؤانگ سندرہ" ہے، اسی کا مصنف ارون دت ہے، جس کا ذکر مترجم نے کیا ہے[2] واگھ بھٹ نے بھی دوسری کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے، اسی لئے اپنے عہد سے قبل کے مشہور اور ماہر اطبا کی رائے کا اپنی کتاب میں بار بار ذکر کرتا ہے، چنانچہ چرت، حچ طبیب، اگنی ویش طبیب، آتےرے یہ طبیب اور ہاریت طبیب کا خصوصیت سے نام لیتا ہے، اس میں سے اگنی ویش طبیب اس قدر قدیم ہے، کہ اس کے عہد کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے، اور آج اس کی کوئی کتاب کسی کتب خانہ میں نہیں ملتی، لوگوں کا خیال ہے، کہ اس کی کتابیں دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں، متاخرین نے اگر اس کے مسائل کا ذکر نہ کیا ہوتا، یا کتابوں کا حوالہ نہ دیا ہوتا، تو شاید دنیا کو معلوم بھی نہ ہوتا، کہ اگنی ویش جیسا ماہر طبیب عالم وجود میں آیا بھی تھا،

واگھ بھٹ نے اصل کتاب کی ابتدا یوں کی ہے، کہ پہلے شافی حقیقی کی حمد لکھی ہے، پھر کہتا ہے کہ حاذق طبیب اپنے شاگردوں کو جو علم طب کی تعلیم دیتے ہیں، اس میں بڑا وقت صرف ہو جاتا ہے، اور بہت کتابیں مطالعہ کرنی پڑتی ہیں، اور اس وقت مروجہ طب کی کل آٹھ قسمیں ہیں، (۱) تبنع بدن (تشریح) میں (۲) تداوی اطفال (بچوں کے علاج) میں (۳) مضرت دیو کے بیان میں، (۴) بیماریوں کے علاج میں (۵) تیر، کانٹے، وغیرہ کے زخم کے علاج میں، (۶) زہریلے جانوروں کے ڈسنے کے علاج میں، (۷) پری کے علاج میں (۸) قوت باہ کے علاج میں، میں نے ان سب کو یکجا کر دیا ہے اور اس کا نام اشٹانگ ردی کائی جکیا[3] رکھا، اس کے بعد مصنف نے کتاب کی ترتیب اس طرح بتائی ہے، کہ اس میں چھ استھان (مقام) ہیں جس کے ایک سو بیس ادھیاء (باب) ہیں، (۱) مقدمہ، اس کے تیس باب ہیں (۲) تشریح ابدان اس کے چھ باب ہیں، (۳) اسباب و علل امراض، اس کے ۱۶ باب ہیں، (۴) معالجات اس کے ۲۲ باب ہیں، (۵) دواسازی اس میں چھ باب ہیں (۶) بقیہ امراض کے علاج میں جس کا ذکر نہیں ہوا، اس میں ۴۰ باب ہیں، اس مختصر فہرست سے جس میں ہر باب کے مضمون کو مختصر عنوان سے بیان کیا ہے، پوری کتاب پر سرسری نظر پڑ جاتی ہے، موجودہ مخطوطہ میں دو مقام

[1] تاریخ گجرات جلد دوم قلمی [2] آیورویدنو اتہاس ص ۱۶۴، احمد آباد، [3] اشٹ ہشٹ، ہشت (آٹھ)

تو مکمل ہین، اور تیسرے مقام کے ۲۶ باب مین سے ۱۳ باب ہین، اور اس آخری باب کے بھی صرف نو صفحے ہین، باقی نامکمل ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ کاتب نے لکھا ہی نہین، کیونکہ آخری صفحہ بالکل سادہ چھوڑ دیا گیا ہے، غالبًا یہ کتاب کسی دوسرے نسخہ سے متعدد کاتبون کے ذریعہ نقل کرائی گئی ہے، کیونکہ پہلے مقام کے آخر مین تاریخ تحریر ۶ شعبان ۱۱۰۴ھ ہے، اور دوسرے مقام کے اختتام پر ۱۱ رمضان ۱۱۰۹ھ ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے مقام کے چھ برس کے بعد دوسرا مقام منقول ہوا اگرچہ کتاب کا اکثر حصہ خطِ نستعلیق مین ہے، لیکن اوراق کی خاصی تعداد شکستہ کی بھی شان لئے ہوئے ہے، طب فرشتہ جس کا ذکر معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء مین ہوا ہے، واگھ بھٹ کی کتاب اس کے ماخذون مین داخل ہے،

واگھ بھٹ نے اپنی کتاب کی ابتدار اخلاط سے کی ہے، عام طور پر اطبائے ہند تین خلطون کے قائل ہین، باد، بلغم تلخہ (صفرا)، "سودا" کو وہ خلط شمار نہین کرتے لیکن واگھ بھٹ زیادہ وسیع النظر معلوم ہوتا ہے، غالبًا بابلی اور یونانی اطبا کی راے سے بھی واقفیت رکھتا ہے، اس لئے ان تین اخلاط کی تحریر کے بعد اس نے لکھا ہے کہ بعض لوگ خلط کی چوتھی قسم خون کو بتاتے ہین خون کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے، کہ ان کے نزدیک سودا، سوختہ خون کی ایک قسم ہے، جو باد کی آمیزش سے سرد خشک ہوگیا ہے، انسانی عمر کے اس نے تین حصے کئے ہین، سن طفولیت، جو ولادت سے سولہ سال تک شمار کیا جاتا ہے، اس مین بلغم کا غلبہ ہوتا ہے، سن توسط جو سترہ سال سے ۰۰ سال تک رہتا ہے، اس مین سفرا کا غلبہ ہوتا ہے، سن پیری جس کا سلسلہ آخری عمر تک رہتا ہے، اس مین باد کا غلبہ پایا جاتا ہے، اس بیان سے یہ خیال گذرتا ہے، کہ آج سے ۱½ ہزار سال قبل ہندوستانی باشندون کی اوسط عمر ستر برس کی ہوتی تھی، جیسا کہ آج انگلستان کے متعلق مشہور ہے، اور اب ہمارا ملک صحت کے اعتبار سے اس قدر گر گیا ہے کہ متقدمین کے وہم مین بھی نہ ہوگا،

مزہ کی چھ قسمین بتائی ہین، شیرین ترش، شور، تلخ، تیز، زمخت اور کہتا ہے کہ انھین کے کم و زیادہ استعمال سے اخلاط مین کمی بیشی ہوتی ہے، اسی کے ساتھ اس کا خیال ہے کہ مرض کا اصلی سبب تغیر موسم یا تداخل موسم ہے، اور اس کی مثالون سے اُس نے خوب تشریح کی ہے، طبیب کے لئے چند اوصاف ضروری قرار دیتا ہے، اس کو ذکی اور فہیم ہونا چاہئے، کسی ماہر طبیب کا شاگرد ہونا ضروری ہے، تجربہ کار، اور بے طمع ہو، لاعلاج امراض کی فہرست مین مندرجہ ذیل باتون کو بھی شمار کرتا ہو (۱) جس پر غضب شاہی نازل ہو (۲) جو بادشاہ کا دشمن ہو، (۳) یا خود اپنا آپ دشمن ہو (یعنی اپنے فوائد اور نقصان کی پروا نہ کرتا ہو)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ وہ باتین جن کی احتیاط سے بیماری پیدا نہین ہوتی تیرہ ہین، ریاح، پیشاب، پاخانہ، چھینک، کھانسی، پیاس، بھوک، نیند، ڈکار، جمائی، آنسو، قے، منی، اس کی تشریح کرتے ہوے وہ کہتا ہے کہ فطری طور پر جب وہ وقوع پذیر ہون، تو روکنا نہ چاہئے، اور جب یہ فطری طور پر رُکے ہون، تو اخراج کی کوشش نہ کرنی چاہئے، ورنہ صحت مین خلل آجائے گا، اس کے بعد اس نے ہر ایک کے فوائد و نقصانات کی تشریح کی ہے، آخر مین غیر فطری امساک کے متعلق تحریر کرتا ہے، کہ اس سے (۱) عضو مین درد پیدا ہوتا ہے، (۲) سوج جاتا ہے، (۳) تپ عارض ہوتا ہے، (۴) سینہ درد کرنے لگتا ہے (۵) پیشاب آسانی سے نہین ہوتا، (۶) سنگ مثانہ پیدا کرتا ہے، (۷) فتق کی بیماری مین مبتلا ہوجاتا ہے، پانی کے متعلق عام ہندو روایات کی پیروی کرتا ہوا لکھتا ہے، کہ پانی جو برستا ہے، وہ دو قسم کا ہوتا ہے، کبھی تو ابر زمین کے دریا سے پانی لے کر برساتا ہے اور کبھی ہوا کے شیرین دریا سے لاکر گراتا ہے، اور ان دونون کے فرق معلوم کرنے کا طریقہ یہ بتلایا ہے، کہ برستے ہوئے پانی کو کسی برتن

میں بھر لو، پھر اس مین پکا ہوا چاول ڈال دو، تھوڑی دیر کے بعد دیکھو، اگر اصلی حالت پر ہے، تو آسمانی دریا کا پانی سمجھو، ورنہ سُرخی
ورلزوجیت پیدا ہونے پر سمندری پانی یقینی ہے، عام ہندو روایت کے مطابق گنگا آسمانی دریا کا پانی ہے، لیکن اس محقق کو اس
مین شک ہے، اس لئے وہ کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہین، کہ گنگا آسمانی دریا کا پانی ہے، آگے چل کر لکھتا ہے کہ ہندوستان مین وہ ندیان
جو مغرب (بحر مغرب) مین گرتی ہین، وہ اچھی اور پاکیزہ ہین، ان مین کوئی عیب نہین، اس کا پانی مثل دوا کے ہے، اسی طرح ہمالیہ
کی بلند ترین چوٹی سے جو ندی بہتی ہے، وہ بھی اچھی ہے، لیکن مشرقی، مالوہ کوکن کے چشمون سے جو پانی جاری ہوتا ہے، اس کے
استعمال سے مرض بواسیر پیدا ہوتا ہے، کوہ صندرو (گجرات) کا پانی استسقا، پیل پا، اور غم پیدا کرتا ہے، کوہ مہی (گجرات) و
وندھیاچل کے پانی سے سر کی بیماریان ہوتی ہین، جنا کے متعلق کہتا ہے، کہ چرب اور شیرین ہے، اور اس کے پینے سے قوت باہ
مین اضافہ ہوتا ہے، مشروبات مین سے گائے کے دودھ کی بابت اس نے لکھا ہے، کہ جو شخص اس کا استعمال کرتا ہے، وہ جلد
بوڑھا نہ ہوگا، غلہ کے بابت سب سے پہلے چاول کو لیا ہے، کہ چاول کی بہت سی قسمین ہین، جن مین سے رت سالی، مہاسالی،
کلم سالی بڑے اور بہترین قسم کے ہین، اور یہ گود (گجرات) کے ملک مین پیدا ہوتے ہین، تو انگ، کشمیر مین، شکنا رہٹ، مگدھ
(بہار) مین اور سکندھک جس مین سے خوشبو آتی ہے، جالندھر (پنجاب) مین ہوتا ہے، جانورون کے ذکر مین وہ ایک ایسے
حیوان کا حال لکھتا ہے کہ جس کے چار پاؤن نیچے، اور چار اوپر اور دو دانت مثل ہاتھی کے ہوتے ہین، اور اس کا نام شرو ہے[۱] اور
وہ کشمیر مین ہوتا ہے، اس کے طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے، کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل مصنف کے عہد یا قریب ترین عہد مین
یہ جانور عالم وجود مین تھا، لیکن پانچوین صدی ہجری مین جب علامہ بیرونی یہان آیا ہے، تو اس کی نسل مفقود ہو چکی تھی، جیسے
گینڈا، بیرونی کے عہد مین گنگا کے کنارے جنگلون مین بہ کثرت تھے، اور برہمن اس کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے، لیکن
آج صرف عجائب خانون ہی مین محفوظ ہین، اور وہ بھی افریقہ سے منگوائے جاتے ہین، کیونکہ ہندوستان مین ان کی نسل
منقطع ہو گئی، مختلف جانورون کے گوشت کے خواص بیان کرتے ہوئے، کہتا ہے، کہ بکری کا گوشت سردی، دہنیت، اور
کچھ گرانی لئے ہوئے ہوتا ہے، لیکن اخلاط ثلاثہ مین کوئی اضافہ نہین کرتا، کیونکہ اس کا گوشت آدمی کے گوشت کے
مثل ہے، اس سے رطوبت مین بھی زیادتی نہین ہوتی، اور بدن کو قوت دیتا ہے، گائے کا گوشت خشک کھانسی دور
کرتا ہے، مگر بادی بیماریوں مین اضافہ کرتا ہے، بھینس کا گرم خواب آور بہت ثقیل ہے، بچھڑے کو سخت اور
بدن کو فربہ کرتا ہے،

اس کے بعد سبزی پھول، پھل کے خواص لکھتا ہے، خیال تھا کہ ہندوستانی مخصوص میوون کے متعلق کوئی نیا تجربہ ضرور
پیش کرے گا، مثلاً آم، کھرنی، کٹھل، بڑہل، گولر وغیرہ کے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان سب کے متعلق بہت نامکمل بیان ہے،
دواؤن کے جو خواص لکھے ہین، اس مین ہڑ (ہلیلہ) کی بڑی تعریف کی ہے، ہلیلہ، بلیلہ، اور آملہ ان تینون کو ملا کر "ترپھلی"
کہتے ہین، اور ان کے استعمال کی بڑی ترغیب دیتا ہے، اس کے بعد کی فصل مین کھانے پینے اور جماع کے متعلق ہدایات ہین کہ
کب اور کس قدر کس طرح کھانا پینا چاہئے، ہر ایک کو علٰحدہ علٰحدہ فصلون مین تفصیل سے لکھا ہے، اسی طرح مزہ کے ہر قسم
کو تفصیل سے لکھ کر اخلاط ثلاثہ سے پیدا ہونے والی بیماریون کا ذکر اور اسی کے ساتھ اس کا علاج بھی بتلاتا ہے، قے اور
علاج کا ذکر اس کے بعد ہے، اس مین ہر موسم مین غلبہ اخلاط اور مریض کے ماحول کا اندازہ کر کے خاص خاص تیلون کے استعمال

[۱] البیرونی ص ۹۹ مین ہے کہ اس کے چھوٹی سونڈ بھی ہوتی ہے، اور لوگ کہتے ہین کہ کوکن کے ڈانگ کے جنگل مین ہوتا ہے،

کی اجازت دی گئی ہے،

سترھواں باب اس بیان میں ہے کہ بدن کو کس طرح گرم رکھ سکتے ہیں، پھر ایک خاص باب حقنہ کا ہے، اس میں تحریر کیا ہے کہ کن کن امراض میں اس کی ضرورت پڑتی ہے، اور کن کن اوقات میں اس کا استعمال کرنا چاہئے، اس کے بعد آلات حقنہ پر بحث کی ہے، کہ اس کو چاندی سونے، تانبے، ہاتھی دانت مچھلی کے دانت نے اور نیزہ کا ہونا چاہئے، دوسری دھات اور لکڑی کی بھی اجازت دی ہے، پھر یہ بتلایا ہے کہ آلہ کی شکل کیا اور کس طرح ہونی چاہئے، بیسواں باب ناک میں دوا ٹپکانے اور اکیسواں دھونی لینے کے بیان میں ہے، پھر کلی، غرغرہ آنکھ میں دوا ٹپکانا وغیرہ ہے، چھبیسواں باب خاص توجہ کے قابل ہے جس میں جراحی کے متعلق بحث کی ہے کانٹا چبھنے، تیر لگنے، کیل گڑ جانے سے جو زخم ہو جاتا ہے، اس کا علاج بڑی تفصیل سے لکھا ہے، پہلے ایسی دواؤں کا ذکر کیا ہے جس سے بدن کے اندر پیوست شدہ چیزیں خود بخود نکل آئیں، پھر نشتر اور دوسری چیزوں سے چیرنے پھاڑنے کاٹنے امتحان کرنے، پٹی باندھنے وغیرہ کا بہت مفصل بیان دیا ہے، اس بیان کو پڑھکر یہ بات بڑی خوبی سے انسان کے ذہن نشین ہو جاتی ہے، کہ آج سے ۱/۲ ۱ ہزار سال قبل بھی جراحی کے تمام ضروری سامان موجود تھے، مثلاً آلات کشید گی، آلات کشید اندرونی اعضاء کے زخم وغیرہ کے امتحانی آلات، آلات گشید گی کے ضمن میں مردہ جنین کو نکالنا، جلندھر کا پانی کشید کرنا، دانت اکھاڑ کر پھر اس مقام کو روئی سے کسی آلہ کے ذریعہ صاف کرنا وغیرہ دیا ہے، غرض چودہ قسم کے آلات کا کلی طور پر، اور پھر اس کے ضمن میں جزئی آلات کا بھی ذکر کرتا جاتا ہے پھر ان آلات کی شکل بنانے کا طریقہ کہ کن کن چیزوں سے یہ آلات تیار کئے جائیں، اس کو اچھی طرح بتانے کی کوشش کی گئی ہے، بدن داغنے کے متعلق بھی اوس نے خوب لکھا ہے، اور اسی بیان پر مقام (باب) اول ختم ہو جاتا ہے،

مقام دوم تشریح بدن میں ہے، اس باب میں استقرار حمل سے موت تک کی بیماریوں پر نظر ڈالی ہے، اور اس کی چھ فصلیں ہیں، (۱) حمل، (۲) سود و زیان (۳) تقسیم اعضاء، (۴) مقامات نازک (۵) قرب موت کی علامت، (۶) استدلال خیر و شر کے بیان میں ہے،

پہلی فصل میں، اس سوال کے جواب میں کہ ہم استقرار حمل تو محسوس کرتے ہیں، لیکن اس میں روح کس طرح داخل ہو جاتی ہے، ؟ واگھبھٹ کہتا ہے کہ آتشیں شیشہ جب آفتاب کے مقابل ہو، اور اس کے نیچے کوئی کپڑا رکھو تو تھوڑی دیر میں وہ کس طرح جلنے لگتا ہے، پس جس طرح غیر محسوس طور پر آگ اس میں پیدا ہوتی ہے، اسی طرح جنین کے جسم میں روح حلول کرتی ہے، آگے چل کر وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے، کہ دنیا کی ہر جنس کی شکل الگ الگ کیوں ہے، اس کی تشریح تمثیل کے ذریعہ یوں کی ہے، کہ مختلف قسم کے قالبوں میں پگھلا ہوا لوہا اگر ڈالو تو مخصوص اشکال کی مختلف چیزیں ڈھل جائیں گی، اسی طرح ہر جنس کے مادہ کا رحم مخصوص شکل کا خدا نے بنایا ہے، اس لئے قالب (رحم) سے اسی شکل کی صورت ظہور پذیر ہو گی، جیسا رحم (قالب) مثلاً ہاتھی، اونٹ، گھوڑا، کتا، گائے، بکری،

راقم الحروف کہتا ہے کہ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی انسانی تجربات کی بنا پر اس میں اضافہ کی ضرورت ہے یعنی یہ صحیح ہے کہ ہر قالب کی طبعی شکل کے مطابق تولید ہو گی، غیر جنس کا اثر نہ ہوگا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قمری میں فاختہ (جو اصلی قالب کے بجائے کبوتر کی رنگت، خوبصورتی، اور جثہ ہوتا ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ دو جنس جب کہ قریب قریب ہم جنس ہوں تو ان کا اثر بھی تولید میں ظاہر ہوتا ہے، جیسے گھوڑا، اور گدھا، فاختہ اور کبوتر، بھیڑ اور بکری،

ہندو رسم و رواج کے مطابق اس نے تحریر کیا ہے، کہ عورت کے لئے ہر ماہ تین دن ایام کے ہوتے ہیں، حالانکہ اس ماہر فن

تجربہ سے اچھی طرح معلوم ہے، کہ ہر عورت کے لئے یہ تحدید صحیح نہیں، لیکن عام برہمن چونکہ اس حالت مین عورت کو بالکل ہی ناپاک [اور ن]اقابل تخاطب سمجھتے ہین اور گھر کی کسی چیز کو وہ چھو نہیں سکتی، اور گھر کا تمام کاروبار حالت التوا مین آجاتا ہی، اس لئے عورت کے پاک [ہو]نے کا انتظار اگر اس کے آخری دن تک کیا جائے، تو تمام خانگی کاروبار مین ابتری کا اندیشہ ہے، اس کے علاوہ ایسی حالت مین [صحت کے ل]حاظ سے اس کو آرام کی بھی ضرورت ہے، ان حالات کو مدنظر رکھ کر، اس کی مدت ان لوگون نے تین دن رکھی ہے، جس مین سکون [کے] ساتھ آرام کرتی رہے، لیکن اس کے یہ معنی نہین کہ تین دن کے بعد پاک سمجھی جاتی ہے، کیونکہ ایسی صورت مین نہ مندر جا سکتی ہے [نہ کس]ی محفل مین شریک ہو سکتی، جب تک کہ وہ صحیح معنی مین پاک نہ ہو جائے، البتہ صرف گھر کے متعلق کام انجام دے سکتی ہے،

واگھبھٹ عمر کے لحاظ سے اس کی ابتدا بارھوین سال سے بتلاتا ہی اور آخری مدت پچاس سال رکھی ہے، اس کے بعد [ایک] دلچسپ بات یہ کہی ہو کہ صحیح و تندرست بارہ سال کی لڑکی، اور صحیح و تندرست بیس سال کا مرد ہو تو ان دونون کے اختلاط سے [نہایت ق]وی، تندرست اور طویل العمر فرزند پیدا ہوگا، اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل اپنے ہندوستان کی [آب و ہوا] کس قدر اچھی تھی، کہ بارہ سال کی لڑکی جس کو آج بچہ سمجھا جاتا ہے، وہ پوری عورت بن جاتی تھی،

اولاد کے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ اگر مرد کے مادہ کی مقدار زیادہ ہوگی تو نرینہ اولاد ہوگی، اس [کے] بالعکس ہونے سے لڑکی ہوگی، اور اگر مساوی مقدار مین ہو تو عنین ہوگا، توام (جڑوان) کے متعلق لکھا ہو کہ [دو] منی کے درمیان اگر باد کا تداخل ہو جائے تو جڑوان بچے ہون گے، لیکن اس باد کے ساتھ صفرا یا بلغم کا غلبہ ہو تو بچے غیر جنس کے [پی]دا ہون گے، جیسے چوہا، سانپ، بندر وغیرہ، باپ کی ہم شکل اولاد ہونے کی ترکیب یہ بتاتا ہے کہ عورت کو چاہئے کہ حالت حمل [میں] اپنے شوہر کے چہرہ کو ہر وقت دیکھتی یا خیال کرتی رہے، اس کے بعد کچھ دوائین اور ٹوٹکے نرینہ اولاد کے لئے لکھ کر ہر ماہ جنین [میں] اضافہ ہوتا رہتا ہے، . . . . اس کا ذکر کرتا ہے، مدت حمل کے بابت لکھا ہے، کہ نوین مہینہ کا ایک دن بھی گذر جائے تو بچ[ے] [کے پیدا ہ]ونے کی زندگی کی توقع ہے، یعنی کم از کم مدت آٹھ ماہ ایک دن، اور زیادہ سے زیادہ مدت بارہ ماہ بتاتا ہے،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مین بھی ایک مقدمہ اسی نوعیت کا آیا تھا، اور ماہرین فن کی شہادت پر بارہ کی مدت [تسلیم کی گ]ئی، اور وہ حد (تعزیر) سے بچ گئی، لیکن اگر مدت بارہ سے زیادہ ہو تو وہ بیماری ہے،

آپ نے سنا ہوگا کہ بعض عورتوں کو حمل قرار پا کر مدت حمل میں یا اختتام پر وضع حمل ہوتا ہے، مگر اخراج کچھ نہین ہوتا، عوام [کا] خیال تھا کہ ایسے بچے کو دیو (جن) اٹھا لیجاتا ہے، یہ محقق حکیم کہتا ہے کہ بعض اوقات باد کے غلبہ سے حیض کا خون رحم مین جمع ہو کر بستہ [ہو] جاتا ہے اور اس کی شکل بالکل حاملہ جیسی ہو جاتی ہے، اور لوگ غلطی سے اس کو حاملہ سمجھنے لگتے ہین، مگر ہوا نکل جانے اور بستہ خون [کے گل ج]انے سے وہ حالت (دواؤن یا قدرتی ذرائع سے) جب جاتی رہتی ہے تو عوام کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس کا حمل دیو اڑا لے گیا، حالانکہ [یہ صحی]ح نہین ہی، اس کے بعد زچہ بچہ کی حفاظت اور غذا کی نسبت گفتگو کی ہے، پھر ایک طویل مقالہ اس پر لکھا ہو کہ اعضا کی کن علامتون [سے] انسانی اخلاق معلوم کئے جا سکتے ہین، اور یہ کہ انسانی اعضا کس طرح ہونے چاہئین پھر یہ بتایا ہے کہ کن کن مقامات پر کیا کیا علامتین [ظا]ہر ہون تو با اسباب ظاہر طبیب اس کی موت کا حکم لگائے، اس مقام کا آخری باب خواب اور شگون کے متعلق ہے جس کا [زیا]دہ تر تعلق اعتقاد اور وہم سے ہے،

تیسرے مقام مین ۱۶ فصلین ہین، (۱) اسباب و علل (۲) تپ (۳) خون و صفرا (۴) دمہ (۵) دق (۶) علل شراب نوشی (۷) [ا]تیسار (۹) عسر البول (۱۰) خروج منی (۱۱) دردہ (۱۲) استسقا (۱۳) سوجن (۱۴) برص (۱۵) علت باد، (۱۶) سرخ بادہ،

پہلی فصل مین بیماریون کے اسباب شناخت کرنے کے پانچ طریقے بیان کرکے لکھتا ہے کہ بیماری کا اصل سبب اخلاط ثلاثہ مین سے کسی کا غلبہ ہی دوسری فصل مین بخار (تپ) کے اسباب قسمین شناخت اور ان کا علاج بتلایا ہی، تیسری مین کھانسی (۴) مین دمہ (۵) وقتِ تشنگی، کے بیان مین ہی چھٹی فصل مین یہ بیان کیا ہو کہ شراب سے کون کون بیماریان پیدا ہوتی ہین، اسی کے ضمن مین اس کے فوائد کا بھی شمار کیا ہے اور کہتا ہو کہ اس کے دس گن ہین، اس کے اثر کی بابت لکھا ہے کہ مثل "زہر" کے زود اثر ہے، فوراً تمام رگ وپے مین دوڑ جاتا ہے، دسوین فصل مین خروج منی کی بیس قسمین لکھی ہین، (۱۱) قئ، گلولہ شکم، (۱۲) استسقاء (۱۳) مین اماس بدن کا ذکر ہے، اور اسی پر یہ مخطوطہ زیر تبصرہ ختم ہو جاتا ہے،

واگبھٹ اس فن کا پہلا مدوّن اور اس کی کتاب فن کی پہلی کتاب ہی، اس لئے انضباط کے بجائے مسائل طبیہ مین انتشار زیادہ ہو، باب اور فصلیں اوس نے قائم کی ہین، وہ اکثر ایسی ہین جس مین ایک دوسرے کا تداخل ہو سکتا ہے کبھی کبھی ایک ہی فصل مین خواص ادویہ، علت، اسباب علت اور علاج سب ہی درج کر دیتا ہے اور کہین مضامین کو بہت تشنہ چھوڑ دیتا ہے، مفردات کے خواص بہت اختصار کے ساتھ لکھتا ہی اور اکثر متحد الخواص اشیاء کو ایک ہی سانس مین بول جاتا ہو حالانکہ اس کے دوسرے خواص بھی ہوتے ہین جس کو وہ نظرانداز کر دیتا ہے، رسم ورواج اور مذہبی روایات کو طبی اصول کے تحت ذکر کر دیتا ہے، لیکن اس کے محقق اور ماہر فن ہونے مین کوئی کلام نہین جو بات اس کی تحقیق کے خلاف ہو اس کا ضرور اظہار کرتا ہے طبی مسائل جہان مذہب سے ٹکراتے ہون تو ہان دبے الفاظ مین اصل حقیقت بیان کرجاتا ہے وہ اپنے سے پہلے اطبا کے اقوال کو بھی وزن دیتا ہے اور اپنے نظریہ کی تائید مین ان کو پیش کرتا ہے، راقم الحروف کو "بید" کی دوسری کتابون کے مطالعہ کا اتفاق نہین ہوا ہے، اور اردو یا فارسی مین ان کے ترجمہ سے بھی آگاہی نہین ہے، اس لئے یہ نہین کہہ سکتا کہ قدماء کے کن کن مسائل سے اختلاف یا اتفاق کیا ہے، اور ان کے مقابل جدید مسائل کیا ایجاد کئے، اور ان کی صحت پر جو دلائل پیش کئے، وہ طب اور حکمت کے اصول سے کہان تک قرین صحت ہین،

تشریح ابدان کے جو آلات عہد موجودہ مین ایجاد ہوے ہین، ان کو دیکھتے ہوے پرانے آلات بچون کے کھلونے نظر آتے ہین، لیکن آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل اس عہد کی ضروریات قوی، اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے حسب ضرورت تمام اشیاء کا موجود ہونا بہت ہی تعجب انگیز ہے، یہان تک کہ بغیر پیٹ چاک کئے مردہ جنین کے نکالنے کے آلات کا بھی ذکر کرتا ہے،

مترجم نے اصل کتاب کے علاوہ ان کی شرحون سے بھی فائدہ اٹھایا ہی، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یہ آزاد اور مطلب خیز ترجمہ ہو بعض مسائل کو بیان کرکے جو اسلام کے خلاف ہون، صفائی سے کہدیتا ہے کہ یہ حرام ہے یا ناجائز ہے، شگون اور ٹوٹکے کا ذکر کرکے کہتا ہے، کہ اگر اسلام مین جائز ہے تو کر سکتا ہے، افسوس ہے کہ اس کا ترجمہ شگفتہ نہین ہے، ایک بڑی تکلیف دہ چیز اس ترجمہ مین یہ ہے کہ ابتدا مین ہر اصطلاح کا ترجمہ کرکے اسی ترجمہ کو آگے چل کر استعمال کیا ہے، لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اصطلاحی ترجمون کو چھوڑ کر اصل سنسکرت کا لفظ ہی استعمال کرنے لگتا ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن اشخاص کو اس فن سے لگاؤ نہین وہ ماقبل کے اصطلاحات بھی یاد نہ رکھین، تو آخری ابواب کا سمجھنا ان کے لئے سخت دشوار ہو جائے،

راقم الحروف کو اس کا علم نہین ہو کہ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے، اور نہ یہ جانتا ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے کسی کتب خانہ مین اس کا دوسرا نسخہ بھی موجود ہے، کیونکہ مین ایک ایسے شہر مین ہون جہان اس قسم کے ریسرچ کے ذرائع مفقود ہین، لیکن سنا ہے کہ چند سال قبل بھروچ (گجرات) سے اس کا مکمل نسخہ حیدرآباد پہونچ گیا ہے، کیا حیدرآباد کے علم دوست احباب اس طرف توجہ فرمائین گے،

تاریخ ابن خلکان کے فارسی ترجمے

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی

عربی کی سیر و تاریخ کی کتابون مین جو قبولیت عام اور شہرت دوام ابن خلکان[1] کی کتاب کو حاصل ہوئی ہے وہ اس فن کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، عربی کے تاریخی ادب مین یہ کتاب اس قدر مشہور و متداول رہی ہے کہ اس کو تاریخ ابن خلکان" یا صرف ابن خلکان کہدیتے ہین، حالانکہ اس کا پورا نام وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان مما ثبت بالنقل او السمع واثبتہ العیان ہے، یہ کتاب ہر زمانہ مین اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور اس کے بعد کے اسلامی تذکرون اور سوانحعمریون کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس مین اس کا حوالہ نہ پایا جاتا ہو، بااین ہمہ یہ کتاب اس قدر نایاب رہی، کہ ممالک اسلامیہ مین یہ ۱۲۷۵ھ مین طبع ہوئی، سب سے پہلے اسکی طباعت کا فخر ایک جرمن مستشرق وستنفیلڈ کو حاصل ہوا، جس نے مختلف مخطوطات کا مقابلہ کرکے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۰ء تک ۱۵ سال کے عرصہ مین کتاب کا ایک مکمل نسخہ ۱۳ حصون مین بالاقساط گوٹھا سے شائع کیا، پھر ۱۸۴۵ء مین موسیو ینیاپل نے اس کے بعض اجزاء لاطینی ترجمہ کے ساتھ امسٹرڈام سے شائع کئے، مشاہیر اسلام کے حالات و سوانح کی ایک مستند و معتبر کتاب ہونے کے لحاظ سے مشرق و مغرب دونون مین اس کتاب کے ساتھ اعتنا کیا گیا، اور یورپ کی مختلف زبانون مین اس کے بعض حصون کے ترجمے کئے گئے، انگریزی مین اس کا مکمل ترجمہ فرنچ مستشرق ڈی سلین نے ۴ ضخیم جلدون مین کیا، فارسی اور اردو مین بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہین، گو اہل ایران نے اس کتاب کے ترجمہ کی طرف توجہ نہیں کی لیکن ہندوستان اور ترکی مین اس کے چار چار ترجمے ہو چکے ہین، ذیل مین ہم ان فارسی تراجم کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہین،

۱- فارسی کا پہلا ترجمہ سلطان ناصر الدین ابوالفتح محمود شاہ معروف بہ "محمود بیگڑہ" فرمانروائے گجرات (۸۶۳ھ - ۹۱۷ھ) کے حکم سے مولانا یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان[2] نے منظر الانسان کے نام سے کیا، جیسا کہ مترجم نے مقدمۂ کتاب مین ذکر کیا ہے ۸۸۹ھ مین سلطان نے چانپانیر کو فتح کیا جس کی تاریخ مترجم نے مقدمہ مین کلمۂ "افتتح" سے نکالی ہے، اس کی یادگار مین اس نے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ۸۹۰ھ مین ترجمہ کرنے کا حکم صادر ہوا، ۸۹۳ھ میں اس کا آغاز ہوا، اور ۸۹۴ھ مین مکمل ہو کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہوا، اور ۲۵ دوسری کتابون سے اس ترجمہ مین اور مطالب کا اضافہ کیا گیا، ۸۹۵ھ مین نظر ثانی کی گئی، اور

[1] قاضی القضاۃ شمس الدین ابو العباس احمد بن محمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان البرمکی الکاری الاربلی الشافعی الاشعری، ولادت ۶۰۸ھ، وفات ۶۸۱ھ، ان کے مفصل حالات کے لئے دیکھو طبقات الشافعیہ للسبکی، ج ۵ ص ۱۴، فوات الوفیات ج ۱ ص ۵۵، حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۲۰۶، [2] سید عثمان الملقب بہ "شمع برہانی" حضرت قطب العالم رحمۃ اللہ علیہ کے خلفائے کبار مین سے تھے، سلطان محمود کو ان سے بڑی عقیدت تھی، ۸۶۳ھ مین ان کا وصال ہو گیا، اور یہی سال سلطان محمود کی تخت نشینی کا ہے، چونکہ محمود شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے پچاس سال (۹۱۷ھ) تک گجرات پر حکومت کی ہے، اس لحاظ سے تعجب نہیں، اگر سید عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے پر پوتے اپنے دادا کے باپ کی وفات سے ۲۶ سال کے بعد ۸۸۹ھ مین جبکہ ہنوز وہ نو عمر ہون گے، اس کتاب کا ترجمہ شروع کرتے ہین،

منظر الانسان نام رکھا گیا، مورخ محمد بن عمر المکی معروف بہ حاجی دبیر (سنہ ۱۰۲۰ھ) مصنف ظفر الوالہ نے اس ترجمہ کو دیکھا تھا، وہ لکھتے ہین

"لقد ترجم بعبارة حسنة تشعر باتقانہ فی معرفة اللسانین ویخبر بما یشھد لہ بفضلہ کلا الفریقین علیہ الرحمة"[51]	عمدہ عبارت مین اس کا ترجمہ کیا گیا ہے جس سے دونوں زبانوں میں مترجم کی واقفیت کامل معلوم ہوتی ہے، اور فریقین کے مترجم کی فضیلت کا اعتراف کرنے کی شہادت دیتی ہے، ان پر خدا کی رحمت ہو،

فی زماننا اس ترجمہ کے چار مخطوطے موجود ہین :-

۱- ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے مین نمبر ۱۴، ۱۶ پر موجود ہے، اور سنہ ۱۱۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، جلد چمڑے کی منقش و مطلّا ہے، کل ۴۰۹، ۱ اوراق ہین، عبارت ذیل سے کتاب شروع ہوتی ہے :-

"آرایش دیباچہ مناقب و مآثر سلاطین رفیع مقدار"

کتاب کے آخری سطور مین مترجم نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ، ار ربیع الاول سنہ ۸۹۳ھ کو شروع ہوا اور ۲۴ ر رمضان سنہ ۸۹۵ھ کو ختم ہوا، اس پر ڈاکٹر ریو نے یہ اعتراض کیا ہے، کہ مترجم نے دیباچہ مین ترجمہ کا سنہ آغاز سنہ ۸۸۹ھ بتایا ہے، وہ اس آخری تحریر سے مطابقت نہین رکھتا، لیکن بقول مترجم یہ سنہ ترجمہ کرنے کی فرمایش کا ہے، ورنہ ترجمہ کا آغاز تو سنہ ۸۹۳ھ مین ہوا، آخر مین مترجم کے نسب نامہ سے متعلق یہ نام اضافہ کئے گئے ہین، (عثمان) بن علی بن احمد الشجاع السنجری" ترجمہ میں اکثر جگہ اصل متن کا اختصار کیا گیا ہے، عربی اشعار جو مصنف نے بکثرت نقل کئے ہین، ان کو یا تو بغیر ترجمہ کے نقل کیا ہے، یا بالکل اڑا دیا ہے، اوراق ۱ تا ۱۲ پر تذکروں کی فہرست ہے، جو تعداد مین ۸۳۰ ہین، ورق ۱۳ پر سلطان محمد قطب شاہ کی مہر ہے جس مین سنہ ۱۱۱۵ھ درج ہے[52]

۲- دوسرا نسخہ بھی اسی برٹش میوزیم مین ہے، جلد اول کا ترجمہ حرف ز تک نمبر ۲۳۵۸۳ پر موجود ہے، پہلے نسخہ کے مترجم کے فارسی دیباچہ کے بجاے اس مین ایک طویل عربی دیباچہ ہے، جس کے شروع کے دو ایک ورق غائب ہین، اس مین سلطان محمود کی مدح ہے، (ورق ۳-۴) مگر اس مین سے ابن خلکان کے دیباچہ کا ترجمہ جو پہلے نسخہ مین موجود ہے نکال دیا گیا ہے، عربی اشعار کے ترجمے حواشی پر لکھے گئے ہین، جلد دوم کا ترجمہ نمبر ۶۶، پر ہے، جو ۳۱۱ اوراق پر مشتمل ہے، یعنی حسب نسخہ اول ورق ۶۱۲ تا ورق ۴۰۹،[53]

۳- تیسرا نسخہ دفتر دیوانی حیدر آباد کے کتب خانے مین موجود ہے، جو سنہ ۱۰۳۱ھ کا لکھا ہوا ہے، اور کاتب کا نام علی بن حسن الالٰہی ہے،[54]

۴- چوتھا نسخہ پروفیسر محمود شیرانی کے کتب خانہ مین نمبر ۱۹۹۳ پر موجود ہے، جس کا ذکر انھون نے اپنے ایک مضمون مین کیا ہے[55]

(۳) دوسرا فارسی ترجمہ کبیر بن ادریس بن محمد لطیفی نے کیا تھا، یہ ترجمہ سلطان سلیم اول فرمانرواے ترکی (سنہ ۹۱۸ھ - سنہ ۹۲۶ھ) کے لئے لکھا گیا تھا، سلطان سلیم کو جب تواریخ اور خصوصاً ابن خلکان کے مطالعہ کا شوق ہوا تو اس کا ترجمہ فارسی مین کرایا

[51] ظفر الوالہ بمظفر والہ ج ۳ ص ۲۳ [52] فہرست مخطوطات فارسی ج ۱ ص ۳۲۴ [53] ایضاً ج ۲ ص ۸۰۹ [54] رسالہ معارف جون مضمون کتب خانہ دفتر دیوانی" اس کے بعد ایک مضمون "منظر الانسان کا مصنف" (؟) معارف مین شائع ہوا ہے، جس مین ظفر الوالہ کی ایک طویل غیر متعلق عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں نہ تو مترجم کے حالات پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے، نہ اس کتاب کے کسی مخطوطہ کا ذکر کیا گیا ہے [55] رسالہ اردو جنوری سنہ ۱۹۴۲ء،

یہ ترجمہ نصف ہونے پایا تھا، کہ سلطان نے وفات پائی، مترجم کا حال معلوم نہ ہوسکا، لیکن ڈاکٹر ریو نے سلیم نامہ کے مخطوطہ کے حوالہ سے اس کا نام قاضی عبد الکبیر لطیفی لکھا ہے، جو فارسی نثر نویسی پر مامور تھا، حاجی خلیفہ نے اوس کو معروف بہ قاضی زادہ لکھا ہے،

ڈاکٹر ریو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ کے دو مخطوطے موجود ہین، ایک سرگوراوسلے کے ذخیرۂ مخطوطات مین نمبر ۶، ۳ پر اور دوسرا کنگز کالج لائبریری مین نمبر ۱۱ پر ہے،

(۳) تیسرا ترجمہ ظہیر الدین اردبیلی کا (المتوفی بمصر ۹۳۰ھ) کا ہے، طاش کبری زادہ نے ان کے تذکرہ مین لکھا ہے کہ انھون نے تاریخ ابن خلکان کا فارسی مین ترجمہ کیا تھا[۱]،

حاجی خلیفہ نے ظہیر الدین کی بجائے اظہر الدین لکھا ہے، اس کا قیاس ہے کہ قاضی زادہ نے اس کتاب کا کوئی ترجمہ نہین کیا، اس کے نزدیک ظہیر الدین اور قاضی زادہ دونون ایک ہی شخص ہین، اور یہ قیاس آرائی خود قاضی زادہ کے ایک فارسی رسالہ سے کی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہین :-

"وترجمہ (وفیات) مولانا اظہر الدین الاردبیلی
بالفارسیۃ وتوفی بمصر سنۃ ۹۳۰ ثلاثین وتسعمائۃ
ورأیت رسالۃ فارسیۃ لکبیر بن اویس بن محمد
اللطیفی الشھیر بقاضی زادہ المتوفی سنۃ ۹۳۰ ثلاثین
وتسعمائۃ ذکر فیھا ان السلطان سلیم خان
القدیم لما اشتغل بتتبع التواریخ خصوصاً وفیات
لابن خلکان ترجمہ لہ بالفارسیۃ وحین وصل
الی نصفہ مات السلطان ولعل ذالک
المذکور ھو الشھیر باظہر الدین اردبیلی"

اور مولانا اظہر الدین اردبیلی المتوفی بمصر ۹۳۰ھ نے وفیات
کا ترجمہ فارسی مین کیا ہی، مین نے ایک فارسی رسالہ مؤلفہ
کبیر بن اویس بن محمد اللطیفی مشہور بہ قاضی زادہ المتوفی
۹۳۰ھ دیکھا تھا اس مین اس نے یہ بیان کیا ہی کہ سلطان
سلیم خان قدیم کو جب تواریخ خصوصاً وفیات ابن خلکان
کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، تو اس نے (قاضی زادہ نے)
فارسی مین اس کا ترجمہ کیا، اور جب آدھی کتاب کا ترجمہ
ہوچکا تو سلطان نے وفات پائی، شاید مترجم مذکور وہی
ہی جو اظہر الدین اردبیلی کے نام سے مشہور ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ کو دونون کے سنہ وفات ایک ہونے سے دھوکا ہوا ہے، حالانکہ یہ دونون جدا جدا شخص ہین، طاش کبری زادہ کے بیان کے مطابق ظہیر الدین کا وفیات ابن خلکان کا فارسی مین ترجمہ کرنا ثابت ہی، قاضی عبد الکبیر کے ترجمہ کے متعلق حاجی خلیفہ نے اس کے رسالہ کا حوالہ دیا ہی وہ خود بتا رہا ہے، کہ اوس نے سلطان سلیم کی فرمایش پر اس کا ترجمہ کیا تھا، اس پر سلیم نامہ کے مصنف حکیم الدین ادریس بن حسام الدین البدلیسی کی اس شہادت کا اضافہ کر لو جو اوس نے دیباچۂ کتاب مین پیش کی ہی کہ جب وہ سلطان سلیم اول کے زمانہ مین اپنی تاریخ لکھ رہا تھا، تو تین اور آدمی بھی ایسی ہی تاریخی کتابین لکھنے مین مصروف تھے، ان مین ایک قاضی عبد الکبیر بھی تھا، جو فارسی نثر لکھتا تھا[۳]، اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہی، کہ سلطان سلیم کے لئے جس نے وفیات کا فارسی مین ترجمہ کیا وہ عبد الکبیر ہی تھا، ظہیر الدین کا ترجمہ اس کے علاوہ ہی،

(۴) چوتھا ترجمہ ہندوستان مین کیا گیا تھا، ڈاکٹر ریو نے مخطوطہ تاریخ محمدی (از محمد بن رستم بن قباد جو ابتدا ے ہجرت سے لیکر ۱۱۹۰ء تک کی تاریخ ہے) کے ورق ۲۴۶ کے حوالہ سے لکھا ہی[۴] کہ شیخ کبیر بن شیخ منور لاہوری (المتوفی ۱۰۲۶ھ احمد آباد) نے ابن خلکان کی کتاب کا فارسی ترجمہ کیا تھا، شیخ کبیر عہد اکبری کے علما مین سے تھے، چنانچہ مورخ بدایونی نے ان کا ذکر کیا ہی[۵]، مگر اس ترجمہ کے متعلق کچھ نہین لکھا،

۱؎ الشقائق النعمانیہ بہامش ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۰ ۲؎ کشف الظنون جلد ۲ ص ۳۹۰ ۳؎ فہرست مخطوطات فارسی جلد ۱ ص ۲۱۹ ۴؎ جلد ۳ ص ۱۰۵۳ ۵؎ منتخب التواریخ جلد ۳

ادبیات

غزل

از جناب روش صدیقی

ہوائے ضبط سے شمع یقین پہ کیا گذری
الٰہی عشق کی جان حزین پہ کیا گذری

تباہ کرکے مرے دل کو اے مرادِ حیات
بتا! کہ تیرے دلِ نازنین پہ کیا گذری

نشانۂ ستمِ دوست، ساکنانِ زمین؟
کسے خبر ہے کہ چرخِ برین پہ کیا گذری

سکون مین رنگِ ہزار اضطراب شامل ہی
متانتِ نگہِ شرمگین پہ کیا گذری

فقیہ شہر کو سودا اے نرگسِ مخمور
کوئی بتائے کہ اربابِ دین پہ کیا گذری

جنونِ دشت نوردی پہ عشق نازان ہے
خبر نہین کسی خلوت نشین پہ کیا گذری

وہ بزمِ ناز سلامت یہ تذکرہ بے کار
بلاکشانِ ملامت گزین پہ کیا گذری

شریکِ بزمِ خرابات ہوکے اے زاہد
ترے تصورِ خلدِ برین پہ کیا گذری

ہر آستان سے انھین ماورا تو مان لیا،
کہے یہ کون غرورِ جبیں پہ کیا گذری

لبِ حبیب سے سُن کر روش مرے اشعار
یہ سوچتا ہون، دلِ نکتہ چین پہ کیا گذری

غزل

از جناب یحییٰ اعظمی

سراپا درد ساری زندگانی ہوتی جاتی ہے
محبت اک بلائے ناگہانی ہوتی جاتی ہے

ہر اک شے سے جہان کی سرگرانی ہوتی جاتی ہے
قیامت اب مری شوریدہ جانی ہوتی جاتی ہے

دلِ محزون سے ہر نقش تصور مٹتا جاتا ہے،
مگر اک یاد ان کی جاودانی ہوتی جاتی ہے

نظر آنے لگا ہے اور ہی کچھ منظرِ فطرت
نگاہون پر یہ کس کی حکمرانی ہوتی جاتی ہے

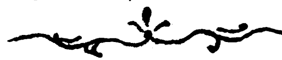
دبی تھی جو دلِ سوزان مین اب آنکھون سے بہہ کر
محبت کی وہ ساری آگ پانی ہوتی جاتی ہے

زبانون پر کبھی یہ حرفِ نازک آ نہین سکتا
حدیثِ شوق آنکھون کی زبانی ہوتی جاتی ہے

تغافل اور یہ طرزِ تغافل اے معاذ اللہ
مجھی پر کس لئے یہ مہربانی ہوتی جاتی ہے

ہین مخفی اس مین نکتے سینکڑون درسِ محبت کے
وہ دزدیدہ نظر جانِ معانی ہوتی جاتی ہے

نہ اب وہ ولولے ہین اور نہ ذوقِ زندگی باقی
حیاتِ شوق نذرِ عمرِ فانی ہوتی جاتی ہے



مطبوعاتِ جدیدہ

انتخاب غالب شائع کردہ کتب خانہ رامپور تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۴ صفحے کاغذ نفیس رنگ آمیزی نظر فریب ٹائپ روشن، قیمت عـہ

نواب کلب علی خان والی رامپور کی فرمایش پر مرزا غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب کیا تھا جس پر خود ان کے قلم کی تصحیح و ترمیم ہے، اس اعتبار سے یہ بڑی نادر چیز تھی، ریاست کے کتب خانہ مین اصل نسخہ محفوظ تھا، جو اس کی جانب سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے، کتب خانہ کے لائق ناظم مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی کی تصحیح، مقدمہ، اور شرح غالب نے اس انتخاب کی قدر و قیمت اور بڑھا دی ہے، مقدمہ مین انھون نے مرزا صاحب کی تحریرون سے ان کے اردو اور فارسی کلام کے متعلق خود ان کی رائے، عام شعر و سخن اور محاسنِ شاعری کے متعلق ان کے نقطۂ نظر، اور عمر، تجربہ اور مشق و ممارست کی پختگی کے ساتھ اس مین تدریج جو تبدیلی ہوتی رہی، اور آخر مین انھون نے محاسنِ شاعری کی جانچ کے لئے بقول خود جو میزان مقرر کی تھی، اس کی تفصیل بیان کرکے اس انتخاب کو اس مین تولا ہے، اس سلسلہ مین شعر و سخن کے متعلق مرزا صاحب کے اور متفرق خیالات بھی معرضِ تحریر مین آگئے ہین، اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر اور نئی چیز شرح غالب ہے، مرزا صاحب نے لوگون کے استفسار پر اپنے بعض اردو اور فارسی اشعار کی تشریح کی ہے، یا ان کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے، یا اصحابِ ذوق کو خود ان کی جانب توجہ دلائی ہے، یا اپنی کسی تحریر مین کسی اور حیثیت سے اپنے کسی شعر کا ذکر کیا ہے جس سے اس کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے، فاضل مرتب نے ان تمام معلومات کو مرزا صاحب کے فارسی اور اردو مکاتیب سے تلاش کرکے کتاب کے آخر مین شرح غالب کے نام سے جمع کر دیا ہے، اور اس انتخاب کے جن اشعار سے ان کا تعلق ہے اس کے صفحہ اور سطر کا حوالہ دیدیا ہے، اس طرح خود غالب کے قلم سے ان کے بہت سے اشعار کی شرح تیار ہوگئی ہے، گو یہ معلومات مرزا صاحب کے مکاتیب ہی سے جمع کئے گئے ہین، لیکن یہ خود بڑی محنت اور دیدہ ریزی کا کام تھا جس کا اندازہ دوسرے مشکل کر سکتے ہین، فاضل مرتب کی یہ جدت قابلِ داد اور ان کا "طغرائے امتیاز" ہے یہ تو اس انتخاب کے معنوی محاسن ہین ظاہری حیثیت سے بھی وہ حسن و نفاست کا مرقع ہے، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حسن مذاق کے ساتھ آج تک اردو مین کوئی کتاب شائع نہین ہوئی ہے، نسخہ حمیدیہ اور ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے مقدمہ کی اشاعت کے بعد سے ایک عام بد مذاقی یہ پیدا ہوگئی ہے، کہ مرزا کی اشکال پسندی اور ان کے اغلاق و ابہام کو بھی ان کے محاسنِ شاعری مین شمار کیا جانے لگا ہے، حالانکہ ان کا بہترین کلام وہی ہے، جو صاف اور سلیس ہے اس انتخاب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس مین مشکل سے کوئی پیچیدہ شعر مل سکتا ہے آخر مین کلیات فارسی کے چار اور دواوین اردو کے آٹھ معتبر نسخون کی مدد سے اختلاف نسخ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے غرض یہ انتخاب ظاہری اور معنوی محاسن ہر پہلو سے نہایت مکمل اور اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

دنیا کی کہانی از جناب محمد مجیب صاحب بی اے آکسن تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت قیمت عہ مجلد پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

یہ کتاب مصنف کی ان تقریرون کا مجموعہ ہے جو دہلی ریڈیو سے نشر ہوئین، اس کو شائع ہوئے عرصہ ہوگیا، ہمارے پاس

اب ریویو کے لئے آئی ہے، اس مین آغاز آفرینش سے لیکر اب تک دنیا کے ارتقا، اور اس کی تمدنی سرگذشت بیان کی گئی ہے، عالم کی تخلیق اس کے ارتقائی مدارج، انسانی ترقی کے مختلف دور قدیم قومون اور تہذیبون کے حالات یونان، روم، چین اور ہندوستان کی تہذیبین عیسائیت اسلام اور مسلمانون کی تہذیب ترک، تاتار، اسلامی ہند، اور یورپ کی تاریخ و تمدنی وسیاسی سرگذشت، جدید یورپ کے حالات کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ دنیا جن جن مراحل سے گذر کر اس منزل تک پہنچی ہے اور اس کے تمدنی ارتقا مین جن جن قومون کا حصہ رہا ہے، اس کی پوری سرگذشت نگاہون کے سامنے آجاتی ہے، اسلامی مسائل مین بھی بڑی حد تک مصنف کا نقطۂ نظر صحیح اور قلم محتاط رہا ہے، اور نازک مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کیا ہے، انداز بیان کے اعتبار سے کتاب شگفتہ اور دلچسپ ہے، موضوع کی خشکی کو لطف بیان نے زائل کر دیا ہے، یہ کتاب معلومات کے اعتبار سے متوسط درجون کے نصاب مین داخل ہونے کے لائق ہے، فاضل مصنف کا ادبی ذوق اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ انھین کبھی کبھی ادبی میدان مین بھی اترنا چاہئے، معلوم نہین اس کو انھون نے کیون چھوڑ رکھا ہے،

قرآن مجید کی پہلی کتاب مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۵۰ صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- ادارہ تعلیمات اسلام نمبر ۳۰، امین آباد پارک لکھنؤ،

معارف مین لکھنؤ کے ادارہ تعلیمات اسلام کا تذکرہ آچکا ہے، یہ ادارہ کئی سال سے تعلیم قرآن کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے اور لکھنؤ کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ مین تعلیم قرآن کا خاصہ ذوق پیدا کر دیا ہو، مذکورۂ بالا کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک مفید خدمت ہو، عربی زبان کی باقاعدہ تحصیل مین بڑا وقت صرف ہوتا ہے، اس لئے ادارہ کے لائق استاذ اور کارکن مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی نے خاص ترجمۂ قرآن کے بقدر عربی تعلیم کے لئے ایک قرآنی نصاب کا سلسلہ شروع کیا ہو، یہ کتاب اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے، اس مین اس مقصد کے مطابق کلام مجید کے آغاز سے اس کی آیات اور اس کے الفاظ سے عربی لغت اور قواعد کے اسباق ترتیب دیئے ہین، املا و ترجمہ کی مشقین دی ہین، غیر قرآنی مشقون مین بھی اصل مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہو، جا بجا ضروری صرفی و نحوی قواعد، تشریح طلب آیات کی وضاحت اور ان سے متعلق ضروری معلومات دیدئے ہین، اس طریقہ تعلیم سے عربی زبان سے واقفیت اور ترجمۂ قرآن کی استعداد ساتھ ساتھ پیدا ہوتی جاتی ہو، یہ کتاب پہلے پارہ کے ترجمہ کا نصاب ہے، جن لوگون کو کلام مجید سے ذوق ہے ان کو ضرور اس کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہئے، اس سلسلہ مین اس پہلو کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے، کہ یہ نصاب صرف کلام مجید کا ترجمہ سمجھ لینے کی استعداد کے لئے ہے، اس کی تفسیر و تاویل کے حدود اس سے باہر ہین اس کا ظاہر کر دینا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ آج کل کے مجتہدین اردو اور انگریزی تراجم کے بل پر اجتہاد کے مدعی بن جاتے ہین، براہ راست ترجمہ سمجھ لینے کے بعد ان کو سند جواز نہ ہاتھ آجائے جس کی مثالین آئے دن سامنے آتی رہتی ہین،

سرمایہ از جناب م م جوہر صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- مکتبہ برہان قرول باغ دہلی،

کارل مارکس کا صحیفہ کیپٹل دنیا کی ان چند کتابون مین ہے، جس نے پرانے نظام عالم پر ایک عالمگیر انقلابی اثر ڈالا ہے، تمام ترقی یافتہ زبانون مین اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اردو مین بھی اس کی ضرورت تھی، اس کتاب کے بعض ابواب و مباحث اتنے فلسفیانہ پیچیدہ اور دقیق ہین، کہ اصل زبان مین ان کا سمجھنا مشکل ہے، ترجمہ مین شاید دولیدگی بیان اور بڑھ جاتی، اس لئے لائق مترجم نے ترجمہ کرنے کے بجائے اس کے اہم ابواب و مباحث کی جن سے کارل مارکس کے اقتصادی فلسفہ اور اس کے بنیادی نظریون پر روشنی پڑتی ہے، اپنی زبان مین تلخیص کر دی ہے یہ تلخیص صاف اور سلجھی ہوئی ہے، مطالب کے سمجھنے مین کوئی دقت نہین ہوتی بقیہ ابواب کی تلخیص اس کتاب کے دوسرے حصہ مین ہوگی، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا، کہ اردو دان طبقہ کو براہ راست مارکس کے اقتصادی فلسفہ سے واقفیت ہو جائے گی، اور ان کو ہندوستانی سوشلسٹون کی پریشان تعبیرون سے نجات مل جائے گی،

"م"

جلد ۵۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۴۹-۵۰

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا نظریۂ علم — مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ — ۵۱-۶۵

"باقیات فانی" — جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی علیگ ایڈوکیٹ اعظم گڑھ — ۶۶-۷۰

سوز نی — جناب غلام مصطفی خان صاحب ایم اے علیگ لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی — ۷۱

مطبوعات جدیدہ — "م" — ۷۲

شذرات

آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پیشتر ایک انگریز مشنری ڈاکٹر ٹسڈل نے ینابیع الاسلام کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، کہ نعوذ باللہ کلام مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اور اسلام یہودی عیسوی اور بعض دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہے، اور انگریزی، عربی اور اردو و متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے شائع کئے گئے تھے، لیکن اسی زمانہ میں اس کے جوابات بھی لکھے گئے، چنانچہ عربی میں التطبیق بین الدیانۃ الوثنیہ والمسیحیہ کے نام سے مصر سے جواب شائع ہوا تھا، اردو میں پنجاب کے کسی صاحب نے جواب لکھا تھا، خواجہ کمال الدین مرحوم کی ینابیع المسیحیت بھی اسی کا الزامی جواب ہے، غرض یہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے، اور اس کی پوری تنقید و تردید ہو چکی ہے، دنیا اسے بھول بھی چکی تھی، اب نصف صدی کے بعد ایک "نیک نام محسن اسلام" نے اسی کتاب کا، جس کو مصنف نے مزید اضافوں کے ساتھ اوریجنل سورسز آف قرآن کے نام سے انگریزی میں شائع کیا تھا، ترجمہ کرکے اس گڑے ہوئے مردے کو اکھاڑا ہے اور اپنے نزدیک اسلام کی بڑی خدمت انجام دی ہے،

یہ پرانے متعصبانہ دور کی باتیں تھیں، اب علم و تحقیق کا قدم اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ خود یورپ کے علما اس قسم کی کتابوں کو خرافات سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، اور اگر کسی درجہ میں اس کی اہمیت مان بھی لی جائے تو عیسائیوں اور مسلمانوں کے مناظرانہ مسائل پر اتنا لکھا جا چکا ہے اور عیسائیوں کے اعتراضات کے اتنے جوابات دیئے جا چکے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی نیا مسئلہ نکل سکتا ہے، اس زمانہ میں بھی خواجہ کمال الدین مرحوم اور پروفیسر سید نواب علی صاحب کی تصانیف ایسی محققانہ ہیں، کہ آج تک عیسائیوں سے ان کا جواب نہ ہو سکا، خواجہ صاحب مرحوم کی ینابیع المسیحیت اور پروفیسر نواب علی صاحب کی تاریخ صحف سماوی اور قصص الحق میں ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب کا بڑی حد تک جواب موجود ہے، جن لوگوں کی نظر سے ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب گذر چکی ہو ان کو ضرور ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے،

اس سے قطع نظر علمی اور تحقیقی حیثیت سے ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، وہ دجل و فریب تحریف و تدلیس اور مغالطہ و غلط بیانی کا مجموعہ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کو ایک نیا مذہب فرض کرکے بائبل اور قرآن مجید کے بعض مشترک اسرائیلی قصص اور اسلام یہودیت و نصرانیت اور بعض دوسرے مذاہب کے چند ملتے ہوئے عقائد کی تفصیلات غیر معتبر کتابوں سے نقل کرکے انھیں غیر مذاہب سے ماخوذ بتایا گیا ہے، اور ان میں اور بائبل کے بیان میں جو اختلافات ہیں، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

لاعلمی اور جاہل یہودیون اور عیسائیون سے استفادہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے لیکن مصنف کے یہ سارے دعوے و دلائل اور مقدمات و نتائج سرے سے غلط ہین، اسلام کوئی نیا مذہب نہین ہے، بلکہ قرآن مجید مین بتکرار اس کی تصریح ہو کہ اسلام وہی دین ہو جس کی تعلیم تمام گذشتہ انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہین، وہ کسی نئے مذہب کا موجد نہین، بلکہ گذشتہ مذاہب کا مصلح اور ان کا مصدق ہے،

اسلام کا مقصد صرف یہ تھا کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی اصلی تعلیمات کو جو مرور زمانہ سے انسانون کے ہاتھون مسخ ہو چکی تھین، بیرونی آمیزش سے پاک کر کے دوبارہ زندہ کردے، اور انسانون کی دینی و دنیوی فلاح و سعادت کا دائمی خداوندی دستور العمل ان کے ہاتھون مین پہنچا دے، اس لئے گذشتہ سچے مذاہب کی بعض تعلیمات و عقائد مین اس کا اشتراک اخذ و نقل کا ثبوت نہین، بلکہ اسلام کے مقصد کا فطری نتیجہ ہے، موجودہ عیسائیت پر اس کا قیاس صحیح نہین ہے، جس کا بڑا حصہ آفتاب پرستون اور دوسری مشرک قومون سے ماخوذ ہے،

پھر مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت مین زیادہ تر اسرائیلی قصص اور چند ایسے عقائد کو پیش کیا ہے جن کا اسلام کے بنیادی عقائد سے کوئی تعلق نہین، اس کے بنیادی عقائد اور اس کی اخلاقی و روحانی تعلیمات کو مصنف نے ہاتھ تک نہین لگایا ہے، پھر دعویٰ تو یہ تھا، کہ ان مباحث مین قرآن مجید اور مستند احادیث کے علاوہ اور کسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے گا، بلکہ احادیث کی حیثیت بھی ثانوی ہوگی، لیکن حال یہ ہے کہ مستند احادیث کا کیا ذکر، زیر بحث قصص و عقائد کی تمام تفصیلات جن پر بحث و اعتراض کی بنیاد ہے، قصص الانبیاء و عرائس المجالس جیسی ادنیٰ درجہ کی کتابون، واقدی جیسے افسانہ گو راوی، اور تفسیرون کی غیر معتبر اسرائیلی روایات سے نقل کی گئی ہین، جو تمام تر نو مسلم یہودیون، اور عیسائیون کے بیانات سے ماخوذ ہین، اور جنھین کوئی بھی معتبر نہین سمجھتا، کلام مجید مین ان افسانون کا کوئی ذکر نہین، اس مین عبرت و بصیرت کے لئے محض صاف سادہ واقعات و عقائد ہین افسانوی تفصیلات یہودیون اور عیسائیون کی اعجوبہ پرستی کا نتیجہ ہین، ان کو کلام مجید کی جانب منسوب کرنا صریح کذب ہے،

باقی جن اسرائیلی قصص اور عقائد مین قرآن مجید اور بائبل کے بیانات مین کچھ اختلاف ہو، تو وہ کلام مجید کی نہین، بلکہ بائبل کی تحریف کا نتیجہ ہے جس کا اعتراف بہت سے ارباب کلیسا تک کو ہے، بلکہ ان کی صحت تک مشکوک ہو، بیت المقدس کی تباہی کے ساتھ ساتھ بارہا جن کتابون کا نام و نشان دنیا سے مٹایا جا چکا ہو، اور پھر مدتون کے بعد زبانی یادداشتون سے دوبارہ ان کی ترتیب عمل مین آئی ہو، اور جو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے ایک صدی بعد زبانی روایات سے مرتب کی گئی ہون، ان کا اور کلام مجید کے مسلمہ تواتر کا کیا مقابلہ، اگر بائبل کے بعض بیانات کو صحیح مان لیا جائے تو انبیاء علیہم السلام کی عصمت تک جس پر مذاہب کی صداقت کا دار و مدار ہے، ختم ہو جاتی ہے، بائبل مین ایسی باتین انبیاء علیہم السلام کی جانب منسوب کی گئی ہین، جو ایک معمولی انسان کے رتبہ سے بھی فروتر ہین، ایسی حالت مین اس کے بیانات کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے، اردو مین اس موضوع پر کافی پرانی کتابین موجود ہین مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حکیم نور الدین قادیانی، مولوی سید محمد صاحب علی گڈھی، مولانا محمد علی صاحب مونگیری، ڈاکٹر وزیر خان صاحب اکبرآبادی کی کتابون مین ڈاکٹر ٹسڈل کے اکثر اعتراضات کے جوابات آگئے ہین لیکن یہ کتابین پرانے مذاق کی ہین، اس زمانہ مین خواجہ کمال الدین، اور پروفیسر سید نواب علی صاحب کی کتابین مفید ہین

یہی وجہ ہے کہ فانی کے کلام مین عشق و محبت کی آتش فشانیان بہت کم نظر آتی ہین، اور درد وغم سے گھبرا کر وہ ہر وقت موت کے آرزومند رہتے ہین،

ان کا مایوس دل بجز ویرانہ سازی کے غالبًا اور کوئی صلاحیت و استعداد نہین رکھتا،

اس دل مایوس کی ویرانہ سازی کچھ نہ پوچھ — اس نے جب اُجڑا چمن تا کا بیابان ہوگیا

شراب کی مستی ان کے ساغر حیات کی تقدیر مین نہین،

خالی لئے بیٹھا ہون تری بزم میں ساغر — مے میرے مقدر مین نہین زہر ہی بھر جا

زہر ہی بھر جا" کے ٹکڑے پر غور کرو، کس حد تک شاعر کے روحانی اضمحلال کا پتہ دیتا ہے، ذوق تشنگی سے ہر شخص لطف نہین اٹھا سکتا، اور نہ اس نکتہ کو سمجھ سکتا، کہ محرومیان ہی روح کا سرمایہ نشاط ہین، ایک طالب صادق کے لئے زہر کی تمنا کبھی جائز نہیں ہو سکتی، لیکن فانی کی زبان سے بار بار یہی صدا نکلتی ہے، ملاحظہ ہو،

دبی زبان سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ — بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

کیا عشق کی سخت کوشی اور جانبازی کا یہی مطالبہ ہے ؟

فانی اپنی زندگی کی تصویر ان الفاظ مین کھینچتے ہین:-

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات — وہ نقش پا ہون جسے کوئی رہگذر نہ ملا

یہ اسی یاس و ناامیدی کا نتیجہ ہے، کہ غزل کی غزل پڑھتے جائیے، دو چار شعر بھی ایسے نہیں ملتے، جو وجدانی کیفیت کے حامل ہون، یا جن کو پڑھ کر دل و دماغ کو کوئی سرور حاصل ہو سکے، چنانچہ وہ خود اپنے افسانہ غم کے اعادۂ پیہم سے گھبرا کر پکار اٹھتے ہین،

یاد ہے فانی تجھے کوئی کہانی اور بھی — ختم کر افسانہ، غم دل پریشاں ہوگیا

فانی کے ذوق محبت کا ماحصل صرف رونا ہے، یا رونے سے فرصت ملنے پر خاموش رہنا ہے، چنانچہ فرماتے ہین،

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہین — جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا

کیا اس اعتراف حقیقت کے بعد فانی کے کلام مین آثار زندگی کی جستجو کامیاب ہو سکتی ہے ؟

غرض مجموعۂ زیر تنقید مین اس قسم کے اشعار بکثرت موجود ہین، جن سے شاعر کی عام روحانی افسردگی و اضمحلال کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے، اس افسردگی اور بے کیفی کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے، کہ فانی کو تمام عمر ناکامیون کا سامنا رہا، اسلئے ان کے کلام مین زیادہ تر یاس و حسرت کے جذبات پائے جاتے ہین، مجھ کو اس سے انکار نہین، لیکن سوال یہ ہے کہ تغزل کی بزم کیف مین خانگی آلام و مصائب کا تذکرہ کس حد تک جائز اور مناسب ہے، ؟ شاعر کو اگر محض اپنی ذاتی ناکامیون کا ماتم کرنا ہے، تو اس کے لئے مرثیہ کا میدان کھلا ہوا ہے، جہان وہ خوب جی کھول کر سینہ کوبی اور گریہ و زاری کر سکتا ہے، کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، لیکن حسن و عشق کی بزم تجلی مین قدم رکھ کر اس کو مرثیہ خوانی کی اجازت نہین مل سکتی، یہ وہ مقام ہے، جہان درد وغم ہی کی لذت سے قلب و روح کی پرورش ہوتی ہے، جہان نزول مصائب پر مرحبا کی صدائین بلند کی جاتی ہین، اور جہان پیچیدگی حیات انسانی کی تمام دشواریان آسان ہو جاتی ہین، اس بنا پر یہ راہ نوحہ خوانون کے لئے نہین، بلکہ ان شوریدہ مزاجون کے لئے مخصوص ہے جو اس نکتہ سے واقف ہین،

عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع
این شرابےست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

آج کل عام قاعدہ یہ ہو کہ جب کسی شاعر کا مرتبہ خاص طور پر بڑھانا ہوتا ہے، تو وہ کسی چیز کا امام بنا دیا جاتا ہو فانی کے کلام مین جب کوئی خاص امتیازی وصف نظر نہین آیا، تو ایک لفظ یاسیات ایجاد کیا گیا، اور فانی کو اس کا امام قرار دیا گیا چنانچہ عام طور پر فانی کا یہ بہت بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، یعنی بالفاظ دیگر وہ بہت روتے ہین، اور خوب روتے ہین، اور ایسا روتے ہین، کہ اس سے گھبرا اٹھتے ہین، شاعری جذبات کی مصوری کا نام ہے، ہمارے نزدیک یاس کوئی جذبہ نہیں، بلکہ تمام جذبات کے فقدان کا نام ہے، جس کو یاس سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لئے اس کی مصوری کسی طور پر شاعرانہ کمال کی دلیل نہین ہوسکتی، خصوصاً ایک غزل گو شاعر کے لئے یاس انگیز خیالات کا ادا کرنا ہمارے نزدیک کسی طور پر نشانِ فخر و امتیاز نہیں بن سکتا،

علاوہ ایک زندہ اور بیدار دل کے ایک غزل گو شاعر کے کلام مین دوسری جس چیز کو میری نگاہ ڈھونڈھتی ہے؟ یہ ہے، کہ اس کے دل مین حسن و عشق کی عظمت، پاکیزگی اور لطافت کا احساس کس حد تک موجود ہے، اور اس کے ترانۂ محبت کی اخلاقی سطح کہان تک بلند ہے، ؟ یعنی وہ جس عشق کا مدعی ہے، اس کی حیثیت صرف ایک مادی مرض کی ہے جس کی صعوبت و تکلیف سے گھبرا کر بیمار موت کے لئے دست بدعا ہو جاتا ہے، یا وہ کیف و انبساط کا ایک ابلتا ہوا سرچشمہ ہے جس کی تلاطم خیز موجون سے آلام و مصائب کی بڑی بڑی چٹانین ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہین ؟

افسوس ہے کہ غزل گو شعرا نے عام طور پر عشق و محبت کی اخلاقی بلندی اور روحانی عظمت کو بالکل نظرانداز کر دیا، اور اسکی چشم و نگاہ کو صرف جلوہ فروشان لب بام کی عشوہ و ادا کے دام فریب مین پھنسا کر چھوڑ دیا، اس تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا، کہ حسن و عشق کی بزم لطیف رفتہ رفتہ ہوا و ہوس کی جلوہ گاہ بن کر رہ گئی، اور محبت کے بلند اور شریفانہ جذبات کو بالاے طاق رکھ کر صرف لفظی شعبدہ پردازی اور بازیگری سے کام لیا جانے لگا،

غور کرو، وہ عشق جس کو نکتہ دان روم نے "طبیب روحانی" کہکر پکارا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہاے ما

جس کے فیضان سے عارفِ شیراز نے متاثر ہوکر حیاتِ ابدی کا ادعا کیا تھا،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کیا اس کے آثار و نتائج یہی ہین، کہ بستر غم پر لیٹے ہوئے کراہا جائے، اور ہر وقت موت کے لئے دعائین مانگی جائین ڈوبی ہوئی نبضین، کٹی ہوئی رگین، پتھرائی ہوئی آنکھین، سسکتی ہوئی لاشین، نیلگون چہرے، زرد آنسو وغیرہ کیا یہی ایوانِ محبت کے نقش و نگار ہین، پست ہمتی، کم نظری، پست خیالی، مرگ طلبی، گریہ و زاری، سینہ کوبی، یاس و ناامیدی، انقباض و افسردگی، ضعف و بےحسی وغیرہ، کیا عشق جو بقاے روح کا سرچشمہ ہے، انہی دل شکن اخلاق کی تعلیم کا علمبردار ہے؟ میت، جنازہ، کفن وغیرہ کیا اس کی بزم کیف صرف انہی چیزون کی نمایش گاہ ہے ؟ غرض اہل لکھنؤ کے ناقص ذوق کی بدولت تغزل صرف ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا جس مین کسی قسم کی زندگی کی حرارت یا تپش باقی نہین رہی،

اس بنا پر سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو کہ شاعر نے عشق کو کس نگاہ سے دیکھا ہے، یعنی وہ اس حقیقت سے باخبر ہو کہ نہین،

کہ عشق فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ لطیف، سب سے زیادہ نازک، سب سے زیادہ بلند اور شریفانہ جذبہ ہے، وہ فضائل اخلاق کا سب سے بڑا معلم، اسرار و حقائق کا سب سے بڑا مبصر، اور رزمگاہِ حیات کا سب سے بڑا مجاہد ہے، وہ اپنے اندر ذوق و شوق کیف و سرور اور روحانی انبساط کا ایک نامحدود عالم رکھتا ہے، وہ کسی حالت میں کبھی مایوس نہیں ہوتا، وہ ناکامیوں اور محرومیوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہو، شدید سے شدید مصائب بھی اس کے پائے استقلال کو متزلزل نہیں کرسکتے، غم میں اس کو لذت محسوس ہوتی ہے، درد اس کے لئے ہمیشہ پیام راحت بن کر اٹھتا ہے، وہ خلوص و ایثار، غیرت و استغناء، عزت نفس اور خودداری کی مجسم تصویر ہے، جس میں ابتذال کا کوئی رنگ نظر نہیں آتا، غرض وہ ایک ایسی اکسیر ہے جو کفر کو ایمان اور جسم کو جان بنا دیتی ہے،

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد   کفر آوردم و درعشق تو ایمان کردم

فانی کو قدرت نے بے شبہہ شاعرانہ دل و دماغ عطا کیا تھا، ان کی نگاہ بھی سطحی اور عامیانہ نہ تھی، لیکن ان کی سب سے بڑی بدنصیبی لکھنؤ کا قیام تھا، جس کی وجہ سے اُن کے قالبِ سخن میں زندگی کی روح پیدا نہ ہوسکی، اور گریہ وزاری میں وہ اس طرح محو ہوئے کہ ان کو عشق کی سرور آفرینیوں کا کبھی خیال تک نہ آیا، چنانچہ اُن کی غزلوں میں لکھنویت کا یہ عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے،

اہلِ لکھنؤ کی طرح اُن کے نزدیک بھی عشق ایک مرض ہے، جس سے بچنے کے لئے دست بدعا ہیں،

عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانی   زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

ظاہر ہے کہ جب ایک شخص عشق کو مرض سمجھ رہا ہے، تو وہ کیونکر اس کے درد و غم کی تلخی کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کرسکتا ہے؟ یہ اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے، کہ فانی کو کبھی رونے سے فرصت نہیں ملتی، اور ہمیشہ اس کو موت کی آرزو رہتی ہے،

سوزِ عشق اربابِ حال کے نزدیک انوار روحانی کا سرچشمہ ہے، چنانچہ ایک محرم اسرار ان الفاظ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہے،

تونے یہ اعجاز کیا اے سوزِ پنہاں کردیا   اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جاں کردیا   (اصغر)

لیکن فانی کے دل سے اس شعلۂ جاں پرور کے لئے بجائے آفرین کے بددعا نکلتی ہے،

آپ ہم اپنی آگ میں اے غم عشق جل بجھے   آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

دردِ عشق اہلِ نظر کی نگاہ میں سراپا ذوق و لذت ہے، لیکن فانی اس سے بھی پناہ مانگتے ہیں، اور اپنی مایوسی اور عجز و بیکسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

اے دردِ عشق اب تو خدا کے لئے نہ چھیڑ   دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی

کیا عشق کی ہمت و غیرت کا یہی تقاضا ہے؟

محبت ہر رگ و پے میں زندگی کی روح بھر دیتی ہے، لیکن فانی کے ساتھ اس کا یہ حال ہے،

مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گذری ہو   محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

لیکن ہمارے نزدیک رگوں سے لہو کھینچنا محبت کا کام نہیں ہوسکتا، یہ تو مرض کا کام ہے، کہ اندر ہی اندر تمام رگوں سے خون جذب کرکے بیمار کو نزع کے عالم میں پہنچا دے،

ظاہر ہے کہ ایک شخص جس کی زندگی عالم نزع میں گذر رہی ہو، اور جو ہر وقت پیام اجل کا منتظر ہو، یقیناً تجہیز و تکفین

کا سامان بھی مہیا رکھے گا، چنانچہ جنازہ، میت، کفن، لحد، مزار، شمع، وغیرہ ان چیزون کی فانی کے یہان کوئی کمی نہین، چند اشعار نمونۃً ملاحظہ ہون،

کفن اے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے — آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہین نہا کے بدلے

اب آ گئے ہو تو اور اک ذرا ٹھہر جاؤ — ابھی ابھی مری میت اٹھائی جاتی ہے

آئی ہے اے نسیم تو اس وقت تک ٹھہر — جب تک بجھے چراغ ہمارے مزار کا

ہڈیان ہین کئی لپٹی ہوئی زنجیرون مین — لئے جاتے ہین، جنازہ ترے دیوانے کا

غرض اس قسم کے اشعار اس مجموعہ مین بکثرت نظر آتے ہین، جن کی بنا پر کہا جاتا ہے، کہ فانی کے کلام مین درد بہت ہے اور وہ فلسفۂ غم کے بہت بڑے نکتہ شناس ہین، لیکن افسوس ہو کہ ان کے کلام سے ہم کو اس کا بہت کم ثبوت ملتا ہے، اگر درد و غم صرف گریہ وزاری اور سینہ کوبی کا نام ہے، اور یہ کوئی فن ہے، تو بے شبہہ ہم فانی کو اس کا امام تسلیم کرتے ہین لیکن سوال یہ ہے، کہ عشق کے درد و غم کو ان چیزون سے واقعی کوئی نسبت بھی ہے کہ نہین؟ اگر یہ اصول مان لیا جائے، تو پھر غزل گوئی اور سوزخوانی مین کیا فرق رہ جاتا ہے، اور پھر مرثیہ سے کیا کام لیا جاسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عشق کا درد و غم نوحہ گرون کی آہ و بکا کا نام نہین، بلکہ وہ قلب انسانی کی ایک لطیف و پرسوز کیفیت ہے جو کبھی کبھی آنکھون کو پُرنم ضرور بنا دیتی ہے لیکن اسی کے ساتھ روح مین اتنی استعداد و صلاحیت بھی پیدا کر دیتی ہے، کہ زبان آہ و شیون سے آلودہ نہین ہونے پاتی، بلکہ چہرہ پر انتہائی اضطراب کے عالم مین بھی ایک لطیف موج تبسم رقص کرتی رہتی ہے، یہ اسی استعداد و صلاحیت کے فقدان کا نتیجہ ہے، کہ عام غزل گو شعرا کو درد و غم مین کوئی لذت محسوس نہ ہوسکی، اور عشق و محبت کی حقیقی شان خاک مین مل کر رہ گئی،

اس مین شبہہ نہین کہ ایک دردمند دل کو کبھی ایسی بھی محبت کی ٹھیس لگتی ہے، کہ بے اختیار آنکھون سے آنسو ٹپک پڑتے ہین، لیکن ان آنسوؤن کا رنگ زرد نہین ہوتا، بلکہ اُن مین "ستارہ سحری" کی چمک ہوتی ہے، فانی کے اشکِ غم مین ہم نے ستارۂ سحری کی جھلک کی بہت تلاش کی، لیکن افسوس ہو کہ یہان بھی وہی زردی کا عالم نظر آتا ہے،

جانے دل کے لہو پہ کیا گذری — رنگ اشکوں کا زرد رہتا ہو

کیا اشکوں کی زردی اس بات کی دلیل نہین کہ رونے والا کسی نہ کسی مادی مرض مین مبتلا ہے؟ ممکن ہے کہ عقیدت مند نگاہون کو یہ زرد آنسو خوشنما معلوم ہوتے ہون، لیکن ہماری نگاہین تو سرشک شوق کے اسی قطرۂ ناچیز کو ڈھونڈتی ہین، جو کبھی جوش کے عالم مین اچھل کر بحر بیکران بنجاتا ہے، اور کبھی ستارہ سحری بن کر مژہ پر چمکنے لگتا ہے، اور کبھی جس سے پھولون کی ریزش ہونے لگتی ہے.

سرشکِ شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز — اچھالنا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر ڈ دیکھ لے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

دل مین اک بوند لہو کی نہین، ذوق کیا — اب ٹپکتا نہین آنکھون سے گلستان کوئی (اصغر)

غرض چشم عاشق کا اشک غم زہراب کا قطرہ نہین جس سے بیمار کا بستر زرد ہو جاتا ہے،

زہر آب چشم کا کوئی قطرہ گرا تھا کیا — بستر ترے مریض کا دیکھا تو زرد تھا (عزیز لکھنوی)

بلکہ وہ مجسم ایک رشحۂ انوار ہے جس کی تر دستیون سے قلب و روح کا چمن زار دفعۃً لہلہا اٹھتا ہے لیکن اس لطیف

حقیقت کو سمجھنے کے لئے اربابِ نظر کی ضرورت ہے،

اشکِ پیہم کو سمجھ لیتے ہین اربابِ نظر ۔۔۔ حسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں (اصغر)

اشکِ غم کی موجون مین حسنِ یار کی تابانیون کا منظر پیش کرنا مصوّر یا سیاست کے بس کی چیز نہین، یہ صلاحیت بزمِ محبت کے انہی محرمانِ خاص کو نصیب ہوسکتی ہے، جنھون نے اہلِ ذوق کو زندگی کا یہ پرِ اسرار پیام دیا ہو،

اضطرابِ غم سے ہو نشو و نمائے زندگی ۔۔۔ ہر نفس میں ایک تازہ درد پیدا کیجئے (اصغر)

یا جو حیاتِ تازہ کی رنگینیون کی بقا کے لئے مرحلۂ غم کی درازی کی آرزو کر سکتے ہون،

حیاتِ تازہ کی رنگینیان نہ مٹ جائین ۔۔۔ ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے (〃)

لیکن فانی کے دلِ مایوس کو صرف اجل ہی سے آسایش و راحت کی امید ہے،

اجل سے ہے دلِ مایوس کو امید آسایش ۔۔۔ مری ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کی تمنا ہو

وہ موت سے بغیر تقاضا کئے رہ نہین سکتے، کیونکہ وہ غم سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہین، اور یہ آرزو صرف اس لئے ہو کہ ان کو غم مین روح کی تازگی اور سرمستی کا کوئی سامان نظر نہین آتا،

گذرے گی اب نہ غم کا مداوا کئے بغیر ۔۔۔ بنتی نہین اجل سے تقاضا کئے بغیر

جلوہ گاہِ بہار کی رنگینیان افسردہ سے افسردہ دل کو بھی تھوڑی دیر کے لئے جوشِ نشاط سے معمور کر دیتی ہین لیکن فانی کے مایوس دل و دماغ کو اس مین بوے کفن ہی محسوس ہوتی ہے،

چمن سے رخصت فانی قریب ہو شاید ۔۔۔ کہ اب کے بوے کفن دامنِ بہار مین ہو

لیکن ایک سرور آفرین نگاہ کو بہار مین جو کیفیت نظر آتی ہے، اس کی تصویر یہ ہے،

کیا مستیان چمن مین ہین جوشِ بہار سے ۔۔۔ ہر شاخِ گل ہے ہاتھ مین ساغر لئے ہوئے (اصغر)

دردمندانِ محبت کے دیدۂ و دلِ ذوقِ تصور مین انوارِ حیات سے چمک اٹھتے ہین، لیکن فانی اس عالم مین بھی قلب و جگر کی تربت پر فاتحہ خوانی ہی کرتے ہوئے نظر آتے ہین،

اٹھا ہاتھ اسے تصور فاتحہ کو ۔۔۔ یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

عشق کی بزمِ سوز و تجلی مین فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھانا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے، اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہین، یہ شعر اگر ایک سوز خوان کی زبان سے نکلتا، تو بے شبہہ ہم کو اعتراض کا حق نہ تھا، لیکن قلب و جگر کے مدفن پر فاتحہ خوانی دردِ محبت کے لذت شناسون کا ہرگز شیوہ نہین ہو سکتا،

دلِ عشق کے سوز و تپش سے فیضیاب ہو کر زندگی کی ایک موجِ شرر فشان بن جاتا ہے، لیکن فانی کے غم کدہ مین پہنچکر اس کی حیثیت صرف ایک مردہ لاش کی رہ جاتی ہے،

مرحوم کس ادا کے تماشائیون مین تھا ۔۔۔ پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

جس کے ذوقِ محبت کی استعداد و صلاحیت کا یہ عالم ہو، کہ دل بجائے گرم و منوّر اور مست و بیدار ہونے کے جسدِ بے روح بن کر رہ جائے، اور اس کو مرحوم کے لقب سے یاد کیا جائے، وہ جمالِ یار کی برق افگنی کا کیونکر تحمل کر سکتا ہے؟ اور اس کو یہ لطیف حقیقت کیونکر سمجھائی جا سکتی ہے،؟

مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے غرض کہ نشو و نما روح کی اسی میں ہے (اصغر)

درد فراق کا تحمل اور اس سے کیف اندوز ہونا عشق کی روحانی استعداد اور بلند نظری کا بہت بڑا نشان ہے، چنانچہ اس عالم میں بھی اربابِ حال پر ذوق و وجد ہی کی کیفیت طاری رہتی ہے، اور وہ محبوب کی یاد میں اس طرح محو ہو جاتے ہیں اور ان کو کچھ ایسی لذت ملنے لگتی ہے، کہ ان کے دماغ سے شبِ فرقت کی سحر کا تخیل بالکل جاتا رہتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عشق جو ایک ذوق لا انتہا رکا نام ہے، دراصل اس کی شبِ غم کی کوئی سحر نہیں، اس بنا پر اہلِ دل کی زبان دردِ ہجر کے شکووں سے کبھی آلودہ نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ہمیشہ صدائے آفرین ہی نکلتی رہتی ہے، اور ہر ہر قدم پر روحانی ذوق و لذت کا سامان بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ درد مہجوری ہی میں قرب کی دولت ہاتھ آجاتی ہے، یہ اسی روحانی صلاحیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ عام غزل گو شعرا شبِ ہجر میں اس زور شور کے ساتھ آہ و بکا اور نالۂ و فریاد کرتے ہیں، کہ ہمسایوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور سننے والے دعا کرنے لگتے ہیں، کہ کسی طرح ان مصیبت زدوں کی رات کٹ جائے،

ہجر کی شب نالۂ دل یوں صدا دینے لگے سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے (ثاقب لکھنوی)

لیکن ایک طالبِ صادق جو ہر وقت محبوب کے ذوقِ تصوّر سے مست رہتا ہے، اس کو شبِ ہجران کی کیفیت کبھی محسوس نہیں ہوتی،

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت میں نے کبھی روئے شبِ ہجران نہیں دیکھا (اصغر)

حقیقت یہ ہے کہ شبِ ہجر کا تخیل اربابِ ہوس کی ایجاد ہے، ان کا منظورِ نظر صرف شاہد بازاری ہوتا ہے، جو ہاتھ آسکتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر دل میں اس کے وصل اور ہم آغوشی کی مادی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور جب یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ بے چینی اور کرب کے عالم میں رات کٹنے کی دعائیں مانگی جاتی ہیں، لیکن محرمانِ خاص کی چشم و نگاہ کا محبوب حسن و جمال کا وہ پیکرِ لطیف ہے، جو نگاہوں کو مجسم شکل میں کبھی نظر نہیں آسکتا، اس لئے اہلِ ہوس کی طرح ان کے دل میں وصل کی کوئی تمنا پیدا نہیں ہو سکتی، اس کے تصور کی لذت ہی ان کے دل و دماغ کے سرور و نشاط کے لئے کافی ہے، وہ اسی کو اپنے ذوقِ آرزو کی معراج سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے عملکدۂ محبت میں شکوۂ و شکایت اور فریاد و ماتم کی کوئی گنجائش نہیں

افسوس ہے کہ فانی کی یاس پرست طبیعت درد فراق کی لذتوں کے احساس سے محروم ہے، ان کی شبِ فرقت جس طرح بسر ہوتی ہے، اس کی کیفیت خود ان کی زبان سے سنو،

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس پر یہ پوچھ لیتے ہیں جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

شبِ فراق کی لذت الم سے لطف اندوزی کے بجائے قلب و جگر کی خیریت مزاج دریافت کرتے رہنا کیا اس امر کی دلیل نہیں ہے، کہ شاعر محبوب کے ذوقِ تصور کی وارفتگی سے ناآشنا ہے؟ محبوب کی یاد تو وہ ابدی لذت ہے جس کے سامنے عاشق خود اپنی ہستی، اور کائنات ارضی کی تمام رنگینیوں کو بھول جاتا ہے، جگر نے کیا خوب کہا ہے،

آئی جو اس کی یاد تو آتی چلی گئی ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

لیکن فانی کو باوجود ادعائے محبت کے صرف اپنے قلب و جگر کی فکر دامنگیر رہی ہے، جو عشق کی شان ایثار و بیخودی کے بالکل منافی ہے، اگر قلب و جگر میں محبوب کی یاد ہے تو پھر ان کو تو ایک کیف مستقل، ایک سرور دائمی ایک نشاط ابدی کا

سامان ہاتھ آگیا ہے، وہ زندہ ہیں، اور ہمیشہ زندہ رہیں گے، ان کی خیریت دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، خیریت تو ان لوگوں کی دریافت کی جاتی ہے، جو کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوں،

شبِ فرقت میں فانی کے ذوق وشوق کا یہ عالم ہے کہ وہ دست بدعا ہیں، کہ یا تو کسی طرح جلوۂ سحر نمودار ہو، اور یہ نہ ہو تو پھر موت ہی آجائے،

میں دعا موت کی مانگوں تو اثر پیدا کر ورنہ یارب شبِ فرقت کی سحر پیدا کر

یعنی خلاصہ یہ کہ کسی طرح اس مصیبت عظمیٰ سے نجات مل جائے، لیکن جب اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، تو مجبوراً جان دے کر ان تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں،

ہم اپنے جی سے گذرے یوں سحر کی شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی

لیکن افسوس یہ نہ سمجھے کہ شبِ غم کی درازی ہی میں اربابِ حال کے لئے زندگی کی سرمستیوں کا راز پوشیدہ ہے، چنانچہ درد کے کم ہونے پر ایک وارفتۂ محبت کی زبان سے بے اختیار صدائے افسوس نکل جاتی ہے،

کہاں وہ زیست کی لذت کہ درد بھی کم ہے (اصغر)

شبِ ہجر میں فانی اپنی ہمت اور بلند حوصلگی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

شام سے فکر صبح کیا شبِ ہجر مر رہیں گے اگر سحر نہ ہوئی

شام فراق تو فانی کے لئے ایک بلا تھی ہی، روز فرقت بھی تاریکی سے خالی نہیں،

ظلمت افزا ہے ظہور خورشید روزِ فرقت کی سیاہی کو نہ پوچھ

لیکن ایسی چشم بصیرت کو کیا کہا جائے، جس کو خورشید عالمتاب کی شعاعیں بھی منور نہیں کر سکتیں، بلکہ اس کو اور تیرہ و تار بنا دیتی ہیں، کیا یہ روح کے اضمحلال و افسردگی کی انتہا نہیں ہے؟ کیا اسی ذوق نظر سے محبوب کی برق ستم کا ناز اٹھ سکتا ہے؟

دردِ فراق کی شدت فانی کے مرضِ عشق کے کرب و تکلیف کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے، کہ احباب تسلی دینے اور چارہ گر دوائیں لے کر آتے ہیں،

دوست تسلی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا لیجئے آئی زخم جگر پر اور اک تازہ آفتِ مرہم

چارہ گر، دوا، مرہم، احباب کی عیادت وغیرہ کی جس کو ضرورت ہو، اس کی سمجھ میں یہ حقیقت کیونکر آسکتی ہے، دردِ عشق کوئی مرض نہیں، جس کے علاج کے لئے خارجی وسائل کی تلاش کی جائے، بلکہ وہ خود تمام روحانی علتوں کا علاج ہے، اس کو اپنے زخم جگر کے لئے مرہم کی ضرورت نہیں، وہ اسی کو قلب و روح کی سیرابی اور تازگی کا سامان سمجھتا ہے، چنانچہ پیکان یار کی چوٹیں کھا کر وہ بجائے آہ و فریاد کے اپنے جوشِ سپاس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے،

کیا کہئے جان نوازی پیکانِ یار کو سیراب کر دیا دل منت گذار کو (اصغر)

وہ زندگی کی مشکلات میں دوسروں کی نگاہِ کرم کا محتاج نہیں، بلکہ وہ خود آپ اپنا مشکل کشا ہے، اس کو کسی راہبر کی اعانت مطلوب نہیں، وہ خود اپنے سوزِ دل کی روشنی میں منزلِ مقصود کا پتہ لگا لیتا ہے، اس کی فطرت میں خود دستی کا وہ سیلاب پنہاں ہے، جس کی رو ہر سنگ راہ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لیجاتی ہے،

دو دش بہ راہ بہرِ ندارا ہ یگانہ طے کند می نہد بدستِ کس عشق زمام خویش را (اقبال)

لیکن فانی کی نگاہِ یاس ہر وقت چارہ گرون ہی کی طرف لگی رہتی ہے، مگر مریض کی حالت کو دیکھ کر؟
بالآخر زار زار رونے لگتا ہے،

نازک ہے آج حالت شاید مریضِ غم کی کیا چارہ گرنے سمجھا کیون زار زار رو دیا

اور باوجود غریب چارہ سازون کی انتہائی کوشش کے شفا نصیب نہین ہوتی،

مضمحل سعی چارہ گر نہ ہوئی اور شفا قصۂ مختصر نہ ہوئی،

لیکن کوئی علاج کیا کرے، جب ان کے بسترِ علالت سے دھنوان ہی دھنوان اٹھ رہا ہو،

نالہ کیا ہان اک دھنوان سا شامِ ہجر بستر بجا دسے اٹھا گیا

ایسے مریض کا علاج بجز موت کے اور کیا ہو سکتا ہے، چنانچہ خود فرماتے ہین:

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے کیون چارہ ساز تجھ کو امید شفا بھی ہے

لیکن اس حقیقت کو نہ سمجھے کہ درد وغم کا علاج خود اس کی لذت ہے، اور وہ آہ جو اثر کے لئے کی جائے،
عشق کے لئے ننگ ہے،

ہمارے درد والم درد وغم کی لذت ہے (اصغر) وہ ننگِ عشق ہے، جو آہ ہو اثر کے لئے (باقی)

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

سوزنی

جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی (برار)

فارسی کے ہجو نگار شاعر سوزنی کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں، کیونکہ وہ ایک ایسے عہد سے تعلق رکھتا ہے، جس کو بارتھولڈ (ترکستان ۔ص ۳۰) بھی "اسلامی تاریخ کے تاریک ترین صفحات" سے تعبیر کرتا ہے، لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ اُس کے کلام سے جو حبیب گنج لائبریری میں محفوظ ہے، کچھ معلومات حاصل کرکے تاریخ کی اس تاریکی پر روشنی ڈالی جائے،

شاعر کے قیام کے دو مقام تھے، سمرقند اور بخارا، جو ماوراء النہر کے علاقے میں خاص اہمیت رکھتے تھے، یہ علاقہ ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء[۱] میں چغری بیگ بن میکائیل بن سلجوق[۲] (المتوفی ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء) کے ہاتھوں سلجوقی حکومت کے زیر نگین ہوا، لیکن مقامی طاقت پھر بڑھ گئی، اور جیسا کہ تاریخ بخارا[۳] (ص ۳۵) سے معلوم ہوتا ہے، ابراہیم طمغاج خان اور اس کے بعد اوس کا لڑکا نصر خان (ممدوح عمعق بخاری لباب ج ۲ ص ۱۸۸-۱۹۰) حاکم ہوا، موخر الذکر کے بعد خضر خان، جو اُسی کا چھوٹا بھائی تھا، حکومت کرنے لگا، پھر جب اوس کے لڑکے احمد خان (المتوفی ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء) کی حکومت شروع ہوئی تو اوس نے سلجوقی سلطنت سے بغاوت کی، چنانچہ ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۶ھ/۱۰۹۳ء) نے ۴۸۱ھ/۱۰۸۸-۹ء میں اوس پر حملہ کیا، اور اسے گرفتار کرکے خراسان میں کچھ عرصے تک رکھا، لیکن بعد میں معاف کردیا، اور دوبارہ ماوراء النہر کی حکومت اُس کے سپرد کردی، اس احمد خان[۴] یا سلیمان خان کے متعلق کچھ اور علم نہیں، اسی طرح اس کے لڑکے ارسلان خان محمد کے حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں، لیکن تاریخ بخارا (ص ۶۱ س ۸، ص ۶۲، س ۱۱) سے اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ اوس نے ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں بخارا میں جامع مسجد بنوائی، اور ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء میں منبر و محراب وغیرہ بنوائے، اسی تاریخ (ص ۳۰ ۔ س ۶-۷) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء (جب کہ ابو نصر احمد بن محمد نے اس تاریخ کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا) کے چند سال قبل اسی ارسلان خان محمد نے بخارا کے ویران قلعے کو آباد کرنے کا حکم دیا تھا، ان سنین کے بعد اس حاکم کے متعلق تاریخیں پھر خاموش ہیں،

۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء سے ۵۲۶ھ/۱۱۳۲ء تک سمرقند کا حاکم قلیج طمغاج حسن[۵] بن عبد المومن المعروف بہ "حسن تگین" تھا، اور بخارا کا حاکم ۵۳۴ھ/۱۱۴۰ء میں امیر زنگی علی خلیفہ پایا جاتا ہے، جو سنجر سلجوقی (م ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) کا باج گذار تھا، اور اسی وجہ سے اُس سال خوارزم شاہ نے

---

[۱] تاریخ ماوراء النہر از محمد تقی خان حکیم ص ۷ بمبئی ۱۳۱۰ھ [۲] اخبار الدولۃ السلجوقیہ (ص ۲۹ لاہور ۱۹۳۳ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ چغری بیگ کی وفات ۴۵۲ھ میں ہوئی لیکن روضۃ الصفا (ج ۴ ۔ص ۱۲۴ ۔لکھنؤ ۱۹۱۵ء) میں اس کے لڑکے قاورد کی تخت نشینی جو اس کے انتقال پر ہوئی ۴۵۱ھ میں بتائی گئی ہے [۳] تاریخ بخارا دراصل ابوبکر محمد بن جعفر (م ۳۴۸ھ/۹۵۹ء) کی عربی تالیف ہے، اس کا فارسی ترجمہ ابو نصر احمد بن محمد نے ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء میں کیا، پھر ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء میں محمد بن زفر نے اس کو ملخص کیا، اب مفید حواشی کے ساتھ یہ کتاب ایران سے شائع ہوئی ہے، [۴] تاریخ مذکور (ص ۲۰۶، س ۱-۳) سے ظاہر ہے کہ وہ احمد خان تھا جس پر ملک شاہ نے حملہ کیا تھا، لیکن روضۃ الصفا (جلد ۴ ص ۱۰۰) میں منقول ہے کہ سلیمان خان پر حملہ ہوا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں، اور پورا نام سلیمان خان احمد ہوگا، جس طرح کہ اس کے لڑکے کا نام ارسلان خان محمد تھا [۵] لباب الالباب ج ۱ ص ۴۰۵ [۶] غالباً اسی طمغاج خان کے وزیر علی (جس سے خطیبی خاندان قائم ہوا)

حملہ کرکے اُسے قتل کر دیا تھا[1]، اس کے دو سال بعد یعنی ۵۳۶ھ/۱۱۴۲ء میں گورخان ختائی نے سنجر کو شکست دی، اور بخارا کے بعض جلیل القدر علما و امرا مثلاً حسام الدین عمر بن عبد العزیز بن مازہ کو قتل کر دیا، اور الپ تگین کو وہاں کا حاکم مقرر کیا[2]، گورخان کے انتقال کے ایک سال بعد یعنی ۵۳۸ھ/۱۱۴۴ء میں غز ترکوں نے بخارا پر حملہ کیا، اور وہاں کے امرا قراچہ بیگ اور معین الدولہ کو قید کر لیا، اور شہاب وزیر کو قتل کر دیا[3]، ان ترکوں کی طاقت اسی واقعہ کے بعد بڑھنے لگی حتی کہ اُنھوں نے ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء کے آخر میں جیسا کہ مشہور ہے، سنجر ہی کو قید کر لیا، اس غیر متوقع شکست سے سلجوقی طاقت کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے خراسان میں بھی اپنا تسلط قائم کرکے مختلف امرا کے تحت حکومت کی، ان کے متعلق معارف (بابت ستمبر، اکتوبر ۴۲ء) میں انوری کے سلسلے میں ہم کچھ تفصیل دے چکے ہیں،

۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء میں ترکوں کے ایک دوسرے گروہ قرلق نے بخارا پر حملہ کیا، لیکن ختائی حاکم جغری خان بن حسن تگین کی مدد سے شمس الدین محمد بن حسام الدین عمر نے ان کو پسپا کر دیا[4]، غالباً یہی جغری بیگ (یا اس کا بھائی ؟) تھا جو رکن الدین مسعود کے نام سے مشہور ہے، اور جس نے ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء میں بخارا میں ایک نیا ربض بنوایا تھا[5]، اس کے بعد ایک عرصہ تک پھر تاریخ ہماری رہبری نہیں کرتی، آخر کار عوفی[6] سے معلوم ہوتا ہے، کہ قلیج طمغاج خان ابراہیم بن حسین ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء میں ماوراء النہر کا حاکم تھا، اور مرزا قزوینی کا خیال ہے، کہ اُس کا انتقال ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء میں ہوا، اور اس کا لڑکا ارسلان خان عثمان ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء میں قتل ہوا، یہ ایلک خانی سلسلے کا آخری حاکم تھا، ان مختصر حالات سے جو سوزنی کے عہد کے متعلق ہمیں معلوم ہوتے ہیں کسی قدر ہماری رہبری ہوگی، چنانچہ اب ہم اُس کے کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو حبیب گنج میں محفوظ ہے،

سوزنی کا قدیم ترین قصیدہ ارسلان خان محمد بن سلیمان کی مدح میں ملتا ہے، جو چھٹی صدی ہجری کے پہلے رُبع میں بخارا کا حاکم تھا، اُس کا اور اس کے وزیر سعد الملک کا تذکرہ ان اشعار میں ہے :-

وزیر شاہ بہ دیدار پہلوان بہ عروش	گرفت داد بہ پیمان و دوستی دل و ہوش
بموسم گل و بلبل ز جام و بلبلہ کرد	شرابِ گلگون از جام گلعذاران نوش
ہمہ سعادتِ دستورِ شاہ سعد الملک	ہمہ سلامتِ ایام پہلوان بہ عروش

(بقیہ حاشیہ ص ۶۷) کے متعلق عثمان مختاری (المتوفی ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء یا ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء) کے دیوان مخطوطہ بانکی پور (ورق ۱۲۶ اب - ۱۳۰ا) میں یہ اشعار ملتے ہیں :- خدائے داد دو ملک تمام را دو نظام | یکے جلال وزیران یکے رضی امام

یکے بہ خدمتِ سلجوقیان رسیدہ بہ فر	یکے بدولت طمغاج خان سیدہ بکام
ہمیشہ ملک خراسان بر آن مقوم بود	چنان کہ ملک سمرقند ازین گرفتہ قوام
ہمہ جلالِ خراسان و ماوراء النہر	ز بو علی بنظام آمد و علی نظام
بدان ستودہ ہمہ دودۂ سحاقی فخر	وزین گرفتہ ہمہ گوہر خطیبی نام

ان اشعار میں ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک ابو علی حسن بن علی بن اسحق اور سمرقند کے وزیر علی کا ذکر ہے،

[1] تاریخ بخارا ص ۳۰، [2] ،، ۳۰، [3] ،، ۳۳، [4] لباب جلد ا ص ۳۳۲، [5] تاریخ بخارا ص ۲۲، [6] لباب جلد ا ص ۴۴، [7] رض ۳۰۲ مرزا قزوینی نے ارسلان خان عثمان کے قتل کی تاریخ میں ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء بتایا ہے، لیکن تاریخ بخارا (ص ۳۱) میں لکھا ہے کہ محمد خوارزم شاہ نے بخارا پر ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں قبضہ کیا جس سے ایلک خانی حکومت ختم ہوئی، اور ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء میں چنگیز خان نے بخارا کو ویران کیا،

بہ قہر دشمن خاقان شہ سلیمان فر	کشید صف صف اہرمنان آہن پوش
محمد ابن سلیمان کہ چون سلیمان وار	مسخرانہ ورا جن وانس (طیر) و وحوش
زاو زکند می آمد کہ فتح نامہ رسید	بدست پیک سلیمان زاوزکند بہ اوش

پھر حسام الدین عمر (بن برہان الدین عبد العزیز بن مازہ) کی مدح مین ایک قصیدہ ملتا ہے جس مین اُسے (سنجر کا ؟) سپہ سالار کہا گیا ہے، دو شعر یہ ہین،

حسام الدین والدنیا سپہ سالار ترکستان	کہ در (لشکر ؟) تو ئی بے شک زایران رستم دستان
سمر قندی بہ عدل تو بہ ترکستان چنان دانم	کہ ترکستان سمر قند و سمر قند ست ترکستان

ہم دیکھ چکے ہین کہ اس حسام الدین کا قتل سنہ ۵۳۶ھ ۱۱۴۲ء مین ہوا تھا، اس کے بعد اس کا لڑکا شمس الدین محمد بخارا کی حکومت کے لئے خطائی سلطان کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، اور وہ سنہ ۵۵۹ھ ۱۱۶۴ء تک ضرور زندہ تھا، جب کہ اوس نے قرلق ترکون کو پسپا کیا تھا، اوس کی اور اس کے امیر جغری خان بن حسن تگین، کی مدح مین بھی سوزنی کا ایک قصیدہ ملتا ہے، جو لباب الالباب (جلد ۲ ص ۲۳۳) مین منقول ہے :-

شاہ جہان بہ صدر جہان شاد و خرم است	جاوید باد شاہ بہ شادی و خرمی
سلطان علم و دین و دنیا ہم آن تست	چون نیک خواہ دولت شاہ معظمی
در مدح تو بصورت تضمین ادا کنم	یک بیت رود کی را در حق بلعمی،
"صدر جہان جہان ہمہ تاریک شب شدست	از بہر ما سپیدہ صادق ہمی دمی"
از حشمت تو بے ربض و خندق و سلاح	سد سکندر است بخارا ز محکمی
حق کے گذاشتے کہ بخارا ے چون بہشت	ویران شدے بحملہ ٔ شتے جہنمی
شمس حسام برہان دانی کہ تو کئی	درد بخاریان را درمان و مرہمی

اسی جغری خان (یا اوس کے بھائی ؟) کا نام رکن الدین مسعود تھا، اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہین، اُس نے سنہ ۵۶۰ھ ۱۱۶۵ء مین بخارا مین نیا ربض بنوایا تھا، لیکن ہم کو اس کے عہد کے متعلق مزید علم نہین ہے تاہم ایک قصیدہ سے اس کی گورنری کے تقرر کا حال اور اس موقع کی تہنیت ظاہر ہے، اس کے چند اشعار یہ ہین :-

بہ تخت ملک فریدون جلوس شاہ جہان	بہ از جلوس فریدون کیان ملک....
. . . .	. . . .
شہ ملوک و سلاطین شرق رکن الدین	کہ حاتم است بہ بذل و بہ عدل نوشروان
ابو المظفر مسعود بن حسن شہ شرق	کہ ہست نام وے اصل سعادت واحسان

---

۵ مخطوطہ حبیب گنج، ۱۳۰ - ب ۵۲ ،، ۱۳۰ ۵۳ اس قصیدہ کے پانچوین شعر مین بخارا کو بے ربض و خندق کہا گیا ہو محض شاعرانہ خیال ہوگا، تاریخ بخارا (ص ۴۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ بخارا کا ربض سب سے پہلے ۲۳۵ھ ۸۴۹ء مین بنوایا گیا تھا، پھر ارسلان خان نے بھی اپنے عہد مین ایک نیا ربض بنوایا، اور سنہ ۵۶۰ھ ۱۱۶۵ء مین دوسرا بنوایا گیا، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا،

قوی دل اند سمرقندیان بہ دولتِ تو — رونده برره فرمان تو بجسم و بجان[۵۱]

ایک دوسرے قصیدے مین جو اسی رکن الدین مسعود کی مدح مین ہے، ارسلان خان محمد کی شان و شوکت کو شاعر یاد کرتا ہے

زنور طلعتِ او فرّ ارسلان خانی — ہمی شود چو خیال اندر آئینہ پیدا

خدایگان جہان شاہ شرق رکن الدین — کز دست شہر سمرقند جنت الدنیا

اسی رکن الدین مسعود کے وزیر سعد الملک مسعود کے عہدۂ وزارت حاصل ہونے پر شاعر ایک قصیدہ لکھتا ہے، اور اس کی تاریخ بھی دیتا ہے، جو کہ ہم کو پہلی بار معلوم ہوتی ہے یعنی محرم ۵۶۰ھ، مطابق نومبر ۱۱۶۴ء وہ قصیدہ یہ ہے :-

رسیده ماه محرم بہ سال پانصد و شصت — بہ بارگاه وزیر خدایگان بنشست

کہ تا نظر کند اندر جمالِ طلعتِ او — کہ ہیچ شہ را مانند او وزیرے ہست

. . . .

ہر وزیران صدر بزرگ سعد الملک — کہ سعد اکبر ناظر بود بدو پیوست

در سعادتِ نام خدایگان مسعود — کشاد بخت مساعد بہ ہر کہ نتوان بست

اسی موقع پر ایک اور قصیدہ لکھتا ہے :-

وزیر شاه سعد الملک مسعود — چو سعد آباد کرد از کوے محمود

کہ سعدین فلک مسعود گشتند — ز سعد آباد و سعد الملک مسعود

فلک مسعود را کوے عطا داد — ملک تخت سلیمان ابن داؤد

ز سعد الملک سعد الدولہ اسعد — شده آوردن معدوم موجود

بصدر مسند پدر و جد شاه — نشست این پاک اصل و پاک موجود

. . . .

بہ اقبال شہنشاہ معظم — شد اندر ہر دلے محبوب و مودود

رکن الدین مسعود بن قلیچ طمغاج "حسن تگین" کے اسی وزیر سعد الملک مسعود کی مدح مین ایک اور قصیدہ ہے جس میں شاعر نے اس کو ارسلان خان محمد بن سلیمان (جو چھٹی صدی ہجری کے پہلے ربع مین بخارا کا حاکم تھا) کے وزیر سعد الملک فخر الدین کی (نسبی) یادگار کہا ہے :-

اے ز سعد الملک فخر الدین جہان را یادگار — بر جہان واری بہ پا باش سعد الملک وار

بختِ مسعود قلیچ طمغاج خان مسعود کرد — نام مسعود ترا القاب سعد الملک یار

تا بنام خسرو سعد اختر مسعود بخت — بر تو سعد الملک شد ملک سعادت اقرار

پھر برہان الدین عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز بن مازه کی مدح مین کئی قصیدے ملتے ہین، یہ شخص "صدر جہان" کے لقب سے مشہور تھا، عوفی نے جوامع الحکایات مین ہر جگہ اُسے "سلطان دستار داران جہان" کہا ہے، اور اسی کے فرزند سیف الدین محمد کے عہد (۵۶۷ھ) مین لباب الالباب لکھی ہے، ۵۶۲ھ/۱۱۶۷ء مین محمد بن زفر بن عمر نے اسی صدر جہان کے[۵۲]

---

[۵۱] ورق ۲۸ ب ۲۸ و [۵۲] تاریخ بخارا مطبوعہ ایران کے مصحح مدرس رضوی نے مقدمہ (ص ط) میں اس خلاصہ کا

تاریخ بخارا کا خلاصہ کیا تھا، اس کی مدح کے ایک قصیدے مین سے چند اشعار یہان نقل کئے جاتے ہین :-

دارم ہوای آن کہ پُر از در کنم دہان — تا از ثنای صدر جہان پُر کنم جہان

صدر جہان کہ صدر جہان پایگاہ اوست — وز پایگاہ او بہ فلک بر شدن توان

برہان دین کہ ہست بہ بستان شرع دین — برہان سبق، حسام نظر، سیف حکمران

حکمے کہ او کند، خط فرمان کہ او کشد — نتوان گذشت از آن کہ از آن سوست لامکان

شہ را خجستہ فال بدیدار روے اوست — واندر جہان خجستہ تر از فال شہ بدان

بے خاندان برہان ور دین شکوہ نیست — زو با شکوہ تر نے در ین دین و خاندان

زین آستان کہ تا حرم کعبہ اہل علم — شاگرد دودمان وے اند اینت دودمان

اس قصیدہ کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرع مین شاعر نے ممدوح کے والد حسام الدین عمر اور فرزند سیف الدین محمد کے القاب کی رعایت رکھی ہے[۵۴] لیکن افسوس ہے کہ ہم کو تاریخ سے برہان الدین عبدالعزیز کے عہد کے متعلق سوائے محمد ابن زفر کی تاریخ بخارا کے سال کے اور کچھ معلوم نہین ہوتا، ممکن ہے کہ سوزنی نے اس کا صرف ابتدائی عہد پایا ہو، کیونکہ دولت شاہ اور پھر پروفیسر براؤن (ج ۲، ص ۳۴۴) نے شاعر کے انتقال کا سال ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء لکھا ہے، اور یہ تاریخ قرین قیاس اس لئے ہے کہ ہم اُسے قرن ششم کے پہلے ربع ہی سے مدح سرائی مین مشغول پاتے ہین، اور اس ممدوح کے بعد اس کا کوئی کلام تاریخی شہادت پیش نہین کرتا، ممکن ہے کہ آیندہ کوئی مکمل نسخہ کہین مل جائے، اور مزید معلومات حاصل ہو سکین،[۵۵]

(بقیہ حاشیہ ص ۷۰) سال یہی بتایا ہے، لیکن میرزا قزوینی نے (لباب۔ جلد ۲ ص ۳۴۴) ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء لکھا ہے، برہان الدین صدر جہان ایک اور رئیس اسی خاندان کے تھے، یعنی محمد بن احمد بن عبدالعزیز بن مازہ جو ۶۱۶ھ مین قتل ہوئے، لیکن سوزنی کے ممدوح یہ نہ ہونگے ورنہ پھر اس کی بہت عمر قرار دینی جائے گی، [۵۴] سوزنی نے حسام الدین، سیف الدین اور تاج الدین (عمر بن مسعود بن احمد بن عبدالعزیز بن مازہ ؟) کے القاب کی رعایت برہان الدین "صدر جہان" کی مدح کے ایک اور قصیدے مین بھی کی ہے، وہ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

صدر جہان بحضرت شاہ جہان رسید — با کام و ناز سوے فلک کامران رسید

[۵۵] لباب جلد ۲ ص ۱۹۴ مین سوزنی کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

مژگان بغمزہ بر دل مجروح من نمک — وز من بقبلہ بد مکن اے قبلہ ریمک

اس کا نوان شعر اس طرح ہے :-

زین زمانہ آنکہ شد از اہل این خطاب — اے آدمی بصورت و باسیرت ملک

لیکن حبیب گنج کے نسخہ مین اس طرح ہے :-

فرزانہ فخر دین کہ شد از اہل دین خطاب — کاے آدمی بصورت و باسیرت ملک

اور یہی قرات صحیح معلوم ہوتی ہے، اس ممدوح کا حال تو معلوم نہین لیکن قصیدے کی ترصیع دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ کلام شاعر کے آخری دن کی یادگار ہوگا، لباب جلد ۲ ص ۱۹۶ مین ایک اور قصیدہ ملتا ہے، جس کا ممدوح بھی پردۂ خفا مین ہے :-

سپہر فضل علی افتخار دین کہ بدو — کند تفاخر دین پیمبر تازی

مطبوعات جدیدہ

اخبار مجموعہ مترجمہ جناب مولوی محمد زکریا صاحب مائل تقطیع بڑی ضخامت ۲۸۰ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے؍ غیر مجلد ۱۲؍ پتہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

اندلس کی اسلامی فتوحات اور اس کی ابتدائی تاریخون مین ایک مستند تاریخ "اخبار مجموعۃ فی فتح الاندلس و ذکر امرائہا رحمہم اللہ و الحروب الواقعۃ بہا بینہم" ہے اس کو ایک اسپینی مستشرق امیلولا فوانتی نے ۱۸۶۷ء مین تصحیح مقدمہ اور اسپینی ترجمہ کے ساتھ میڈرڈ سے شائع کیا تھا، لیکن اصل مصنف کا نام و نشان کچھ معلوم نہین، مقدمہ اسپینی زبان مین ہے، ورنہ شاید کچھ پتہ چلتا یہ کتاب ہمارے کتب خانہ مین بھی موجود ہے، ہم نے عرصہ ہوا تاریخ بنی امیہ کی تالیف کے سلسلہ مین مختلف فہرستون اور کتابون کے ذریعہ مصنف کا نام معلوم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا، سب اس کے مصحح اور مترجم امیلولا فوانتی ہی کا نام لکھتے ہین حتی کہ تاریخ اندلس کے مشہور عالم محقق ڈوزی نے بھی اپنی تاریخ اندلس کے ماخذون مین کتاب کا نام تو لکھا ہے لیکن مصنف کا نام ظاہر نہین کیا، لیکن اس کے انگریزی مترجم گریفن اسٹوکس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ڈوزی نے اپنی کتاب تحقیقات اور ابن العذاری کی کتاب البیان المغرب کے مقدمہ مین اس پر روشنی ڈالی ہے لیکن راقم ان دونون کے مطالعہ سے محروم ہے، کتاب کی عبارت اور طرز تحریر شاہد ہے، کہ وہ یقیناً کسی قدیم مسلمان مصنف کی تصنیف کی ہے اور اندلس کی ابتدائی تاریخ کے معتبر ماخذون مین ہے، جناب مولوی زکریا صاحب مائل نے اردو مین اس کا ترجمہ کیا ہے ترجمہ صاف و سلیس ہے، کتاب کے شروع مین لائق مترجم کے قلم سے اسلامی اندلس کی تاریخ اور اس کے ماخذون پر مفید تبصرہ ہے، مترجم نے کتاب کا نام "اخبار مجموعۃ فی فتح الاندلس" لکھا ہے ص ۵۲ جو صحیح نہین ہے، صحیح نام اخبارٌ مجموعۃٌ تنوین کے ساتھ ہے، دونون مین اضافت نہین، بلکہ صفت و موصوف کی ترکیب ہے، اضافت عربی قاعدہ سے بھی غلط ہے، اور اصل کتاب مین بھی نہایت واضح طور پر اعراب موجود ہے، اردو مین اس کا نام اخبار مجموعہ کے بجائے مجموعۂ اخبار زیادہ صحیح ہوتا، خیر یہ تو ایک جزوی فرد گذاشت ہے، نفس کتاب کا ترجمہ اردو مین اندلس کی تاریخ پر ایک مفید اضافہ ہے،

ملک محمد جائسی مولفہ جناب سید کلب مصطفےٰ صاحب بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے؍ پتہ انجمن ترقی اردو، نئی دہلی،

ملک محمد جائسی بھاشا زبان کے ان باکمال شاعرون مین تھے، جن کی مثال ہندو شعرا مین بھی مشکل سے مل سکے گی، ان کی مشہور مثنوی پدماوت کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس سے عوام و خواص سب یکسان لطف اندوز ہوتے ہین لیکن اس نامور شاعر کے حالات بہت کم معلوم ہیں، تذکرون اور کتابون مین بھی ان کی شاعری کے علاوہ ان کے حالات محض برائے نام ملتے ہین، ان کے ایک لائق ہم وطن نے بڑی تلاش و جستجو سے حالات فراہم کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے، اس مین ملک محمد جائسی کے ضروری حالات، ان کی تصانیف کا ذکر، پدماوت کے قصہ کا خلاصہ اس کی تاریخی حیثیت پر تنقید اور اس کی شاعرانہ خوبیون کی پوری تفصیل اور مصنف کی ایک دوسری نظم اکھر وٹ اور آخری دور کے کلام پر مختصر تبصرہ ہے، ضمناً بھاشا زبان اور اس کی شاعری کے متعلق بہت سے مفید معلومات آگئے ہین، یہ کتاب مفید و دلچسپ اور بھاشا کی شاعری اور اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۵٦ ماہ ربیع الثانی ۱۳٦۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۵ء عدد ۴

مضامین

شذرات | سید سلیمان ندوی، | ۷۳-۷۴

خطبۂ صدارت | " | ۷۵-۸۰

عرفانیاتِ فانی | جناب مرزا احسان احمد صاحب ایڈوکیٹ اعظم گڈھ | ۸۱-۹۲

کیا مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے؟ | جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی | ۹۳-۹۵

مطبوعاتِ جدیدہ | | ۹٦

شذرات

خاکسار تین ماہ کے سفر مدراس و بمبئی وحیدرآباد دکن و وردھا و بھوپال سے مارچ کے وسط میں واپس آیا، مدراس میں اواخر دسمبر ۱۹۴۴ء میں مورخین ہند کی کانفرنس تھی، جس کے ایک شعبہ کی صدارت کے لئے مدراس کا سفر کیا گیا،

یہ ظاہر ہے کہ کسی شعبہ کی صدارت کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار کرنا، اور پھر صحت کی خرابی کی حالت میں کسی نئے حصول غرض سے نہ تھا، بلکہ ان تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لئے تھا، جن سے اب تک چشم پوشی برتی گئی ہے، اور جن کے اظہار کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا،

یہ خوشی کی بات ہے کہ اس خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے اس کو کانفرنس کے سمجھدار لوگوں نے اچھی طرح سمجھا بلکہ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سر ندرنا تھ سین نے اپنے صدارتی خطبہ میں خود بھی ادھر اشارہ کیا، اور ابھی ۵ ۲ مارچ کو ہندوستانی کلچر الہ آباد کی صدارتی تقریر میں سر تیج بہادر سپرو نے "حقیقی تاریخ" کے عنوان سے اسی مقصد کو ظاہر کیا ہے،

مدراس کے بعض دوسرے مقامات میں بھی تقریریں ہوئیں، ویلور و پیٹا م میں تقریر کا عنوان "ملّتِ محمدیہ کی حقیقت" اور دارالسلام عمرآباد میں عبدیت تھا، دارالسلام کی مسجد میں دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی ہوئے، پریم پیٹ میں بھی صبح کو ایک مسجد میں قرآن پاک کی بعض سورتوں کا درس ہوا،

بمبئی کا سفر وہاں کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر ہوا، ۱۸ رصفر ۱۳٦۴ھ کی رات کو جمعیۃ العلماء مذکور کی صدارت کا خطبہ

پڑھا گیا جس میں سورۂ الحمد کی تفسیر کے ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ تھا، شہر میں انجمن اسلام ہال میں اردو پر، اور صابو صدیق ہال میں ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت کے موضوع پر، اور احباب کے ایک مخصوص مجمع میں توبہ و انابت کے صحیح طریق پر تقریریں کی گئیں،

حیدرآباد دکن کے سفر میں خرابی صحت کی بنا پر قصداً تقریروں سے احتراز کیا گیا، صرف سکندرآباد کے نوجوانوں کے ایک مختصر سے مجمع میں اصلاح کے بنیادی طریق پر گفتگو کی گئی جس کو اکثر نوجوانوں نے پسند کیا،

دروھا کا سفر ہندوستانی زبان کے مشورہ کی غرض سے ہوا، میں نے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیا، اور یہ عرض کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہئے جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے، اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی مذہبی و تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا مانند عربی و فارسی و ترکی ہونے سے کوئی چارہ نہیں ہے اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے، اس کے بعد یہ عرض کیا گیا کہ زبان کے لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے، اب اس وقت ہماری زبان میں عربی و فارسی ہندی سنسکرت اور انگلش کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے وہی ہماری زبان کا صحیح لفظ ہے، افسوس ہے کہ رپورٹروں نے لوگوں کی صحیح تقریریں چھاپنے کا بندوبست نہیں کیا،

عرب ریاستوں کی وحدت کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں اب تک صرف علمی و ادبی و اقتصادی خیالات ظاہر کئے گئے تھے لیکن بعض مصلحین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے قانون کو اگر یہ سب اختیار کریں تو یہ وحدت کا بہترین ذریعہ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ریاستیں اس تجویز کو منظور کرلیں تو یہ عربی وحدت کا حقیقی مظہر ہوگا، اور پوری دنیائے اسلام اس کی پشت پر ہوگی، خدا کرے کہ عرب مسلمانوں کی نظر توجہ لندن و نیویارک سے ہٹ کر اگر پھر مکہ اور مدینہ پر پڑنے لگے تو ان کی دوسری زندگی پھر ان کی پہلی زندگی کی طرح دنیا کی قوموں کے لئے زندگی کا نیا پیغام پیش کردے جس کی دنیا کو اس وقت بڑی ضرورت ہے،

پچھلے تین مہینوں کے پرچوں کی ترتیب اور شذرات کی تحریر کا کام ہمارے رفیق مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے کیا ہے، اب معارف کا کام زیادہ تر وہ اور مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی کرتے ہیں، امید ہے کہ آیندہ بھی اس بوجھ کو وہی دونوں اٹھائیں گے۔ اور میرے لیے یہ بڑی طمانیت کا باعث ہے،

معارف کی ضخامت کی کمی کا غم اپنے ناظرین کے ساتھ خود رسالہ کے مدیروں کو بھی ہے، اب تک سرکار سے اجازت ملنے کی جو کوششیں کی گئیں، وہ ناکام رہیں، اب مرکزی حکومت میں کوشش کی جارہی ہے انجام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے،

نئے سال کی کتابوں میں مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی کتاب اشتراکیت اور اسلام چھپ کر شائع ہوگئی ہے، کتاب گو مختصر ہے مگر تحقیق اور استناد سے لکھی گئی ہے، اس لئے امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔

مقالات

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطی (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء)

اجلاس

آل انڈیا ہسٹری کانگریس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۴۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رفیقو! ممنون ہون کہ آپ نے اپنی مجلس مین اس کرسی پر مجھے جگہ دی، آپنے اس انتخاب سے اپنے دستور کی کئی دفعون کو توڑا ہے، آپنے یہ کرسی ایسے شخص کو دی ہے جس کو آپ کی یونیورسٹی برادری سے دور کا لگاؤ بھی نہین، بلکہ اس نے آپکے اسکول در کالج مین ایک منٹ کے لئے بھی قدم نہین رکھا، اور وہ سرتاپا مشرقی درسگاہون کا پروردہ اور نمایندہ ہے، اس لئے اس اعزاز کے لئے اوس کا انتخاب آپ کی رواداری اور دل کی بڑائی کا بہت بڑا ثبوت ہے، آپنے اس طرح میرا حوصلہ بڑھایا ہے جس کا دل سے شکرگذار ہون، اور اس کو اس کے لئے نیک خیال سمجھتا ہون کہ شاید آیندہ علمی اور تعلیمی کامون کے انجام دینے مین مشرقی اور مغربی تعلیمون کے فرق و امتیاز کی خلیج بیچ مین نہ آئے گی، اور ہماری نظر کسی بڑے علمی اور تعلیمی مقصد کو پورا کرنے مین اصل مقصد پر رہے گی، مغربی و مشرقی طرز و انداز کے اختلاف پر نہین،

اب ہم زمانہ کے دوسرے موڑ پر پہونچ گئے ہین، جہان ہم کو اپنی زبان سے محبت ہونی چاہئے، اور اپنی دیسی ہندوستانی زبان مین کام کرنے والون کے ساتھ اشتراکِ عمل ہونا چاہئے، اور شاید آج کا دن اس بڑے مقصد کے اعلان کے لئے موزون ہے،

اصل موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے ایک خاص نقطۂ نظر کے متعلق ہم کو کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہین ہمارے خیال مین اب تک کسی جماعت کی طرف سے اس کی غلطی کو واضح نہین کیا گیا، اور نہ اس کی غلطی پر ابھی تک ان کو ٹوکا گیا ہے ہماری مراد اس سے وہ غلط قسم کا فرقہ وارانہ رنگ ہے جو ہماری تاریخ پر ایک زمانہ سے چھایا ہوا ہے،

پالٹیکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہین، بلکہ صاف کہنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے ہندوستان کا مشہور پھل پھوٹ پیدا ہوتا ہے مسلمانون کی حکومت کی برائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتین کہی جاسکتی تھین، مگر ان کے بعد اس ملک مین جو حکومت آئی، اوس کے زمانہ مین تعلیم کا سررشتہ پورا کا پورا غیر ملکیون کے ہاتھ مین تھا: ان لوگون کے ہر حصے کی طرف سے یہ کوشش تھی، کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی کے دل مین بٹھا دے، اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کرے جس سے ان کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جڑنے نہ پائین، تعلیم کے سارے مضمونون مین اس کام کے لئے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ اونھون نے اس ملک کے لئے تاریخ کی جو کتابین شروع سے آخر تک لکھین اور پڑھائین، ان مین یہی بات سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائین، اور پڑھائین کہ جو دل ان سے ٹوٹے تھے، وہ پھر اب تک جٹ نہ سکے،

آج سے کوئی پندرہ سولہ برس پہلے اسی مدراس کے شہر ترچناپلی مین ہندو مسلمانون کے ایک ملے جلے جلسہ مین جس کے

صدر ہائیکورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے، مین نے کہا تھا کہ وہ زمین جس مین ہندو مسلمانوں کے پھوٹ کا درخت جمتا اور بڑھتا ہے وہ (C) سے شروع ہونے والے دو مکان مین یعنی کالج اور کورٹ، میری بات کو ہنسی اور دل لگی نہ سمجھئے بلکہ سوچئے کہ میرا کہنا کہاں تک سچ ہے پچھلی بڑی جنگ یعنی مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم اسکیم کے بعد سے تعلیم کا کام خود ہندوستانیوں کے ہاتھون مین آگیا ہے جس مین سے ایک تاریخ بھی ہے، اب ہندوستان کی تاریخ اکثر یونیورسٹیون مین ہندوستانی ہی پڑھاتے ہین، اور ہندوستانی ہی کورس کی کتابین بناتے ہین، اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہون کے حالات کی تحقیق پر کتابین لکھاتے ہین لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب چلنے والے گو نئے ہین لیکن ان کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے جس کو ان کے پیش رو پرانے بدیسی چلنے والے بنا کر چھوڑ گئے ہین، حالانکہ ضرورت یہ ہے کہ اب نیا ڈگر بنایا جائے اور علم کے قافلہ کے چلنے والون کے لئے نئی راہ نکالی جائے، جو پھوٹ کے بجائے میل کی منزل مقصود کو جاتی ہو،

اس فن کے جاننے والے جانتے ہین کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے، اس کچی دھات کو مختلف مسالون سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہین بنا سکتے ہین، اور اپنی ہمدردی اور بیدردی سے اس کو جس طرح چاہین رنگ کر دکھا سکتے ہین، دو تین جزئی باتون کو ملا کر کلیہ بنا لینا اس فن کا آج کل سب سے آسان چٹکلہ ہے، پرانے زمانہ مین تاریخ ایک معصوم فن تھا جس کا مقصد واقعات کا ریکارڈ تیار کرنا تھا اور بس، مگر آج کل یہ فن سب سے زیادہ بدنام فن ہو گیا ہے، اور قومون کی چرب زبانی اختلاف بیانی اور واقعات کی توجیہ و تشکیل کر کے اس کو جدا جدا رنگ دینے کے سبب سے کسی چیز کی تاریخ آج ایک ہی طرح بیان نہین کی جا سکتی ہے، کچھ نہ سہی پچھلی جنگ ہی کی تاریخ مختلف لڑنے والی قومون کی زبانون سے ایک ہی طرح پڑھ کر دیکھ لیجئے، یا اسی لڑائی مین ایک ہی واقعہ کی روایت مختلف ملکون کے ریڈیو مین سن لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ مین تاریخ کی حقیقت کیا سمجھی گئی ہے، اور اس سے کیا مصرف لیا جا رہا ہو،

بہرحال مجھے کہنا یہ تھا کہ تاریخ کے فن کو قومون کے پھوٹ اور میل مین بہت کچھ دخل ہے، اس لئے وہ لوگ جن کی نظر مین اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھون مین اس مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے اور اس حالت مین جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک مین جینا اور مرنا ہے، تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتون کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا اور بڑھتا اور پھلتا اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے،

مسلمانون مین دو مصنف ایسے گذرے ہین جنھون نے ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھون کا سرمہ بنایا جن مین پہلا گو نسل مین ترک تھا، مگر اس کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا، میری مراد امیر خسرو سے ہے، جنھون نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان مین مسلمانون کے عہد مین ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی، اور سب سے پہلے اس ملی جلی زبان مین شاعری کی بنیاد رکھی، اور موسیقی کی ایک نئی لے ہندی اور ایرانی سے ملا کر پیدا کی انھون نے اپنی فارسی مثنوی "نہ سپہر" مین ایک مستقل باب ہندوستان کی خوبیون پر لکھا ہے، اور یہان کے ملکی باشندون کے علم و آرٹ، اور ہنر کی تعریف مین اپنی شاعری کا پورا جوہر دکھایا ہے، دوسرے شخص میر غلام علی آزاد بلگرامی ہین جن کی وفات کو ابھی ۱۶۳ برس گذرے ہین، ان سے بڑا ہندوستان کا کوئی مسلمان مورخ اور عربی کا شاعر اس ملک مین پیدا نہین ہوا یہ ہندی کے بھی شاعر تھے، بلکہ خاندانی شاعر، انھون نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان عربی مین لکھ کر ہندوستان کی زبان

کو آسمان اور ہر حیثیت سے اس کی وہ بڑائی کی ہے، کہ اس کو رشکِ جہان بنا دیا ہے، مسلمان مورخون کے لئے اُن کے بزرگون کا یہ طریقہ ان کی تقلید کے قابل ہے،

جس عہد کی تاریخ پر ہم آج کی مجلس مین کچھ کہہ سن لیتے ہین اس پر ہندوستانی اہلِ قلم کے ہاتھون سے کئی اچھی اچھی کتابین شائع ہو کر اہلِ نظر کے سامنے آگئی ہین، خاص کر ہماری یونیورسٹیون مین تاریخ کے کام کرنے والون کے ذریعہ کافی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، مگر اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جو کسی یونیورسٹی سے کسی ڈگری کے حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا ہے، اب تک عموماً طلبہ یا ایسے اساتذہ جنھون نے اپنی طالب علمی کا زمانہ فوراً ہی ختم کیا ہے، ایک مقررہ مدت کے اندر ڈگری لینے والون کے خیالات سے متاثر ہو کر اس عہد پر کتابین لکھتے رہے ہین، جس مین انھون نے کم سے کم مدت مین زیادہ سے زیادہ باتین پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسی لئے ان مین سے بعض کی تحقیق مین گہرائی، رائے مین پختگی اور دلیلون مین وزن نہین، ان مین کچھ ایسے بھی ہین جنھون نے فارسی نہ جاننے کے باوجود دوسرون پر بھروسہ کرکے اپنی تحقیقات کی ساری عمارت فارسی کی اوریجنل کتابون پر کھڑی کر دی ہے، اور بعض ایسے بھی ہین جنھون نے مسلمان حکمرانون کے مذہب کے اصول و قوانین کا گہرا مطالعہ کئے بغیر کسی دوسرے کی رائے کا حوالہ دیکر یا کسی کے قول کو نقل کرکے اپنے خیال کے مطابق نتائج اخذ کرلئے ہین، یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات مین اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ سے بتائے جاتے ہین، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانون کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ اور اگلائی نڈ یز (Legal Theories) کی عینک سے دیکھے جاتے ہین،

اس غلط طریق کار کا نتیجہ یہ ہے، کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے ہین، اور نہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے ان کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جاتا رہا ہے، اور ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤن کی غلطی کی غلط پیروی مین مصروف ہین،

یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت کی ہے، اس کا اعتراف ہے، مگر مذہبی شرعی اور فقہی معاملات مین ان کی تحقیق یا رائے یا قول پر کسی حال مین بھی اعتماد نہین کیا جا سکتا ہے، اس لئے مسلمان فرمانرواؤن کے کسی قول یا پالیسی کو ان کے مذہب کی روشنی مین اگر دیکھنے کی کوشش بھی کیجائے، تو مذہبی معلومات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء و فقہا کی اوریجنل، مستند اور معتبر کتابین ہونی چاہئین، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابون کا سمجھنا ممکن نہ ہو، تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہی نہ کیا جائے، نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور ملکی امور مین ان کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے مضرت رسان پہلو پیدا ہو جاتے ہین جن سے ایک طرف تو حقیقت کا خون ہوتا ہے، اور دوسری طرف قومون کے جذبات مین تلخی پیدا ہوتی ہے، یہان پر ہمارے دوستون کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین مسلمان ضرور تھے، لیکن وہ اسلام کے نمایندے نہ تھے، وہ اسلام کے نام لیوا بن کر گو حکومت کے تخت کو جلوہ دیتے تھے، مگر ان کی حکمرانی کا طرز اور فرمانروائی کا اصول خالصتہً اسلامی نہ تھا، وہ مذہباً تو مسلم اور نسلاً ترک یا پٹھان یا ہندو تھے، اس لئے ایک یا دو یا کئی نسل کے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کی صحیح تصویر نہ تھے، اور نہ ان کی سیاست اسلامی سیاست تھی، اور نہ ان کی حکومت ٹھیک اسلامی طرز کی تھی، اور نہ ان کے سپہ سالار اور فاتح

اپنے مفتوحہ ملکون کے ساتھ اسلامی طریقے کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، اس بحث کے سمجھنے کے لئے سلطان علاؤ الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی وہ طویل گفتگو پڑھیے جس کو برنی نے فیروز شاہی میں لکھا ہے، یا محمد شاہ تغلق کی ان خونریزیون پر ایک نظر ڈالی جائے جس کے مقتولین مین ہندوؤن اور مسلمانون کی تخصیص نہ تھی، غور کیجئے، کہ محمد بن قاسم ثقفی کی عربی فوج نے ۹۰ھ مین جب بودھون کے بلاد سے پر سندھ مین قدم رکھا تو پہلے ہی دن ان عربون نے ہندوؤن کی حیثیت شرعی کو منقح کر لیا، اور ان کو وہی حیثیت ذمی جو ان سے پہلے صحابہ نے اہل فارس کی قرار دی تھی یعنی شبہ اہل کتاب جس کے معنی یہ ہین، کہ دو باتون کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور مین ان کے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ کیا جائے گا، نیز یہ کہ یہان کے مندرون کی حیثیت ایران کے آتشکدون کی ہے، جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے، اوسی طرح مصالحت ہو جائے، تو یہ مندر بھی توڑے نہین جائین گے چنانچہ سندھ اور ملتان مین چوتھی صدی تک اسلامی حکومتون کے باوجود یہ مندر اسی طرح قائم رہے، مورخ بلاذری نے یہ حالات لکھے ہین، اور اکثر عرب سیاحون نے ان کی کیفیت بیان کی ہے،

لیکن افسوس ہے کہ ترک سیاحون نے جوش جہاد کے علاوہ صلح وجنگ اور فتح وغنیمت اور محاصل و مداخل کے تمام اسلامی اصولون کو فراموش کر دیا، اور ان کے ان کامون کی ذمہ داری شریعت اسلام پر رکھی جاتی ہے، حالانکہ اسلامی اصول سے ذمیون کے معاملات کا فیصلہ ایک حد تک باہمی معاہدات کی دفعات پر ہے، اور نیز یہی فقہی مسئلہ ہے کہ پرانے مندر توڑے نہ جائین گے، اس قسم کے خلط ملط مباحث سے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ ایک زمانہ سے جھگڑے کی چیز بن کر رہ گئی ہے، یا تو ان کی اور ان کے مذہب کی تصویر بہت ہی بُری اور بھیانک دکھائی جاتی ہے یا پھر دوسری طرف اون کی حمایت اور مدافعت مین ہر قسم کا زور صرف کیا جاتا ہے، یا پھر دونون گروہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرتے ہین، کچھ محققین ایسے بھی ہین، جو کسی سلطان کی حکومت کی تاریخ لکھتے وقت اس کی خوبیان بھی ظاہر کرتے ہین، اور اس کی بُرائیان بھی دکھاتے ہین، مگر ان مین سے ایسے مصنفون کی تحریر بڑی گمراہ کن ہوتی ہے جو چند خوبیان محض اس لئے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہین، کہ ان خوبیون کی آڑ مین وہ بڑی سے بڑی برائیون کا زہر پھیلانے مین کامیاب ہون، اور وہ مخالف نکتہ چینی کے الزام سے بھی بچے رہین، حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ بغیر تصنع کے حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ دیا جائے،

غرض مسلمان سلاطین کی تاریخ لکھتے وقت یہ بات ہم سب کے سامنے رہنی چاہئے، کہ وہ مسلمانون کے بادشاہ ضرور تھے لیکن اسلام کے مذہبی پیشوا اور مصلح نہ تھے جن کا ہر فعل اور عمل بُرائیون اور کمزوریون سے بالاتر ہوتا، اس لئے انھون نے اگر اپنی سیاست مین کوئی نادرا اور نامناسب رویہ اختیار کیا تو آج ہم کو اس کے لئے نہ معذرت نامہ پیش کرنے کی ضرورت ہے، نہ شرم سے سر جھکانے کی، وہ کونسی قوم ہے جس کے بادشاہ اور کشور کشا ہر معیار پر ہر زمانہ مین پورے اترے، اور ہر اعتراض سے پاک گذرے، اچھون اور برون سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہین رہا، اس لئے شخص کی بحث مین مذہب کو درمیان مین لانا غلطی ہے حالانکہ یہ غلطی اس قسم کے موقعون پر ہندو ہندوستان، اور عیسائی ہندوستان کے دور کے بیان میں کبھی زیر عمل نہین آتی، تاریخ کا مقصد پروپگنڈا نہین بلکہ وہ واقعات کی کہانی اور قومون کی سوانحعمری ہے، اور اسی حیثیت سے ان واقعات کا تذکرہ کرنا چاہئے، انگلستان کی تاریخ کیا لڑائیون کا دنگل نہین، رومن فتوحات سے موجودہ متحدہ اینگلوسکسن حکومت تک کیا ان قومون کی جنگین نہین ہوئین، کیا اسکاٹ لینڈ ویلیز، آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان بڑی بڑی خونریزیان نہین ہوئین، مگر اب ان کی تاریخ لکھتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ واقعات اس انداز مین بیان نہ ہون، کہ پچھلے سوئے ہوئے فتنے

ہر جاگ جائین، انگلستان اور فرانس جو آج ڈیڑھ سو برس سے اتحادی ہین، کیا ان کی تاریخ کی زمین دونون قومون کے
خون سے رنگین نہین، تاہم گذشتہ ناگواری کے اظہار مین قلم اس قدر محتاط رہتا ہے، کہ موجودہ خوشگواری کے شیشہ مین
بال بھی آنے نہین پاتا، اسی طرح پرانے ہندوستان کے راجاؤن مین کون وقت لڑائی بھڑائی اور ایک دوسرے کے راج
کے لینے دینے مین نہین گذرا، پھر بھی بودھ، جین، ویدک، برہمنی، آریائی اور سیتھین اور یہان کی قدیم باشندہ قومون کی لڑائیون
کے بیان مین مورخون نے اپنی قلمی لڑائیون کا سلسلہ نہین چھیڑا ہے، حالانکہ ان مین سخت مذہبی اختلافات بھی تھے، اور یہ
صحیح قدم ہے، اسی طرح کا مصالحانہ قدم اسلامی تاریخ کے اس دور کے میدان مین بھی رکھنا چاہئے، میری یہ تمہید گو لمبی
ہو گئی، اور ممکن ہے کہ اس بیان مین کہین کہین تلخی بھی آگئی ہو، مگر جس درد سے یہ باتین کہی گئی ہین، امید ہے کہ وہ اسی درد
سے سُنی بھی گئی ہون گی، اور ہمارے مورخ دوستون کی توجہ کے قابل ٹھہرین گی، اس مجلس سے بہتر اور کونسا موقع اس
درد کے اظہار کا ہوسکتا تھا،

اب ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس عہد کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہین، جو ہمارے پیش نظر ہے، اس عہد
کی تاریخ لکھنے مین سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا سرمایہ ہمارے پاس بہت کم ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ
دوسرون کی طرح اوس زمانہ کے بادشاہون نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کو سرکاری کام نہین قرار دیا تھا، بلکہ عموماً اہل تاریخ
اس کام کو اپنے شوق سے انجام دیتے تھے، گو وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کے دامن سے ضرور بیٹے تھے، تاہم وہ اس کام کے لئے مجبور
نہین نہ تھے، آج کل قومون کی تاریخ کی نقش آرائی مین خون ہی کا رنگ درکار نہین، بلکہ اس زمانہ کے تمدن، اقتصاد،
تدبیر، معاشرت، علم و فن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی ضرورت پڑتی ہے، جن سے اس قوم کی پوری تصویر
کھڑی ہو جائے، لیکن اوس زمانہ کے پرانے مورخون نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخین لکھین، اس لئے جو مسائل ان کے
نقطۂ نظر سے اہم تھے، وہ ہمارے لئے غیر اہم ہین، اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے ہین، ان کو انھون نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو
نظرانداز کر دیا ہے، یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے، تاہم اگر آج کل کے لکھنے والون کے حوصلے بلند اور ارادے اچھے ہون
تو ان ہی معاصر تاریخون سے اپنی ضرورت کا اچھا خاصہ مواد فراہم کرسکتے ہین، میرے استاد مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ وہ
ہی تحقیق مین چیونٹیون کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرکے مٹھائی تیار کیا کرتے ہین، اگر اسی طرح صبر، محنت اور استقلال کو راہ
دے کر کوئی ریسرچ کرنے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہین کہ ہر موضوع پر اس کو ہر قسم کے معلومات نہ ملتے جائین، مگر موجودہ
دور کے محققین کے مشاغل اس قدر گوناگون ہین، اور محنت کے بھی ابھی زیادہ عادی نہین ہوئے ہین، اس لئے ان کی کوشش
صرف یہ ہوتی ہے کہ معاصر تاریخون مین جو واقعات اور تفصیلات فارسی زبان مین سیدھے سادے طریقے پر درج ہین، وہ اپنے
اپنے ذوق کے مطابق انگریزی اردو اور ہندی زبان مین تھوڑی تنقید اور نکتہ چینی کے ساتھ منتقل کر دین، اسی طرح انگریزی
اردو اور ہندی مین لٹریچر فراہم ہو کر ان زبانون کی تو خدمت ہو جاتی ہے، یا اوسط درجہ کے علم اور تاریخی مذاق رکھنے والون اور
یونیورسٹی کے طالب علمون کے لئے تو کتابین حاصل ہو جاتی ہین، مگر ان تحقیقات سے صحیح معنون مین گذشتہ عہد کی قومون کی
موجودہ نسلون کی نہ ذہنی پیاس بجھتی ہے، اور نہ وہ اپنے ماضی کی صحیح تصویر دیکھ کر اپنے مستقبل کو امید افزا پاتے ہین، کیونکہ ماضی
شاندار ہے تو مستقبل کو شاندار بنانے مین حوصلہ بڑھتا ہے، اور قومی خودی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے کسی قوم کو نقصان پہنچانے
کا ایک کارگر حربہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا ماضی خود اس کے سامنے بہت ہی برے اور نفرت انگیز طریقے پر پیش کیا جاتا ہے، جس

سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنی تمام تاریخی اور تمدنی روایات سے رفتہ رفتہ متنفر ہو جاتی ہے، اتفاق سے اس قسم کے حربے سے فائدہ اٹھانے کے لئے معاصر تاریخوں میں ہر طرح کا مسالہ موجود ہے،

یہ معاصر فارسی تاریخیں عہد سپہ گری میں ایرانی مذاق کے مطابق لکھی گئیں، اس زمانہ میں سب سے بڑا ذاتی وصف سپہگری میں کمال حاصل کرنا تھا، ہر فرد اپنا جوہر میدان جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اہل قلم اہل سیف کی طرح لڑائی کے میدان میں شریک نہ ہو سکتے تھے، تو اپنی سپہگری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے ان کی ساری تاریخیں جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت و خون کی داستان ہے، مورخوں کے ان ذاتی رجحانات کی بنیاد پر تاریخ کے بہت سے اہم رُخ پر پردے پڑ گئے ہیں اور اب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سلاطین نے لڑنے بھڑنے کے سوا کچھ اور کام ہی نہیں کیا، انگریزی داں طبقہ پر یہ خیال سر ہنری ایلیٹ کی تاریخ ہند کے ذریعہ سے اور بھی زیادہ گہرے طور پر منقوش ہوا، ہنری ایلیٹ کا یہ احسان ناقابل فراموش ضرور ہے کہ اس نے غیر معمولی تلاش و جستجو سے ہندوستان کی کمیاب اور نادر عربی جغرافیوں اور فارسی تاریخوں کا پتہ لگا کر ان کے انگریزی ترجمے اور اقتباسات اپنی مذکورہ بالا کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں، اور آج بہت سے محققین کے لئے وہ ہدایت کا چراغ ہے، مگر یہ کہنا پڑے گا کہ ایلیٹ نے ان ترجموں میں دیانتداری سے کام نہیں لیا، جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اس نے اپنی کتاب میں شامل کئے ہیں، ان میں جا بجا علمی، تمدنی، عمرانی اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور ہیں، لیکن ان کو اس نے قصداً حذف کر دیا ہے، اب فارسی سے ناآشنا اور ایلیٹ کی کتاب کو اپنا گائڈ بنانے والا محقق مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے، ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اس نے اپنے کام کا مقصد چھپا کر نہیں رکھا ہے، اس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے پیش نظر تمام تر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیشرو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی قوم کے عہد حکومت کی روشنی دکھائے، تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھکر اس کو اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں، (دیباچہ ص ۲۲)

ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تاریخیں ایرانی ذوق کے مطابق لکھی گئی ہیں، مختلف مورخوں نے تاریخیں لکھکر زیر نظر عہد کے سیاسی واقعات تو مسلسل اور مربوط طریقہ پر مرتب کر دیئے ہیں، لیکن ان ایرانی مذاق کے مورخوں نے بادشاہی درباروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، ان کے نزدیک بادشاہ کا دربار ہی ساری دنیا تھی، عرب اور ایرانی مورخوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، عرب مورخ دربار کا مورخ نہیں ہوتا، بلکہ زمانہ کا مورخ ہوتا ہے، اسی لئے اس کی تاریخ کی تقسیم بادشاہوں کے نام پر نہیں بلکہ سال پر ہوتی ہے، طبری، ابن اثیر، ابوالفدا وغیرہ مورخوں نے اسی طرز پر اپنی تاریخوں کی بنیادیں ڈالی ہیں، عرب کا مورخ نہ صرف بادشاہوں کی جنگ و صلح کے واقعات کو زیر تحریر لاتا ہے بلکہ ضمناً اس زمانہ کے تمدنی، علمی اور معاشی حالات بھی ضرور قلمبند کرتا جاتا ہے گو ان میں ترتیب نہیں ہوتی، ایک ابن بطوطہ کو دیکھئے کہ مغرب اقصیٰ کے اس سیاح کے ہاتھوں محمد تغلق کے عہد کا جتنا واضح اور روشن مرقع ہمارے سامنے موجود ہے وہ اس دور کے کسی اور سلطان کی حکومت کا نہیں، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں بہت سے سیاسی واقعات ایسے بھی لکھے ہیں جن کا فارسی تاریخوں میں بہت کم پتہ چلتا ہے لیکن تحقیقات نے ان کی صحت و درستی کو ثابت کر دیا ہے، معبر یعنی کارومنڈل میں حسن کیتھلی کی اسلامی ریاست کا اس نے ذکر کیا ہے، اس کا ثبوت آثار قدیمہ کے سکوں نے بہم پہنچایا، اور حیدرآباد کے حکیم شمس اللہ قادری نے ۱۹۲۲ء میں سلاطین معبر کے

نام سے اس پر ایک اچھا مقالہ لکھا ہے، ملتان کے مدرسہ کا نام صرف ابن بطوطہ نے بتایا ہے، سندھ کے سومری بادشاہون کی حقیقت بھی ابن بطوطہ سے معلوم ہوئی، ہندوستان اور چین کی بحری تجارت کا حال اور جہازون کی آمد و رفت کی کیفیت بھی اسی سے معلوم ہوئی، بنگال کا نقشہ اس نے فارسی کے دو حرفوں میں کھینچا ہے "جہنم پر از نعمت"، ترکستانی ترکون نے بھی اس کو یہی لقب دیا تھا، ملیبار مین اسلامی آبادیون کا ذکر اسی نے کیا ہے، سنداپور یعنی گوا کی عرب اسلامی سلطنت کا حال اسی سے معلوم ہوا، ہونور احاطہ بمبئی کے عرب سلطان کی داستان اسی نے سنائی، ملیبار اور جزائر کے ہندو راجاؤن کے قصے اسی سے معلوم ہوئے،

محمد تغلق نے چونکہ مصر کے عباسی خلیفہ سے تعلق پیدا کر لیا تھا، اس لئے ہندوستان اور مصر کے درمیان سفیرون، سیاحون اور علما کی آمد و رفت کا دروازہ کھل گیا تھا، اور اس راہ سے اس زمانہ کی ہندوستان کی تاریخ کا بہت سا سامان عرب مورخون کے بھی ہاتھ آیا، چنانچہ اس عہد کے مصری مورخ ابن فضل اللہ المتوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء نے اپنی مسالک الابصار فی ممالک الامصار مین اس زمانہ کے ہندوستان کے جو تمدنی و تجارتی اور اقتصادی اور فنی حالات لکھے ہین، اس عہد کی پوری فارسی تاریخ مین نہین مل سکتے؛ کیا ہندوستان کے کسی فارسی تاریخ مین آپ کو یہ لکھا مل سکتا ہے، کہ ان سلاطین کے زمانہ مین ہندوستان کی تعلیم کا کیا حال تھا، اور کتنے مدارس قائم تھے، لیکن ابن فضل اللہ کا بیان سنئے جو لکھتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانہ مین صرف دلی مین ایک ہزار مدرسے، ۷۰ شفاخانے اور دو ہزار خانقاہین تھین، یا وہ مشہور شاہی مدرسہ جو فیروز شاہ تغلق کے زمانہ مین دلی مین شاہانہ فیاضی سے قائم ہوا تھا، وہ کیسا تھا، اس کی تعلیم کیا تھی، کون کون بڑے بڑے مدرسین تھے، فارسی کی لفاظانہ انشاپردازی مین اس کا بیان گو برنی نے صفحون مین کیا ہے، مگر اس کا حاصل کچھ نہین، بدر چاچ اور مطہر کڑہ اس عہد کے دو شاعرون نے اس مدرسہ کا جو ذکر اپنے قصائد مین کیا ہے اس کو پڑھکر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم آج بے قرار ہین مگر نہین کر سکتے،

مسالک الابصار کے بیان کا یہ حصہ جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے فرانسیسی اور انگریزی مین ترجمہ ہو گیا ہے، اوس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرب مورخ کی نگاہ مین کتنی وسعت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ کے بعد مصر کے دوسرے مورخ قلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ نے اپنی کتاب صبح الاعشی فی کتابۃ الانشاء مین اس حصہ کو نقل کر دیا ہے، اور ہماری اکاڈمی نے چودہ برس ہوئے کہ اس کا ترجمہ معارف دسمبر ۱۹۲۳ء مین شائع کر دیا ہے، اس عہد کے عرب سوانح نگارون نے بھی آٹھوین اور نوین صدی ہجری کے اکابر کے حالات مین اپنے زمانہ کے ہندوستانی بادشاہون کو بھی جگہ دی ہے، جیسے ابن حجر مصری نے الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ مین اور شوکانی یمنی نے البدر الطالع فی القرن التاسع مین جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے متعدد سلاطین فضل و کمال کے لحاظ سے اہل علم مین شمار کئے جانے کے لائق تھے،

اگر ہر دور مین ایک ابن بطوطہ، ایک ابن فضل اللہ، اور ایک ابو العباس احمد قلقشندی ہوتا، تو آج ہندوستان کے زیر نظر عہد کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی، جو آج نظر آتی ہے، تیموریون کے مقابلہ مین سلاطین دہلی کا زمانہ عام طور سے اہم نہین سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ نہین کہ اس عہد کے سارے حکمران ادنی درجہ کے تھے، یا ان کا نظام سلطنت اتنا مکمل اور مرتب نہ تھا، جیسا کہ ان کے بعد کے فرمانرواؤن کا تھا، بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان کی سیاسی سطوت اور تمدنی عظمت کی صحیح تصویر پیش کرنے والا کوئی مورخ پیدا نہین ہو سکا، اور نہ خود ان سلاطین نے اپنے شاندار ملکی، جنگی اور کلچرل کارنامون کو باضابطہ تحریر مین لانے کی کوشش کی، اگر اس دور مین کم از کم کوئی ابو الفضل، کوئی عبد الحمید لاہوری، کوئی عبد الباقی نہاوندی اور کوئی محمد کاظم بھی پیدا ہو جاتا تو ان سلاطین کی تاریخ ویسی ہی پرشکوہ اور باوقار معلوم ہوتی، جیسی وہ درحقیقت تھی، موجودہ دور کے محققین کا اب یہ فرض ہے کہ اس زمانہ کے تاریخی سرمایہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالین، اور مورخین کی گذشتہ تغافل کی

تلافی کریں، اس عہد کا جو کچھ تاریخی لٹریچر ہے، وہ زیادہ تر یا تو یورپ یا کسی اور جگہ کے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی شکل میں زینت و آرایش کی خاطر رکھ چھوڑا گیا ہے، ان کتب خانوں میں بیٹھکر جو کوئی بھی ان قلمی نسخوں کے ذریعہ سے اچھے اور برُے صحیح و غلط معلومات فراہم کر دیتا ہے، ہم انہی پر اکتفا کر لیتے ہیں، ان کی حقیقی اور غیر حقیقی تعبیر و تصریح پر ہم کسی قسم کی روشنی ڈالنے سے بالکل قاصر رہتے ہیں، اگر غیر مطبوعہ لٹریچر طبع اور شائع ہو کر سہولت سے ملنے لگے، تو محققین کا کام بہت ہی آسان اور ہلکا ہو جائے،

ہم بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ممنون ہیں کہ اس کی طرف سے بہت سی کتابیں شائع ہو گئی ہیں، علی گڈھ کے اساتذہ نے بھی مفید کتابوں کا اضافہ کیا ہے، آگرہ یونیورسٹی، لاہور اورنٹیل کالج اور حیدر آباد کے کچھ اصحاب قلم نے بھی بعض قلمی نسخوں کو محنت کے ساتھ اڈٹ کر کے تاریخ ہند کے شائقین کو مرہون منت کیا ہے، مگر پھر بھی بہت سا ایسا لٹریچر ہے جس کے نہ ملنے کی وجہ سے محققین کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ہیں، اس لئے اگر خود کانگریس یا تاریخ کا کوئی ادارہ ایسا قائم ہو جائے کہ ان کتابوں کا پتہ لگائے، ان کی نقلیں اور فوٹو بہم پہنچائے، یا اُن کو اڈٹ اور شائع کر کے اہل تحقیق کے ہاتھوں تک پہنچائے تو ایک بہت بڑی کمی پوری ہو جائے، مثلاً غلاموں کے عہد میں حسن نظامی نے تاج المآثر میں بعض غلام سلاطین کے حالات لکھے ہیں، لیکن اس کی عبارت آرائی کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، اور یہ کہکر اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس میں واقعات کم اور الفاظ کا طومار زیادہ ہے، شاید اسی لئے یہ اب تک نہیں چھپ سکی ہے، اس میں واقعات کم ہوں، مگر اس کی سطروں کے درمیان بعض ایسی ضروری چیزیں ملجاتی ہیں جن سے اس زمانہ کے بعض تمدنی کلچرل اور عمرانی پہلو واضح ہو جاتے ہیں، جس طرز کی عبارت اس میں استعمال ہوئی ہے، اس سے اس زمانہ کے علمی اور انشا پردازانہ ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس کے شائع ہونے سے اس عہد کے تاریخی اور علمی حالات کا جائزہ لینے میں کچھ نہ کچھ ضرور مدد مل سکتی ہے، التمش کے زمانہ حکومت میں آداب الحرب والشجاعہ لکھی گئی، جو اس عہد کے حربی و فوجی معلومات کے لئے ایک بیش قیمت ماخذ ہے، اورنٹیل کالج لاہور نے اس کا کچھ حصہ شائع کیا ہے، مگر اس کے مکمل نسخہ کی کمی غیر معمولی طریقہ پر محسوس ہو رہی ہے، اسی زمانہ میں محمد عوفی نے التمش کے دربار میں رہ کر جامع الحکایات و لوامع الروایات لکھی، جو گو نقلوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے لیکن ان سے بعض اوقات بہت سی تاریخی اور معاشرتی تفصیلات واضح ہوتی ہیں، ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں طبقات ناصری، تاج المآثر اور جوامع الحکایات کے مؤلفوں کے علاوہ کبیر الدین ابن تاج الدین عراقی کا بھی نام لیا ہے، جس نے علاؤالدین خلجی کی فتوحات کی تاریخ لکھی تھی، لیکن اس کتاب کا ابتک کہیں پتہ نہیں چل سکا ہے، تیموریوں کے آخری دور کے ہندو مورخ سبحان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں عزالدین خالد خانی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے، لیکن اس کے متعلق بھی اب تک کسی کتب خانہ میں کوئی پتہ نہیں چلا، خالد خانی کی ایک دوسری تصنیف دلائل فیروز شاہی کا ذکر فرشتہ نے کیا ہے، مگر وہ اقسام حکمت علمی و عملی میں ہے، تاریخ فیروز شاہی کے مؤلف شمس سراج عفیف کی ایک کتاب مناقب سلطان محمد بھی لاپتہ ہے، ایک نامعلوم مصنف کی ایک اہم کتاب سیرت فیروز شاہی کا واحد نسخہ خدا بخش خاں کے کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے، مگر اب تک کسی اہل علم یا ادارہ نے اس کو شائع کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے، امیر تیمور کی طرف دو کتابیں تزک تیموری اور ملفوظات تیموری منسوب ہیں، دونوں ایک ہی چیزیں ہیں مگر بمبئی کے مطبوعہ نسخہ تزک تیموری، ور الیٹ کے اقتباسات ملفوظات تیموری میں بڑا اختلاف ہے، ملفوظات تیموری، مترجمہ ابو طالب حسینی کو تو جعلی بتایا گیا ہے، لیکن اس کی تحقیق اب تک نہیں ہوئی ہے، کہ بمبئی کا مطبوعہ نسخہ تزک تیموری مستند ہے، یا غیر مستند، لودیوں کی کسی معاصر تاریخ کا پتہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے

طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، واقعات مشتاقی اور تاریخ داؤدی سے اس خاندان کی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہین، مگر یہ تمام کتابین تیموریون کے دور مین لکھی گئین، اسی طرح یہ یقین کرنے کو جی نہین چاہتا ہو کہ سوریون کے زمانہ مین ان کی حکومت کی کوئی تاریخ مرتب نہ ہوئی ہو گی، یا تو اس عہد کی معاصر تاریخین نظرون سے اوجھل ہو کر کہین پڑی ہین، یا تلف ہو گئی ہین، تیموریون کے دور مین سوریون کے حالات تاریخ شیر شاہی (مولفہ عباس خان سروانی) مخزن افغانان (مولفہ نعمت اللہ) اور تاریخ داؤدی (مولفہ عبداللہ) مین لکھے گئے، عباس خان سروانی کی تاریخ شیر شاہی ایک اہم اور مفید لٹریچر ہے جو اگر چھپ کر محققین کے ہاتھون تک پہنچ جائے تو ایک مفید کام ہو،

بابر کی تاریخ کے لئے خود اس کی تزک بابری اور اس کے خالہ زاد بھائی میرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی اہم کتابین ہین، تزک بابری کے انگریزی ترجمے کو جن مفید حواشی اور تشریحات کے ساتھ اے، اس، بیورج نے شائع کیا ہے اس کے احسان کی گران باری ہمیشہ رہے گی، اس کے اوریجنل ترکی نسخہ کی تو نہین مگر اوس کے اس فارسی ترجمہ کے طبع ہونے کی پھر بھی ضرورت ہے جو عبدالرحیم خان خانان نے اکبر کے لئے کیا تھا، تاریخ رشیدی مین وسط ایشیا کے مغلون اور خصوصاً چغتائیون کے حالات زیادہ ہین مگر یہ کتاب ہندوستان مین لکھی گئی، اور بابر اور ہمایون کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم کرتی ہو، مسٹر ڈے نی سن روس اس کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کتاب کے اوریجنل فارسی نسخہ سے محققین کو ضرور بے نیاز کر دیا ہی، مگر ترجمے خواہ کتنے ہی معتبر اور مستند ہون صرف ان ہی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا تحقیق کے اعلیٰ معیار کو کم کرنا ہو، بعض اوقات ان ترجمون کی غلطیون اور کمزوریون سے واقعات کے استنباط اور نتائج کے اخذ کرنے مین جو غلط فہمیان پیدا ہو گئی ہین، ان کا ہلکا سا اندازہ مسٹر ہوڈی والا کی کتاب Studies in Indo-Muslim History کے مطالعہ سے ہو گا، اس کتاب مین مسٹر ہوڈی والا نے ایلیٹ کی جو غلطیان دکھائی ہین ان کو پڑھنے کے بعد محققین کو ایلیٹ پر شاید اعتماد کلی باقی نہ رہا ہو گا، اسی طرح تاریخ یمینی طبقات ناصری اور تاریخ فرشتہ کے انگریزی ترجمہ پر جو نکتہ چینیان ہوتی رہی ہین، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمون کی زیادہ اہمیت تحقیق کے سلسلہ مین نہین دی جا سکتی ہی،

حضرات! مجھ سے پہلے شاید اس کرسی سے آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی ہو گی، کہ مرکزی حکومتون کے ساتھ ساتھ مختلف صوبون مین جن خاندانون نے حکمرانی کی، ان کی تاریخ نظر انداز کرنے کے لائق نہین ہے، اول تو صوبون کے ایوانون کے مختلف کارنامون کی اتنی تفصیلات ہین کہ ان کو قلمبند کیا جائے، تو ہر صوبہ کی علٰحدہ علٰحدہ تاریخ ہو گی، پھر مرکزی حکومتون کی حریف یا باجگذار ریاستین تو مستقل تاریخ کی مستحق ہین، احسن آباد گلبرگہ کے بہمنی خاندان بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین تلنگ کے قطب شاہی بادشاہون، برار کے عماد شاہی حکمرانون اور بیدر کے برید شاہی والیون نے جنوبی ہندوستان کی سیاست معاشرت، تمدن اور آرٹ پر گہرے نقوش چھوڑے ہین، مالوہ اور منڈو مین خلجی، برہانپور مین فاروقی خاندان اور گجرات مین مظفر شاہی حکمرانون کے کارنامے فراموش نہین کئے جا سکتے ہین، گجرات کی خود مختار سلطنت اپنی علمی و تجارتی و بحری ترقیون مین دلی کی مرکزی سلطنت سے کہین بڑھ کر ہے، اسی طرح بیجانگر کی تاریخ بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے اور یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہین کہ اس ہندو سلطنت کی جنگی طاقت مین مسلمان سپاہیون کو بھی خاص حیثیت حاصل تھی، ٹھٹھہ اور سندھ مین ایک اور التمش کے حریف حکمرانون تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ کا دربار دلی کے دربار سے کم پرشکوہ اور پر وقار نہین رہا، ناصر الدین قباچہ کے بعد یہان خاندان جام کی حکومت قائم ہوئی، تو اس کے تاریخی واقعات بھی گوناگون رہے، ملتان کے لنگاہ سلاطین کی حربی عظمت اس دور مین اس لئے بھی کہ ان کی حکومت ایک اہم سرحدی مرکز پر واقع تھی، جنت نظیر کشمیر کے بادشاہون کے حالات تاریخی لٹریچر کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہین

مذکورہ بالا حکومتون اور فرمانرواؤن کی تاریخ کی تدوین کے لئے ابھی حال ہی سے ہمارے موجودہ محققون نے اپنی علمی جدوجہد کا

ثبوت دینا شروع کیا ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ دکن کی بعض حکومتوں خصوصاً بہمنی خاندان کے مختلف کارناموں کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، احمدآباد کی اینگلو ورنیکولر سوسائٹی گجرات کے اسلامی دور کی بھی تاریخ لکھا رہی ہے، سرجدو ناتھ سرکار کی نگرانی میں بنگال کے ابتدائی مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کی ترتیب کی بھی خبر ملی ہے، ان مختلف خاندانوں اور ریاستوں کی تاریخی تحقیقات میں ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ ان کے ماخذ کی بڑی کمی ہے، خصوصاً معاصر تاریخوں کا پتہ تو بالکل نہیں ملتا ہے، ان کی تاریخ زیادہ تر ایسی کتابوں میں ملتی ہے جو تیموری دور میں لکھی گئیں

فرشتہ نے بہمنی خاندان کی تاریخ کے ماخذ میں حاجی محمد قندھاری کا بہمن نامہ، ملا داؤد بیدری کی تحفۃ السلاطین اور ملا عبد الکریم سندھی کی سوانح محمود گاوان کا ذکر کیا ہے، فرشتہ نے شاہ خور نامی ایک مورخ کا نام بھی لکھا ہے جس نے ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں دکن سے آکر ہندوستان میں وقائع قطب شاہی لکھی تھی، مگر ان تمام کتابوں کا کہیں پتہ نہیں، گجرات کی ایک معاصر تاریخ "تاریخ محمود شاہی" ہے جو ۸۶۳ھ سے ۹۱۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، گجرات کے مظفر شاہ ثانی کے محاصرہ مانڈو پر بھی ایک نامعلوم مؤلف کی کتاب ہے جو شاید اسی زمانہ میں لکھی گئی، مگر یہ دونوں کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے علاوہ گجرات کے مظفر شاہی خاندان کی معاصر تاریخوں کا حال معلوم نہیں، مالوہ کی تاریخ پر صرف ایک کتاب تاریخ ناصر شاہی کا پتہ ملتا ہے جس میں مالوہ کے حکمران ناصرالدین عبد القادر شاہ کی حکمرانی کے واقعات ۹۰۶ھ سے ۹۱۶ھ تک کے درج ہیں، مگر یہ بھی ابھی تک قلمی نسخہ کی شکل ہی میں ہے، عادل شاہی، بریدشاہی، عماد شاہی حکومتوں، برہان پور کے فاروقی خاندان، سندھ، کشمیر، ملتان، بنگال اور جونپور کے سلاطین کی بھی معاصر تاریخیں نہیں، لیکن معاصر ماخذ نہیں ملتا ہے تو بعد کی لکھی ہوئی مستند تاریخوں ہی سے فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں اور ریاستوں کے واقعات قلمبند کرنے چاہئیں مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ غیر مطبوعہ مخطوطات کو چھاپ کر زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے،

حضرات! زیر نظر عہد کی تاریخ کی ترتیب میں شعراء کا کلام اور علماء و صوفیہ کی تصانیف بھی قیمتی ماخذ ہو سکتی ہیں، ہم اپنی تحقیقات میں زیادہ تر مختلف سلاطین اور فرمانرواؤں کے واقعات کو تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں، ہر زمانہ میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ لینا تاریخ کا اہم موضوع ہے، چنانچہ پیش نظر دور کے شعراء میں سے ناصری خراسانی، محمد عوفی، امیر روحانی سمرقندی، ابوالفرج رونی، تاج الدین دبیر شہاب مہمرہ، امیر فخر الدین عمید تولکی، بدر چاچ، مطہر کڑہ، خسرو، حسن سجزی، عبید، اعزالدین خالد خانی اور شمس الدین وغیرہ کے کلام کا استقصا کیا جائے تو اس عہد کی نہ صرف علمی ترقیوں کا اندازہ ہوگا، بلکہ ان اشعار کے درمیان بہت سے تاریخی واقعات کی بھی جھلک نظر آئے گی، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے بہت کم ایسے خوش نصیب شعراء ہیں جن کا کلام اور دیوان چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ سکا ہے، اسی وجہ سے ان کی تحریروں کے ذریعہ سے کسی قسم کی تحقیق کرنے کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے امیر خسرو کی نظمیں چھپ گئی ہیں، تو ان سے تحقیقات کے سلسلہ میں مدد بھی لی جا رہی ہے،

صوفیہ کرام کی تصانیف ہندوستان کے اسلامی عہد کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تاریخ کے لئے ایسی ضروری ہیں کہ ان کے بغیر تینوں پہلوؤں کی تصویر واضح نہیں ہو سکتی ہے، ہندوستان کے اسلامی دور میں دو قسم کی بادشاہت ساتھ ساتھ قائم تھی ایک تو تخت و تاج کے حکمرانوں کی اور دوسری خانقاہ کے بوریا نشینوں کی، ایک توپ و تفنگ سے مملکت کو اپنے زیر نگین کرتے تھے تو دوسرے اپنے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کے ذریعہ سے ذہن و قلب کو تسخیر کرتے تھے، اور آج یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کے اثرات زیادہ غالب رہے، مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج بھی ان صوفیہ کرام کی تصانیف ذہن کی پراگندگی کو سکون قلب کے انتشار کو اطمینان اور گمراہوں کی کجروی کو ہدایت بخشنے میں کامیاب اور موثر ہیں، چنانچہ ان کی تصانیف کو بجا طور

سے اسلامی دور کا ایک بیش قیمت خزانہ کہا جا سکتا ہے، اور اس دور کے مذہب، اخلاق اور معاشرت مین ان صوفیائے کرام نے جو انقلابات پیدا کئے ان کو صحیح طور پر سمجھے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہین ہو سکتی ہے، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ شہاب الدین علی ہمدانیؒ، خواجہ نظام الدینؒ، احمد بدایونی خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، بو علی قلندرؒ، ضیاء الدین نخشبیؒ، خواجہ رکن الدین عماد کاشانی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ گیسو درازؒ، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی، محمد غوث گوالیاریؒ، میر خورد دہلوی، عبد اللہ شطاری وغیرہ کی تصنیفات، مکتوبات اور ملفوظات مین اگر تلاش کیا جائے تو زیر نظر عہد کی تاریخ کے لئے بہت سے مواد فراہم ہو سکتے ہین، اور ان سے اخلاق و معاشرت کے رُخ بہت اچھی طرح روشن ہو سکتے ہین، مگر ان تصانیف کی طرف تاریخ ہند سے دلچسپی لینے والے محققین کی توجہ بالکل نہین رہی ہے، اس لئے ان کی نظرین بھی سلاطین کے میدانِ جنگ کے کشت و خون ہی تک محدود رہی ہین،

ان صوفیۂ کرام کے ساتھ علماء نے بھی ہندوستان کو ذہنی اور علمی حیثیت سے مالا مال کیا، زیر نظر دور مین عرب اور وسط ایشیا کے اربابِ کمال سے ہندوستان علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا، ان علماء نے اس عہد کی مختلف زبانون مین جو تصانیف کی ہین ان کے مقدمہ یا خاتمہ مین اپنے زمانہ کے بادشاہون کا کچھ نہ کچھ نام و نشان اور حال بھی لکھا ہے خواہ وہ کتاب کسی فن پر لکھی گئی ہو، جیسے نصاب الاحتساب، فتاویٰ تاتارخانی، تفسیر تاتارخانی، تفسیر بحر مواج دولت آبادی، طب معدن الشفا سکندری، تصوف عین الحیٰوۃ، ترجمہ امرت کنڈ، باراہی سنگھتا بھٹ بن باراہ مہر کی کتاب ہیئت کا فارسی ترجمہ ملا عبد النبی احمد نگری کی دستور العلماء وغیرہ،

حضرات! اب تک ہمارے موجودہ محققین کی جماعت زیر نظر عہد کے سلاطین کے سیاسی، حربی اور ملکی کارنامون کی تفصیلات لکھنے مین منہمک رہی ہے، اس دور کے حکمرانون کی مختلف تعمیرات کی جیتی جاگتی یادگارون کا مطالعہ کرکے یورپین اہل قلم ان کے اس آرٹ اور فن کے کمال کی داد دیتے رہے ہین مگر اس زمانہ مین علوم و فنون، تعلیم، تمدن، معاشرت، رفاہ عام کے کام، زراعت، حیوانات، صنعت و حرفت اور تجارت مین جو ترقیان ہوئین، ان کا استقصار صحیح طور پر نہین ہو سکا ہے، اس عہد کے علوم و فنون کی ترقی پر کلکتہ یونیورسٹی کے ایک اہل علم نے اپنی کتاب Promotion of Learning in India during the Mohammadan rule کے چند ابواب مین روشنی ڈالی ہے، پٹنہ یونیورسٹی کے ایک لکچرر نے اس دور کے دو چار شعراء کے حالات لکھے ہین، لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے امیر خسرو پر ایک کتاب لکھی ہے، ناگپور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے "ہندوستان کے عہد مغلیہ سے پہلے دور کی فارسی" کے نام سے ایک کتاب پیش کی ہے، مگر پھر بھی اس عہد کے ادب و شاعری کی صحیح تصویر سامنے نہین آسکی ہے، تعلیمی نصاب اور تعلیمی ادارون کا ہلکا سا خاکہ ہماری اکاڈمی کی ایک تالیف "اسلامی درسگاہین" سے مل جاتا ہے، ہماری جماعت ندوۃ العلماء کے سابق ناظم مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم نے بیس برس کی عرق ریزی سے عربی مین دس جلدون مین فتح سندھ سے لیکر اخیر اسلامی عہد تک ہندوستان کے علماء، و مشائخ و شعراء و مورخین کے حالات جمع کئے ہین، جو بڑا نادر سرمایہ ہے، یہ اگر چھپ جائے تو محققین کی عمرون کا بہت بڑا حصہ ان معلومات کی تلاش و محنت مین ضائع ہو جانے سے بچ جائے، صرف اس کا ایک حصہ جو آٹھوین صدی ہجری سے متعلق ہے، دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا ہے، مگر افسوس کہ پوری کتاب اب تک حلیۂ طبع سے محروم ہے، ابھی حال مین ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر حسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے "ہندوستان مین اسلامی نظام تعلیم و تربیت" پر ایک پر معلومات کتاب اردو مین لکھی ہے جس مین شروع سے لے کر اس وقت تک تعلیم و تربیت کے اصول اور طریقون اور تصنیف و تالیف اور کتابون

کی فراہمی وغیرہ کے حالات لکھے ہین زیر نظر عہد کی عام معاشرتی اقتصادی اور تجارتی تفصیلات کا ایک اچھا خلاصہ ڈاکٹر کنور اشرف کے قلم سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی اشاعت - Life and Condition of People of Hindustan (1206-1526) مین پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب سلاطین دہلی کے نظام سلطنت پر قابل تحسین ہے،

اس عہد پر جتنی کتابین بھی جاتی ہین ان مین مختلف تمدنی پہلوؤن کو یا چند پیراگراف یا زیادہ سے زیادہ ایک باب مین لکھ کر ختم کر دیا جاتا ہے، حالانکہ ان مین سے ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے لئے کافی لٹریچر اور مواد موجود نہین، بلکہ محض اس لئے کہ اس کی تحقیق و تدقیق میں غیر معمولی محنت، تلاش، جستجو اور دقت نظر کی جو ضرورت ہے، وہ ہمارے سامنے محققین کی جماعت مین ابھی پیدا نہین ہو سکی ہے، اس لئے ہمارے ماضی کے تمدن کا صحیح اور روشن رُخ پیش نہین ہو سکا ہے، اور ہمارے سامنے گذشتہ تاریخ کے زیادہ تر واقعات ایسے ہین جن کو پڑھنے کے بعد دکھ اور رنج پہنچتا ہے،

اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ مین نے اپنی شبلی اکیڈمی کی طرف سے آج سے چودہ برس پہلے اردو مین ایک مکمل تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا، جس کی تقسیم دس بارہ جلدون مین کی گئی تھی، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی تمدنی و تعمیری ترقی مین مسلمانون نے کیا کام کیا، بحمد اللہ کہ یہ کام شروع کر دیا گیا ہے، اور اس وقت تک اس کی تین جلدین مرتب ہو چکی ہین، تمدنی کارنامون کی ایک جلد الگ تیار ہوئی ہے، ممکن ہے کہ اسی موضوع پر کئی اور جلدین لکھی جائین،

خدا کا شکر ہے کہ اب اہل ہند کو اس ضرورت کا عام احساس ہو رہا ہے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے انڈین ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد اسی غرض سے رکھی ہے، بنارس مین بھارت اتہاس پرشد اسی لئے قائم ہوئی ہے، اور ہم نے خوشی سے یہ بھی سنا کہ اس ہسٹاریکل کانگریس نے بھی جس میں ہم آپ جمع ہین، ایک تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست نے شاہانہ امداد دی ہے، امید ہے کہ یہ تینون سلسلے کامیابی کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دین گے، مگر ضرورت اصلی یہ ہے جس کا اظہار تقریر کے آغاز مین کیا گیا تھا، اسی کی یاد دہانی تقریر کے اختتام پر کی جائے کہ اب اس کے بعد ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، تو زمانہ ہو حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیون برباد کیا جائے اور کیون مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ بھی خوشگوار نہ ہو سکے،

ہندوستان کے مورخو! تم ہندوستان کی صرف تاریخ نہ لکھو بلکہ اپنے کارنامون سے ہندوستان کی نئی تاریخ بھی بناؤ، نیک ارادہ سے اٹھو خدا تمھاری مدد کرے گا،

اشتراکیت اور اسلام

جس مین اسلام اور اشتراکیت کی تعلیمات کے تقابلی مطالعہ اور اشتراکیت کے خلاف فطرت معاشی اصولون کی علمی و فنی تنقید کی گئی ہے، نیز اس کے مابعد الطبیعی نظریون پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے، ضخامت ۰۰ صفحے قیمت عہ

(از مسعود عالم ندوی)

منیجر

عرفانیاتِ فانی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی

(۲)

تصریحاتِ مذکورۂ بالا سے اہلِ ذوق کو کافی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ فانی نے درد و غم کا جو مرقع پیش کیا ہے، اس مین کس حد تک ایک زندہ روح کی آتش فشانیان نظر آتی ہین، اور وہ ہمارے قلب و نگاہ کو کہان تک ذوق و لذت کی دعوت دے سکتا ہے، لیکن ہم کو فانی سے اس کی شکایت نہین، عشق کے بار غم کا تحمل ہر شخص کا کام نہین، اس کے لئے جوہر قابل درکار ہے، جو اس کی اندرونی لذت و کشش کا احساس کرسکے، اسی بنا پر سرمد نے کہا ہے،

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند　　سوز دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

فانی کے کلام سے جو اشعار ہم نے اوپر پیش کئے ہین، ان سے ہمارے اس خیال کی کافی تائید ہوتی ہے، کہ انھون نے عشق کے درد و غم کو ایک صاحب ذوق کی نگاہ سے نہین دیکھا، ورنہ وہ دنیا کے سامنے اپنی زندگی کا یہ منظر پیش نہ کرتے،

دم بخود سکتہ کا عالم، مردنی چھائی ہوئی　　رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا

اور نہ اس مین اتنی برودت ہوتی، کہ سوز محبت جو تمام خوابیدہ احساسات کو مشتعل اور تند و تیز کر دیتا ہے، ان کے دل پر بجائے آگ کے پانی کا کام کرتا،

جو سوز محبت سے ہوا سرد وہ دل ہون　　وہ شمع ہون جس کو پر پروانہ بجھا دے

اور نہ وہ اپنی ناکامیون اور نامرادیون کا اس طرح ماتم کرتے،

نامرادی حد سے گذری حال فانی کچھ نہ پوچھ　　ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

اور نہ وہ حسرت و بیکسی کے عالم مین عمر بھر اجل کے لئے چشم براہ رہتے،

تو کہان تھی اے اجل اے نامرادون کی مراد　　مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

لیکن اگر وجدان سلیم کے انوار سے ان کی چشم بصیرت روشن ہوتی، تو یہی غمکدۂ حیات ان کو شبستان عیش نظر آتا، یہی سوز محبت ان کے ہر بُن مو کو برق سرطور کی شرر افشانیون کا گہوارہ بنا دیتا، اور عشق کی انہی ناکامیون مین اُن کو وہ سرور حاصل ہوتا، کہ ان کی ہر موج نفس موج صہبا بن جاتی، اور پھر نہ کبھی ان کو چارہ سازون کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا، نہ کبھی ان کی آنکھون سے زرد آنسو ٹپکتے، اور نہ کبھی ہجوم غم سے گھبرا کر موت کے لئے دعائین مانگتے، بلکہ وہ ایک ایسے عالم مین پہونچ جاتے، جس کا ہر گوشہ زندگی کے سوز و تپش سے آتش بجان اور جس کا ہر منظر ذوق نامحدود کی تابانیون سے مملو نظر آتا، اور بجائے یاس و حسرت کے دلدوز شکن نوحون کے ہم ان کی زبان سے عشق کا یہ نعرۂ مستانہ سنتے،

چلا جاتا ہون ہنستا کھیلتا موج حوادث سے　　اگر آسانیان ہون زندگی دشوار ہو جائے　　(اصغر)

اس شعر مین جس لطیف اور بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگر فانی کے دل مین اس کا احساس ہوتا، تو ان کا محکمۂ قلب وجگر کا مدفن نہ بنتا، اور نہ وہ اتنے کمزور مضمحل ہوتے، کہ ان کی شمعِ حیات کو پرِ پروانہ کی ایک خفیف جنبش گل کر دیتی، لیکن طبیعتون کی فطری استعداد کے فرق مراتب کو کیا کہا جائے، فانی پر ناکامیون اور دشواریون کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان کی رگ رگ فریاد کرنے لگتی ہے، زندگی سے بالکل بیزار ہو جاتے ہین، اور ان کا پورا نظامِ حیات بے کیف اور مضمحل ہو جاتا ہے، لیکن جب اہلِ ذوق کو ناکامیون اور دشواریون کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ جوشِ مسرت مین سراپا تبسم نظر آنے لگتے ہین، کہ اب زندگی کی حقیقی نشو ونما کا وقت آگیا ہے جس طرح سیلاب کے جوش وخروش کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی راہ مین آلام ومصائب کی چٹانین حائل نہ ہون، اقبال سہیل نے کیا خوب کہا ہے،

پھر موجِ زندگی مین نہین شورشِ عمل | پھر کوئی سنگِ راہ مقابل نہین رہا

یہی وجہ ہے کہ اسیرانِ محبت کو عشق کے درد وغم سے نجات حاصل کرنے کی کبھی آرزو نہین رہتی، بلکہ وہ اس جامِ تلخ کی لذت کے لئے ہر وقت بیتاب رہتے ہین، اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ بغیر اس روح پرور خلش کے گذر جاتا ہے، اُس پر ان کو ہمیشہ افسوس رہتا ہے،

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغِ اسیر | خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

یہ درد وغم کی لذت ہی تھی، جس نے حافظ کو اس دعا پر مجبور کیا تھا،

خلاص حافظ ازان زلفِ تابدار مباد | کہ بستگانِ کمندِ تو رستگارانند

یہ شراب دو آتشہ کا سرور تھا جس کی کیفیت عارفِ رومی نے ان الفاظ مین بیان کی تھی،

دلِ من از جنون نمی خسپد

غرض تم نے فانی کے دردِ محبت کا ولولہ سوز عالم دیکھ لیا، کہ وہ حقیقت مین عشق کا درد نہیں، بلکہ ایک مریضِ جان بہ لب کے کرب وتکلیف کی تصویر ہے، جس مین زندگی کی کوئی تابانی نظر نہین آتی، بلکہ جس پر سراپا عالمِ نزع کی افسردگی چھائی ہوئی اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی چشم ونگاہ کا جو محبوب ہے، وہ کیا ادائین رکھتا ہے، اور ان کا دل کس حد تک بارگاہِ حسن کا ادب شناس ہے؟ اس مین شبہہ نہیں کہ فانی کی نگاہین کبھی کبھی جمالِ حقیقی کی رنگینیون کی طرف بھی اٹھ جاتی ہین، مثلاً

فردوس بداماں ہے ہر نقشِ خیال ان کا | یہ شانِ تصور ہے، تصویر کو کیا کہیے

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر | تجلیات کے دریا بہا دیئے تو نے

ابتدائے زندگی ہے انتہائے زندگی | آپ کے خیال سے، آپ کے خیال مین

لیکن ان کی طبیعت کا رجحان عام طور پر فتنہ گران سرِبام کی عشوہ طرازیون ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے، عام غزل گو شعرائے محبوب کو ہمیشہ ایک بے رحم قاتل کی صورت مین پیش کیا ہے، جو نہایت بے دردی کے ساتھ غریب عاشق کی گردن پر چھری چلاتا رہتا ہے، لیکن قتل وخونریزی محبوب کی شان نہین، وہ قلب وجگر کو ضرور مجروح کرتا ہے، لیکن جلاد کی تیغ وسنان سے نہین، بلکہ اپنی نگاہِ ناز کی لطیف اداؤن سے جن مین زندگی کی روح پنہان ہوتی ہے، لیکن فانی کا محبوب جس بے دردی کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے، اس کی تصویر یہ ہے،

تیر سے تیغ سے خنجر سے سنان سے مارا | کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے

غور کرو یہ کسی محبوب دلنواز کی شان کرم ہے، یا صحرائے تاتار کے کسی خوفناک وحشی کی تصویر درندگی ہے جس کو دیکھتے ہی تمام نظام حواس پراگندہ ہو جائے! اتنے خطرناک اسلحہ کی پیہم چوٹین کھا کر فانی اگر فریاد و فغان اور گریہ وزاری نہ کرتے، تو پھر کیا کرتے، چنانچہ ان کی تڑپ اور بے چینی کا عالم دیکھکر ان کا دشمن بھی چیخ اٹھتا ہے،

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا　　دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رو دیا

ایسے ظالم اور سفاک سے دل لگا کر فانی کے خزانۂ محبت کو جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے، وہ یہ ہے،

انبار آنسوؤں کے ہین خونِ جگر کے ڈھیر　　معمور ہے خزانۂ سرکار آستین،

یہ ظالم صرف سنان بازی ہی کے فن سے واقف نہین ہے، بلکہ ذبح کرنے مین بھی مشتاق ہے، چنانچہ عاشق کی گردن پر اس کے خنجر چلانے کی ادا ملاحظہ ہو،

اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو　　مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

وہ جس ادا سے مقتل مین آتا ہے، اُسکی تصویر یہ ہے،

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا　　نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

وہ اتنا بڑا اپُر فن ہے، کہ عاشق قضا کو دولھن بنا کرنے آتا ہے، تاکہ اس کو فرار و گریز کا خیال نہ آسکے،

ادھر سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے　　مری قضا کو وہ لائے دولھن بنائے ہوئے

اس کی ستم ظریفی کا یہ حال ہے، کہ زندگی میں تو کبھی غریب عاشق کی خبر نہیں لی، لیکن میت پر آکر پوچھتا ہے کہ تمھارا مدعا کیا ہے؟

مری میت پہ ان کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے　　دل بے مدعا سے پوچھتے ہین مدعا کیا ہے

وہ عاشق کو اتنا سادہ لوح سمجھتا ہے کہ اس کی لاش پر موت کو کوستا ہے، حالانکہ دراصل وہ خود اس کی موت کا سبب ہے، چنانچہ دبی زبان سے یون عرض کرتے ہین،

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہین　　آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

اس کی فتنہ پردازی اور شوخی و شرارت کا یہ عالم ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ عاشق کو چین سے سونے نہین دیتا،

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم　　کہ جنازے پہ وہ غارت گر خواب آتا ہے

عاشق کی میت پر وہ اپنا عذر تاخیر ان الفاظ مین پیش کرتا ہے،

ہائے ان کا مری میت پہ یہ عذر تاخیر　　سو گئے تم مرے دامن کی ہوا سے پہلے!

ایسے دامن کو کیا کہا جائے جس کی ہوا سے سکون مرگ طاری ہو جاتا ہے!

فانی کے مدفن کے لئے وہ روز ایک قیامت برپا کرتا رہتا ہے،

مدفن جو سر رہ گزر دوست ہے فانی　　روز ایک قیامت مرے مدفن کے لئے ہے

لیکن اس مصیبت کے ذمہ دار آپ خود ہین، آپ کو جب یہ معلوم تھا، کہ آپ کا دوست اتنا شریف اور مہربان انسان ہے کہ مرنے کے بعد بھی آپ کو اذیتین پہونچانے سے باز نہین آسکتا، تو پھر آپ نے اس کی رہگذر مین اپنا مدفن بننے کیون دیا؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کو گورِ غریبان کی سیر کا اس قدر شوق ہے کہ صبح اٹھتے ہی پہلا کام وہ یہی کرتا ہے،

سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے　　چراغ ہین مری تربت کے جھلملائے ہوئے

اس لئے مدفن کہیں بھی ہوتا، اس کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا،

اس کا خنجر وہ روح کش آلہ ہے کہ جس کو موت بھی نہیں مٹا سکتی، اس کو وہ دم بھر میں فنا کر سکتا ہے، چنانچہ شاعر شب غم میں اسی کی مدد کا طلب گار ہے،

شب غم میں بھی میری سخت جانی کو نہ موت آئی | ترا کام اے اجل اب خنجرِ قاتل سے نکلے گا

اس کی نگاہ اس قدر ہولناک واقع ہوئی ہے، کہ اس کو دیکھتے ہی فانی کو مرگِ ناگہان کی بے بہا دولت حاصل ہو جاتی ہے،

آخر نگاہِ دوست میں فانی نے پا لیا | یوں مرگِ ناگہاں تجھے ڈھونڈھا کہاں کہاں

اس کی جان نوازی کا یہ عالم ہے، کہ شاعر اس سے حالتِ نزع میں سازِ مرگ کے چھیڑنے کی فرمایش کرتا ہے۔

بالیں پہ آکے نزع کے پردے میں چھیڑ دو | نغمے جو سازِ مرگ میں سوئے ہوئے سے ہیں

لیکن اس کو اس کی خبر کہاں تھی، کہ حُسن کے دستِ ناز میں وہ ربابِ آتشیں ہے، جس کے نغموں کی شرر فشانی سے اقلیمِ جاں کا ہر گوشہ دہک اٹھتا ہے،

بیخود و محو جسم و جاں مست زمین و آسمان | حُسن نے دستِ ناز سے چھیڑ دیا ہے سازِ عشق (اصغر)

امثالِ مذکورۂ بالا سے تم کو فانی کے محبوب نظر کی حقیقت کا کافی اندازہ ہو گیا ہوگا، اب اس کی کچھ اور ادائیں دیکھنا چاہو تو اشعارِ ذیل حاضر ہیں،

تری ترچھی نظر کا تیر ہے مشکل سے نکلے گا | دل اس کے ساتھ نکلے گا، اگر یہ دل سے نکلے گا
وہ میری لاش پہ ہمت سی کچھ اٹھا کے چلے | مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے
تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے | وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
بہر یک تو جہ تھا اک خطا پیمانہ | محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی
اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے | چشم بد دور دلھن بن کے شباب آتا ہے
نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے | ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی
وہ ایک اچٹتی سی قاتل کی نظر تو یہ | دم توڑ دیا دل نے گو زخم نہ تھا کاری
جب ذرا پردے سے جھانکا بجلیاں گرنے لگیں | ہے کوئی یہ دیکھنے میں بندہ پرور دیکھنا
اور ہی بل ہو تری زلفوں میں آج | کون گرفتارِ بلا ہو گیا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا دل زیادہ تر فتنہ گرانِ لبِ بام ہی کی تیغِ ادا کا زخم خوردہ ہے، ترچھی نظر سے تیر چلانا، عاشق کی لاش پر مسکرانا اس کے مدفن سے اٹھکیلیاں کرنا، انگڑائیاں لیتے ہوئے محفل سے اٹھنا، گھبرا کر روٹھ جانا، پردے کی آڑ سے جھانکنا، دولھن کی طرح اپنی اداؤں سے شرمانا، منہ پھیر کر عاشق کی گردن پر چھری چلانا آستین چڑھا کر مقتل میں آنا، مختلف اسلحہ سے حملہ آور ہونا، خوفناک نگاہوں سے پیامِ اجل سنانا، میت پر ماتم کرنا، موت کو کوسنا، قبرستان کی سیر کرنا، دامن کی ہوا سے بجائے بیدار کرنے کے سکونِ مرگ طاری کر دینا وغیرہ کیا انھی مبتذل اور عامیانہ اداؤں کی نمایش کا نام حسن ہے؟ کیا ایسے بد مذاق ظالموں کی محبت سے قلب و روح کے اندرونی لطیف احساسات شگفتہ اور مشتعل ہو سکتے ہیں؟ کیا انھی فتنہ گروں کی نگاہِ سحر طراز کے متعلق خواجہ حافظؒ نے یہ دعویٰ کیا تھا،

مشکل خویش بر پیر مغان بردم دوش — کاو بہ تائید نظر حل معما می کرد

غرض فانی کے احساس محبت میں عام طور پر جو روحانی اضمحلال، ضعف، بےحسی اور افسردگی نظر آتی ہے، اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ انھوں نے حسن کی حقیقی عظمت اور اس کی روحانی پاکیزگی اور لطافت کا اندازہ بہت کم کیا، یعنی ان کے پیش نظر یہ حقیقت نہین رہی کہ حسن سراپا حُسن ہے، اس کا قدر عنا جمالِ روحانی کا نظارہ گاہ ہے، اس کا چہرۂ رنگین صبح زندگی کا گہوارۂ انوار ہے، اس کی نگاہ ناز کا ہر اشارہ سازِ لاہوتی کا ایک نغمۂ بے صدا ہے، اس کے دستِ کرم مین جام زہر نہین، بلکہ بادۂ حیات کا وہ ساغر رنگین ہے، جس کا ایک جرعہ ہر رگ و پے کو نشاطِ ابدی سے سیراب کر دیتا ہے، اس کی تیغِ ادا کسی بے درد ظالم کا آلۂ قتل نہین، بلکہ مہر و محبت کی وہ تلوار ہے، جس کا زخم خوردہ کراہتا اور مرتا نہین، بلکہ زندہ رہ کر جوشِ مسرت مین مسکراتا رہتا ہے، وہ دل مین درد پیدا کرتا ہے، لیکن وہ درد نہین، جو قلب و جگر کو مضمحل اور بےحس بنا دیتا ہے، بلکہ وہ درد جس کی لذت سے زندگی کی روح پرورش پاتی ہے، اس کی بارگاہِ فیض سے آنسوؤن کے انبار اور خون کے ڈھیر نہین، بلکہ جوشِ مستی اور سوز و گداز کا وہ کیف و سرور عطا ہوتا ہے، جس کے بل پر ایک گدائے خاک نشین بام عرش کے کنگرون کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، وہ کوئی پیکرِ جسمانی نہین جو نگاہون کو نظر آسکے، یا جس کی تلاش گلی کوچون مین کیجائے، بلکہ وہ ایک روح ہے، جو عالم کے ریشہ ریشہ مین حرکت کر رہی ہے، وہ ایک نور ہے، جس سے کائنات کا ہر گوشہ روشن ہے، غرض اس کی ہر ادا لطافت اور پاکیزگی کا آئینہ ہے جس مین کسی مادی آلائش کی گنجائش نہین،

یہی وہ محبوبیت کا پیکر لطیف ہے، جس کا ذوقِ پرستش چشمِ بصیرت کے سامنے تجلیات روحانی کا ایک نامحدود عالم بے نقاب کر دیتا ہے، یہی وہ حسن سحر طراز ہے، جس کی برقِ تبسم کی موج شرر فشان سے آبِ حیات کے قطرون کی ریزش ہوتی ہے یہی وہ قاتل ہے، جس کا ہر وار دردمندانِ محبت کے لئے حیاتِ نو کا پیام ہے، یہی وہ پیمانہ بدست ہے جو صرف اپنی خمار آلود نگاہون کی جنبش سے تشنگانِ ذوق کو اس طرح سیراب کر دیتا ہے، کہ پھر ان کو زمین سے آسمان تک بجز مسرت کے اور کچھ نظر نہین آتا،

ظاہر ہے کہ جو دل ایسے نگار جان نواز کا کشتۂ محبت ہوگا، اس کی روحانی استعداد و صلاحیت کی کیا حالت ہوگی، اور اُس کے ترانہ ہائے درد و غم کی رنگینیون اور نشہ فشانیون کا کیا عالم ہوگا!

حقیقت یہ ہے کہ عشق کی تپش و حرارت کا اصلی سرچشمہ حُسن ہے، اس لئے حسن جس قدر لطیف اور کامل ہوگا، اسی قدر عشق بھی قوی اور مشتعل ہوگا، لیکن چونکہ حُسن کامل شاہدِ حقیقی کا حصہ ہے، اس لئے جو لوگ اس کے جادہ شناس ہوتے ہین انہی کا کلام سرتا پا سوز و اثر سے لبریز ہوتا ہے، اور انہی کی اداؤن مین عشق و محبت کی حقیقی حرارت اور جوشِ مستی کی تصویر نظر آسکتی ہے، عرفی نظیری وغیرہ کی جدت طرازیون سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن کیا ان کے دفتر تغزل مین مولانا روم کے جذبۂ عشق کی سی شانِ جلال و عظمت کی کوئی مثال مل سکتی ہے:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزدان گیر

یہ وہ شعر ہے جس پر مرزا غالب سر دھنا کرتے تھے، آج خواجہ حافظ کے آئینۂ محبت مین اہلِ ذوق کو وادیِ ایمن کی جو شرر باریان نظر آتی ہین وہ اسی جمالِ حقیقی کی آستان بوسی اور عظمت شناسی کا فیض ہے، جس کی بدولت ان کی زبان سے یہ نعرۂ مستانہ بلند ہوتا تھا،

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بین — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

غرض ہمارے نزدیک تغزل کے لئے فلسفیانہ دماغ نہین، بلکہ ایک مضطرب روح، ایک تابِ اور درد آشنا دل کی ضرورت ہے، جس کو ایک طرف حریم حُسن کے آداب کا یہ پاس ہو کہ

نیاز رکھ کے بھی عرضِ نیاز رہنے دے (اصغر)

اور دوسری طرف اس کا بھی احساس ہو تاکہ باوجود عجز و درماندگی کے عشق مین وہ قوت ہے جو کائناتِ عالم کو ہلا سکتی ہے، اور جس کے جنونِ آرزو کے جوشِ بے پایان کو فضاے آسمانی کی وسعت بھی تنگ نظر آتی ہے،

یہ جہانِ مہ و انجم ہے تماشا مجھ کو — دشت دنیا تھا باندازۂ سودا مجھکو (اصغر)

مین نے اس تنقید کے دوران مین اکثر اصغر مرحوم کے اشعار نقل کئے ہین جس سے شاید ناظرین کو یہ گمان ہو کہ مین فانی کا ان سے مقابلہ کر رہا ہون، حالانکہ یہ میری ہرگز نیت نہین ہے، ان مثالون سے صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ فانی نے تغزل کا جو نمونہ پیش کیا ہے، اس مین قلب و روح کے لئے ذوق و لذت کا سامان بہت کم ہے، اور اس مین بیشتر صرف قدیم رنگ سخن کی تقلید ہے جس مین حسن و عشق کی بلند اور لطیف اداؤن کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک تغزل کی معنوی حیثیت مین کوئی قابلِ قدر اضافہ نہین ہوتا، اور فانی کی چشم پاس کی اشک افشانی او حسرت زدہ دل کی افسردگی سے عشق کی حرارت و گرمی، جذبات محبت کی بلندی و پاکیزگی اور اس کی ساری لطیف و حالی کیفیتین جو تغزل کا اصل سرمایہ ہین بجھ کر رہ گئی ہین، ممکن ہے فانی کی یہ اداے غم کسی سوگوار طبقون کو کسی قدر خوشنما معلوم ہوتی ہو، لیکن افسوس ہے کہ غزل کی بزم کیف مین اس کی گنجائش نہین وہ ایک شرارِ معنوی ہے جس کے رقص نورانی سے قلب و روح کی تمام گہرائیان دفعتہً جگمگا اٹھتی ہین، اور زندگی کا حقیقی جلوہ ہمارے چشم بصیرت کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے،

فانی نے ایک شعر مین اپنے سوزِ دل پر اس طرح فخر کیا ہے،

کیون اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل — لایا ہون دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

لیکن افسوس ہے کہ ان کے کلام سے ہم کو اس کا کوئی ثبوت نہین ملتا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کے داغ دل مین بجائے برق سرِ طور کے جلوؤن کے صرف چراغ سرِ مزار کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آتی ہے،

بہرحال مصورِ "یاسیات" کی زبان سے عشق و محبت کے سوز و تپش کا ادعا کسی طرح مناسب نہین معلوم ہوتا، فانی زندہ ہوتے تو ان کی خدمت مین دبی زبان سے یہ عرض کرنے کی جرأت ضرور کرتے

تو در ہواے آنکہ نگہ آشناے اوست — من در تلاشِ آنکہ نتابد نگاہ را

یہ شکایت ہم کو عام طور پر تمام غزل گو شعرا سے ہے، جن کی نگاہ حسن و عشق کی حقیقی خصوصیات تک پہونچنے سے اکثر قاصر رہتی ہین، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام سوز و اثر سے خالی ہوتا ہے، اور ان کی شاعرانہ صناعیون مین دل کو کوئی لذت محسوس نہین ہوتی،

کہا جاتا ہے کہ فانی فلسفہ لکھتے ہین، ممکن ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہو، لیکن ہمارے نزدیک غزل کے لئے فلسفہ ضروری نہین کیونکہ غزل کا تعلق دماغ سے نہین بلکہ دل سے ہے، اس لئے اس کی اصلی روح جذبات ہین، جن کے بغیر غزل ایک پھول ہے جس مین نشہ نہیں نغمہ ہے جس مین سرور نہین، راکھ کا ایک ڈھیر ہے جس مین کوئی تپش نہین، فانی کی غزلون کا بعینہٖ یہی عالم ہے جن کو پڑھ کر بجائے مستی و بیداری کے قلب و روح پر سکون مرگ طاری ہونے لگتا ہے،

(باقی)

کیا مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے؟

از

جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جونا گڑھی

علمائے اسلام نے موضوعاتِ علوم پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، یہاں تک کہ انسائیکلو پیڈیا کی طرز کی کتابیں لکھنا ایک باقاعدہ فن ہوگیا، اور ہر علم و فن پر خاص کتابیں بھی لکھی گئیں، انہی کتابوں میں سے ایک کتاب مدینۃ العلوم بھی ہے جو آج تک ہم یہی پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں کہ اس کتاب کا مصنف ازنیقی ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے کتبخانہ خدیویہ مصر اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہیں، اب تک جتنے اقتباسات اس کتاب کے نظر سے گذرے وہ سب کے سب ازنیقی کی طرف منسوب دیکھے گئے، لیکن جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ کتاب مذکور جو ازنیقی سے منسوب ہے، امیر احمد بک تیمور کی تحقیق کے مطابق دراصل طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے[1] ایک اور مقام پر زیدان نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

> "مدینۃ العلوم: تعریفات علوم اور مصنفین کے حالات میں از مصطفیٰ بن خلیل (دسویں صدی) اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے، جو ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، مؤلف سے اس کتاب کی نسبت کے متعلق اختلاف ہے کیونکہ کتب خانہ خدیویہ کے نسخہ میں کتاب کے نام (سرورق پر) کے ساتھ مصنفہ شیخ الاجل امام مولانا و سیدنا مفتی المسلمین لکھا ہوا ہے، اور مقدمہ کے دوران میں لکھا ہے کہ اس کے مؤلف شمس الدین بن قاضی برہان الدین ابراہیم بن ساعد انصاری ہیں، جو ۹۰۳ھ میں قاہرہ میں موجود تھے، اور ابجد العلوم میں لکھا ہے کہ مدینۃ العلوم کا مؤلف ازنیقی (ازنیقی) ہے، حالانکہ کتاب میں ایسے لوگوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جو نویں صدی کے بعد گذرے ہیں کیونکہ اس میں سیوطی متوفی ۹۱۱ھ سے استشہاد کیا گیا ہے، پس اس کا مولف دسویں یا گیارہویں صدی کا ہے، اور کتاب کا موضوع مفتاح السعادہ از طاش کبری زادہ یا کشف الظنون کے قبیل سے ہے"[2]

قبل اس کے کہ اس اختلاف نسبت پر بحث کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زیدان کے بیان میں جو غلطیاں ہیں ان کی تصحیح کر لی جائے،

(۱) مدینۃ العلوم کا مصنف مصطفیٰ بن خلیل کو بتایا ہے، اس کی جگہ اس کے بیٹے احمد بن مصطفیٰ بن خلیل طاشکبری زادہ المتوفی ۹۶۸ھ[3] کا نام ہونا چاہئے[4]

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد ۳ ص ۲۷۵، [2] ایضاً جلد ۳ ص ۲۳۹، [3] العقد المنظوم میں بھی یہی سنہ وفات ہے، جو بالکل صحیح ہے تعجب ہے مفتاح السعادۃ مطبوعہ دائرۃ المعارف کے سرورق پر طاشکبری زادہ کا سنہ وفات ۹۶۲ چھپا ہے، جو صریحاً غلط ہے اس لئے کہ انھوں نے ۹۶۵ھ میں تو اپنی آخری کتاب الشقائق النعمانیہ لکھی ہے، جیسا کہ خود انھوں نے آخر کتاب میں اپنے حالات میں تحریر کیا ہے، [4] دیکھو مصطفیٰ کا تذکرہ جو ان کے بیٹے احمد نے اپنی کتاب الشقائق النعمانیہ (بہامش ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۷) میں کیا ہے، اس میں اس نام کی کتاب کا ان کی تصنیف سے ہونا نہیں بتایا گیا،

(۲) ازنیقی کو "ازنقی" لکھا ہے، جو صریحاً غلط ہے، ابجد العلوم مین بھی اس کو ازنیقی لکھا ہے،

اس تمام لمبی چوڑی تحریر کے بعد بھی یہ نہین بتایا گیا، کہ آخر اس کتاب کا مؤلف کون ہے، پھر مکتبۂ خدیویہ کے نسخے سے ایک اسم مجہول کو بطور مؤلف پھر صدر مقدمہ مین شمس الدین بن قاضی برہان الدین کو اس کا مؤلف بتا کر آخر مین لکھا ہے کہ اس کا مؤلف کوئی دسوین صدی کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

الغرض جرجی زیدان نے کوئی فیصلہ کن بات نہین بتائی کہ آخر مدینۃ العلوم کا مؤلف کون تھا؟ اس کی عبارت سے صرف دو باتین معلوم ہوتی ہین:

(۱) مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تالیف ہے، جو دسوین صدی ہجری مین گذرے ہین،

(۲) اصل کتاب کے مقدمہ مین شمس الدین بن ابراہیم کا نام بطور مؤلف لکھا گیا ہے جو صحیح نہین معلوم ہوتا،

مدینۃ العلوم کو اور مصنفین نے بھی طاشکبری زادہ کی تالیف بتایا ہے، چنانچہ صاحب عقد المنظوم نے ان کے تذکرہ مین لکھا ہے:-

"اور ایک کتاب لکھی ہے جس مین علوم کی قسمین اور ان کے موضوعات ہر فن کی مشہور تصنیفات مع مختصر حالات بیان کئے ہین[۱]"،

اس مین صرف کتاب کا موضوع بتایا گیا ہے، کتاب کے نام کی تصریح عقد المنظوم ہی کے حوالہ سے مولانا عبد الحی لکھنوی مرحوم نے اس طرح کی ہے:-

"اور ایک کتاب ہین علوم کی قسمیں اور ان کے موضوعات بیان کئے ہین اور اس کتاب کا نام مدینۃ العلوم ہے[۲]"

رہا اس کا شمس[۳] الدین کی تصنیف ہونا، تو حاجی خلیفہ نے ان کی کتاب ارشاد القاصد فی اسنی المقاصد[۴] کے متعلق جو موضوعات علوم پر بہترین کتاب ہے، لکھا ہے کہ یہ کتاب طاشکبری زادہ کی مفتاح السعادۃ کا ماخذ ہے[۵] اس لئے بہت ممکن ہے کہ مفتاح السعادۃ اور مدینۃ العلوم دونون طاشکبری زادہ کی تصنیف سے ہون، یا پھر دونون کتابیں ایک ہی ہون، نواب صدیق حسن خان مرحوم اپنی کتاب ابجد العلوم کا ماخذ تمامتر ازنیقی کی مدینۃ العلوم کو بتاتے ہین، جو ان کی معتمد علیہ کتاب ہے، ساتھ ہی وہ اس بات کے بھی قائل ہین کہ مفتاح السعادۃ اور مدینۃ العلوم کی عبارت مین کوئی فرق نہین ہے، مفتاح السعادۃ سے وہ واقف نہ تھے، بلکہ صرف کشف الظنون میں اس کے منقولات انھون نے دیکھے تھے،

چنانچہ فرماتے ہین:

"اور ہم کتاب مفتاح السعادۃ سے واقف نہ تھے، بجز اس کے جو اس کتاب سے کاتب چلپی نے کشف الظنون مین نقل کیا ہے، جب مدینۃ العلوم کو ہم نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گویا وہ مفتاح السعادۃ ہی ہے، ان دونون کی عبارتین اس قدر ملتی جلتی ہین کہ ان مین ذرہ بھر فرق نہیں پایا جاتا، لیکن صاحب کشف الظنون نے مدینۃ العلوم کا ذکر ہی نہین کیا، جیسا کہ اوس نے مفتاح السعادۃ کا تذکرہ کیا ہے، حالانکہ مدینۃ العلوم اس سے پہلے

---

[۱] العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم بہامش ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۱، [۲] طرب الاماثل بتراجم الافاضل ص ۵۱، طبع لکھنؤ، [۳] شمس الدین محمد بن ابراہیم بن ساعد الانصاری المتوفی ۷۴۹ھ کا تذکرہ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۲۷۹، صفحہ مین لکھا ہے، حاجی خلیفہ نے ان کی تاریخ وفات ۷۹۴ھ غلط لکھی ہے [۴] ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے اس کو حدود النحو کے ساتھ شائع کیا ہے، مختصر رسالہ ہے، موضوعات علوم مین کہین کہین اس کی عبارتین مفتاح السعادہ سے ملتی جلتی ہین، حالانکہ مفتاح السعادۃ مین مصنف یا ان کی اس کتاب کا ذکر کہین نہین پایا جاتا [۵] کشف الظنون ج ۱ ص ۴۸،

کی تصنیف ہے تو ہمیں ان دونوں کتابوں میں مبنی اور معنی کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں معلوم ہوا، بجز اس کے کہ ان کے نام جدا ہیں، مگر موضوع کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں[1]۔

لیکن خود ابجد العلوم مدینۃ العلوم کی نقل ہے، مصر کے مشہور محقق احمد زکی پاشا جنھوں نے اسلامی موسوعات (مفوعات) پر ایک محققانہ رسالہ لکھا ہے، ابجد العلوم کو مدینۃ العلوم یا مفتاح کی نقل بتاتے ہیں، چنانچہ ازنیقی کی مدینۃ العلوم کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"ازنیقی کی کتاب مدینۃ العلوم ہے، اس پر صاحب ابجد العلوم نے اپنی کتاب کے اکثر مقامات اور ابواب میں اعتماد کیا ہے، اور اس کے مقدمہ سے بعض نئی معلومات نقل کی ہیں، اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ مدینۃ العلوم اور مفتاح السعادۃ دونوں ایک ہی کتابیں ہیں، یا ایک نے دوسرے سے نقل کر لی ہے مصنف کے نام کا ذکر کئے بغیر اس سے میرا تعجب بڑھ گیا جس نے میری طبیعت میں کاوش پیدا کر دی خصوصاً جب کہ میں نے یہ دیکھا کہ صاحب ابجد نے مدینۃ العلوم کی فہرست اور بعض علوم کے ساتھ بعض کے ربط کی کیفیت کو نقل کر دیا ہے مجھے فہرست مفتاح السعادۃ کے ساتھ اس کی پوری مشابہت معلوم ہوئی جب کہ میں کتب خانہ خدیویہ میں یہ رسالہ لکھنے میں مشغول تھا، اور ابجد سے واقف ہونے سے پہلے میں مدینۃ العلوم سے آگاہ ہو چکا تھا"[2]

اس کے بعد ابجد کی محولہ بالا عبارت کو نقل کرتے ہوئے احمد زکی لکھتے ہیں:-

"جب میں نے یہ دیکھا تو میں کتب خانہ خدیویہ میں دوبارہ جانے سے اپنے آپ کو نہ روک سکا، اور میں نے مدینۃ العلوم کے مقدمہ اور اس کی فہرست سے (جیسی کہ وہ ابجد العلوم میں منقول ہے) مفتاح السعادۃ کے مقدمہ اور فہرست کا مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ دونوں کتابیں بعض الفاظ کی کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے سوا جس کو کوئی محسوس نہیں کر سکتا، ایک ہی ہیں"[3]

امور متذکرۂ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مدینۃ العلوم نام کی جو کتاب ہے وہ مفتاح السعادۃ کی نقل ہے، اور دونوں کتابوں کا مصنف طاشکبری زادہ ہے، نیز یہ کہ مفتاح السعادۃ کا اصلی ماخذ ارشاد القاصد ہے لیکن احمد زکی کا یہ لکھنا کہ مدینۃ العلوم نام کی ایک مجہول المصنف کتاب کو طاشکبری زادہ نے اڑا لیا، اور اپنے نام سے شائع کر دیا صریحاً زیادتی ہے، اور یقیناً غلط ہے، خود ان کو بھی اس کا یقین نہیں تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"مگر طاشکبری زادہ کی علمیت اور شہرت نیز ان کی کئی مفید کتابوں کا متداول ہونا ان کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں، کاش میں جان سکتا، کہ اس اشکال عظیم کی اصل حقیقت کیا ہے، آیا انھوں نے اس ضخیم کتاب (مدینۃ العلوم) کو چرا لیا، اور علماء کو دھوکا دینے کے لئے اس کا نام بدل ڈالا، میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس بحث کو میں آئندہ زمانہ کے لئے چھوڑتا ہوں کہ وہی اس امر عجیب پر سے پردہ اٹھائے گا، اور اصل حقیقت کو بیان کرنے کا کفیل ہوگا"[4]

---

[1] ابجد العلوم ص ۲۰۹ طبع بھوپال [2] و [3] موسوعات العلوم العربیہ ص ۳۰ سنہ ۱۳۰۸ھ [4] ایضاً صفحہ ۳۱۔

مطبوعات جدیدہ

شاہ اسمٰعیل شہید مرتبہ جناب عطاء اللہ صاحب بٹ تقطیع بڑی ضخامت ۲۱۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور،

ہماری جدید تعلیم یافتہ نسل خصوصاً نوجوانون کا طبقہ ہندوستان مین اپنے اسلاف کے مجاہدانہ کارنامون سے عموماً ناواقف ہے، مسلمان سلاطین کے حالات سے تو اسکول کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن حضرت مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ دہلوی حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم کے کارنامون سے بہت سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ اشخاص تک ناواقف نکلین گے، خوشی کا مقام ہو کہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس نے ان بزرگون کی یاد کو تازہ رکھنے اور نوجوانون کو ان کے کارنامون سے روشناس کرنے کے لئے ان کی یادگار منانے کا سلسلہ شروع کیا ہے جس مین ان کے حالات اور کارنامون پر مضامین پڑھے جاتے ہین، زیر نظر مجموعہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے متعلق اردو اور انگریزی کے مضامین پر مشتمل ہے، لکھنے والون مین مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مولانا محمد میان مرادابادی ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر تصدق حسین خان، غلام رسول صاحب مہر، نصر اللہ خان صاحب عزیز، پروفیسر عبد القیوم صاحب، خواجہ عبد الوحید صاحب، پروفیسر سلیم چشتی اور لاہور کے متعدد اصحاب قلم ہین، پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس کا یہ ملی احساس قابل ستایش ہے، ہمارے ہوشمند دوسرے مسلمان نوجوانون کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے جن کی قومیت پرستی کی معراج ملحدانہ اشتراکیت اور جن کی علمی و ادبی کائنات نئے ادب سے آگے نہیں بڑھتی،

فیصلہ کن جنگین مؤلفہ جناب محمود خان صاحب مورخ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عا، پتہ ملک بک ڈپو لکشمی اسٹریٹ لاہور،

ہندوستان کی سرزمین پر محمود غزنوی بلکہ اس سے بھی پہلے محمد بن قاسم کے حملہ سے لیکر سلطان ٹیپو اور انگریزون کی جنگ تک بہت سی اہم لڑائیان ہوئین جن کا اثر کسی نہ کسی حیثیت سے سارے ہندوستان پر پڑا، مولف نے اس کتاب مین ان مین سے آٹھ لڑائیون پرتھوی راج اور محمد غوری کی جنگ تھانیسر ۱۱۹۲ء بابر اور ابراہیم لودی کی جنگ پانی پت ۱۵۲۶ء ہمایون اور فرید خان کی جنگ قنوج ۱۵۴۰ء اکبر اور ہیمو کی جنگ پانی پت ۱۵۵۶ء دکن کی ہندو اور مسلمان حکومتون کی متحدہ جنگ تالی کوٹہ ۱۵۶۴ء سراج الدولہ اور انگریزون کی جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء احمد شاہ ابدالی اور مرہٹون کی جنگ پانی پت ۱۷۶۱ء ٹیپو اور انگریزون کی جنگ سرنگا پٹم ۱۷۹۹ء کے حالات لکھے ہین جو ان کے نزدیک اپنے نتائج کے اعتبار سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن تھین اور جن کا اثر سارے ہندوستان پر پڑا ان لڑائیون کے درمیانی زمانون کے مختصر حالات بھی لکھدیے ہین جن سے تاریخی خلا محسوس نہیں ہوتا ہر جنگ کے حالات کے آخر مین اس کے ماخذ بھی دیدیے ہین، جابجا حالات کے ضمن مین بھی حوالے ہین، کتاب مفید ہے،

ذکر جمیل از جناب ماہر القادری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن،

ذکر جمیل مصنف کی نعتیہ نظمون کا مجموعہ ہے، ان کا کلام اور ادبی ذوق تعارف سے مستغنی ہے، زیر نظر مجموعہ مین بھی ان کا حسن مذاق نمایان ہے، خیالات بڑی حد تک نعت کی عام افراط و تفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہین کہین کہین پر خفیف لغزش چندان قابل توجہ نہین انداز بیان دلکش اور موثر ہے، یہ نظمین میلاد کی مجلسون مین پڑھنے کے لائق ہین،

"م"

جلد ۵۶ ماہ جمادی الاول مطابق ماہ مئی ۱۹۴۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۹۷-۹۸
خطبۂ صدارت	"	۹۹-۱۰۶
غیر اسلامی ممالک میں سود و قمار کا حکم	جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی،	۱۰۷-۱۱۳
"عرفانیات فانی"	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی	۱۱۴-۱۱۹
روم کا ایک خط	جناب ریاض الحسن صاحب	۱۲۰-۱۲۳
"ادب اور زندگی"	" "	۱۲۴-۱۲۶
مطبوعات جدیدہ	"	۱۲۷-۱۲۸

شذرات

دار المصنفین صرف دار الاشاعۃ نہیں ہو بلکہ یہ ایک دار التکمیل اور دار التربیۃ ہے جہان عربی و انگریزی کے فارغ التحصیل سلیم الذوق اصحاب پانچ برس رہکر مزید تحقیق و تدقیق تلاش و جستجو اور توسیع علم و مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں اور ان کی تلاش اور محنت کے نتیجے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، اس کی گذشتہ تیس سال کی زندگی میں متعدد فضلا یہان سے فارغ ہوکر باہر گئے، اور ملک و ملت ان کی تصنیفات و تحقیقات سے مستفید ہوا اور ہو رہا ہے،

اس سلسلہ میں مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم کا پہلا نام ہی جو یہاں سے پہلے کلکتہ لائبریری میں پھر اورینٹل لائبریری پٹنہ میں اور پھر مدرسہ شمس الہدی پٹنہ میں صدر مدرس ہوئے، دوسرا نام پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کا ہی، جو اس وقت اسماعیل کالج بمبئی میں السنہ مشرقیہ کے معلم ہیں، تیسرا نام مولوی سعید صاحب انصاری کا ہی جو ہندوستانی ایکاڈمی الہ آباد کے رسالہ میں اڈیٹر ہوئے، چوتھا نام مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے کا ہی جو اب مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہیں، پانچویں صاحب مولوی ابو الجلال صاحب ندوی ہیں، جو اس وقت جامعۂ دار السلام عمرآباد کے سلسلہ تالیف و تصنیف میں منسلک ہیں، چھٹے صاحب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ہیں، جو پہلے یہان سے شانتی نکیتن بنگال میں عربی کے پروفیسر ہو کر گئے، اور اب گجرات ورنیکلر سوسائٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔

اس سلسلہ کا اخیر نام مولوی محمد اویس صاحب نگرامی ندوی کا ہی، جو ابھی پانچ برس کی مدت ختم کرکے دار العلوم ندوۃ العلما میں دروس قرآنیہ در علوم قرآنیہ اور فقہ و کلام کے مدرس ہو کر گئے ہیں، دلی دعا ہی کہ اللہ تعالیٰ اُن سے مدرسہ مذکور کے طلبہ کو مستفید فرمائے،

انگریزی یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر اور ڈاکٹریٹ کے طالب علم بھی وقتاً فوقتاً یہان سے مستفید ہوتے رہتے ہیں خطوط سے

مشغول رہتے اور کبھی کبھی یہان قیام کرکے اپنے مقالون کو تیار کرتے ہین، اس سلسلہ مین ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب العلم مہینون یہان مقیم رہے اور اپنے کام کو تکمیل کو پہنچایا، اور ابھی بمبئی یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے کراچی سے آکر ایک ہفتہ رہکر اپنی ضرورت کے معلومات فراہم کئے، ایسے شائقین کے لئے دار المصنفین کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہین،

دار المصنفین کا اس سے بھی ایک وسیع کام تلاش و تحقیق کے جویا کے لئے معلومات کی فراہمی اور ان کے علمی اشکالات کے حل کی تلاش ہے، چنانچہ اس قسم کے خطوط کے جوابات روزانہ ہمارے رفقاء اور مصنفین لکھ کر بھیجا کرتے ہین،

دار المصنفین کی طرف سے تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے دو سلسلون کے شروع ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، خدا کا شکر ہو کہ یہ دونون سلسلے اتمام کو پہنچ رہے ہین، گو ابھی تک کاغذ اور چھپائی کے سامان کی کیابی سے وہ چھپ نہیں سکے، تاریخ اسلام کے دو سلسلے مین ایک مشرقی سلطنتون کا اور دوسری مغربی، مشرقی سلطنتون کی تاریخ کی ترتیب مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کر رہے ہین، اس سلسلہ کی تین جلدین چھپ چکی ہین، اور چوتھی زیر طبع ہے، اس پر بنی عباس کی سیاسی تاریخ ختم ہو جائیگی، اور پانچوین جو اُن کے علمی و تمدنی کارنامون پر مشتمل ہوگی، زیر ترتیب ہے، اس کے بعد سامانیون، دیلمیون، سلجوقیون، غزنویون اور خوارزم شاہیون کی جلدین ہون گی انشاء اللہ تعالیٰ

مغربی سلطنتون کا کام مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، اور سات آٹھ سال سے وہ اس مین لگے ہوئے ہین، اس سلسلہ مین صقلیہ (سسلی) کی محققانہ تاریخ دو جلدون مین لکھ کر وہ پیش کر چکے ہین، اور وہ کتابین اہل شوق کے ہاتھون مین پہنچ چکی ہین، اب وہ اندلس اور افریقہ کی تاریخون کی ترتیب دے رہے ہین، اور ان کا بہت سا کام وہ ختم کر چکے ہین، اور اب عنقریب ان کی اندلس کی جلد مطبع مین جانے والی ہے،

سب سے لمبی اور طویل اسلامی سلطنت دولتِ عثمانیہ (ٹرکی) ہے، اس کی تاریخ کی ترتیب کا کام مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے نے انجام دیا ہے جس کی دو جلدین چھپ چکی ہین، اور تیسری زیر قلم ہے، اور اس پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہوگا،

تاریخ ہند کی دو ابتدائی جلدین جن مین سے پہلی سندھ کی عربی ریاستون کی تاریخ اور دوسری غزنویون سے متعلق ہے مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی نے لکھی ہیں اور بالکل تیار ہیں، اس سلسلہ کا ایک حصہ جو ہندوستان کی اسلامی سلطنتون کے علمی و تمدنی کارنامون پر مشتمل ہے مولانا عبد السلام صاحب ندوی، مولانا ابوظفر صاحب ندوی، اور سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے کی محنتون کا ثمرہ ہے اور مکمل ہے، تاریخ ہند کی بقیہ جلدون کی تکمیل سید صباح الدین صاحب سے متعلق ہے جس مین وہ برابر مصروف ہین،

اردو اور ہندی کے قصہ کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر لانے والے ٹنڈن جی ہین، ان ہی نے پہلے یو پی کانگریس کمیٹی مین اس کو پھیلایا، اور بڑھایا، اور اب اس کو وہ سارے ہندوستان کا مسئلہ بنا رہے ہین پچھلی کانگریس منسٹری مین یہی خیال تھا جس نے پیارے لال شرما جیسے شریف اور ملنسار آدمی کی جگہ سمپورنا نند کو اسکول کی ماسٹری سے وزارت کی کرسی پر لا بٹھایا، اور سنسکرتی ہندی کے رواج کو اس تھوڑے اختیار کے برتے پر تعلیمات مین زور پھیلانے کی اسکیم پر علانیہ عمل شروع کرایا گیا، فیض آباد کی تقریرون مین دونون نے مل کر اس کا اعلان کیا، اور یہ کہنا حقیقت سے دور نہ ہوگا، کہ کانگریس منسٹری سے مسلمانون کو نفرت دلانے مین ان سورماؤن کا بڑا حصہ ہے ٹنڈن جی کی ابھی حال کی پونہ کی تقریر سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ اپنی رائے پر مضبوطی سے اڑے ہوئے ہین،

مقالات

خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ العلما صوبہ بمبئی منعقدہ ۷ صفر ۱۳۶۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ

الحمد للہ رب العلمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین ۰ اھدنا

الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین آمین

حضرات! آج بحمد اللہ ہم ایک ایسے مقام پر جمع ہیں جس کو ایک شہر کے بجائے ملک ہندوستان کا خلاصہ کہنا چاہئے، ہر صوبہ کے مسلمان اور ہر خیال کے ارکان یہاں آباد ہیں، اس لئے یہاں مسلمانوں کے سارے محاسن اور معائب جو کچھ ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، اسی لئے ایک بزرگ کا یہ قول مجھے یاد آیا کہ بمبئی کی اصلاح سارے ہندوستان کی اصلاح ہے، اگر بمبئی کے مسلمان مسلمان بن جائیں تو پھر سارے ملک کو مسلمان سمجھئے، یہاں کے مسلمانوں کی کاروباری زندگی، تجارتی مشاغل اور حصولِ رزق اور کسبِ مال کے غیر محدود ذرائع نے ان کو معطل و بیکار بیٹھنے کے بجائے ان کو متحرک اور رواں دواں اور چلتا پھرتا بنا دیا ہے، یہاں کوئی ہاتھ پیر توڑ کر بیکار نہیں بیٹھ سکتا، ورنہ زندگی کے دن گذارنے مشکل ہو جائیں، یہاں جو ہے وہ اپنے کاموں میں مصروف اور اپنی کوششوں میں مشغول ہے، اس لئے یہاں کے مسلمانوں کی بیماری بیکاری اور تعطل اور جمود نہیں بلکہ غیر معتدل حرکت، نامناسب رفتارِ عمل اور غیر متوازن سمتِ سفر ہے،

حضرات! یہ شہر جس طرح بابِ مکہ ہے، اسی طرح گیٹ آف انڈیا بھی ہے، دنیا کے کسی حصہ میں بھی جو اچھے یا برے خیالات پیدا ہوتے ہیں، ہندوستان میں اس کے داخلہ کا راستہ یہی شہر ہے، یہاں کی گودیوں میں نہ صرف یورپ اور امریکہ کے نئے نئے سامانِ تجارت اترتے رہتے ہیں، بلکہ یورپ سے لدے لد کر نئے نئے اسبابِ جہالت بھی آتے رہتے ہیں، اور یہیں سے وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلتے ہیں، اس لئے مجاہدینِ اُمت کے لئے بڑی ضرورت تھی کہ اس بندرگاہ کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط اور محفوظ چھاؤنی قائم کریں جو دشمنوں کا مقابلہ کرے، اور باطل خیالات کی فوج کو شکست دے سکے،

حضرات! میں نے ابھی جو سورۂ فاتحہ تلاوت کی یہ حقیقت میں مجموعۂ قرآن پاک کا خطبۂ افتتاحیہ ہے، اکابر مفسرین کی تحقیق و تشریح کے مطابق اس سورہ میں قرآن پاک کے سارے مضامین کا خلاصہ مذکور ہے، توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی العبادات، اتباعِ آثارِ انبیاء علیہم السلام، جزاء و سزا سب ہی مضامین اس میں موجود ہیں، ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اُس روایت کے مطابق کہ اس سورہ میں حمد و تمجید اور دعا و سوال کے مضامین یکجا ہیں، ارشاد ہے کہ جب بندہ نماز میں سورہ فاتحہ تلاوت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین نماز یا نماز کی یہ سورت پاک میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی بٹی ہوئی ہے، بندہ جب الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو اللہ پاک فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری حمد کی اور جب الرحمٰن الرحیم مالک

یَوۡمِ الدِّیۡنِ کہتا ہے تو ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری بزرگی جتلائی، اور جب نمازی اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور اس کے بعد اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کی درخواست پیش ہوتی ہے، تو ارشاد ہوتا ہے کہ ولعبدی ماسأل میرے بندہ کے لئے وہ ہے جس کی اُس نے درخواست پیش کی،

آج کی مجلس میں مجھے درخواست کے اسی مضمون سے زیادہ تر بحث ہے، اس درخواست اور دعا کے الفاظ یہ ہیں جن کو ہر مسلمان نمازی دن رات میں بیسیون دفعہ دہراتا ہے، بلکہ وہ نماز ہی نہیں جس میں حقیقۃً یا نیابتہً یہ درخواست اور دعا شامل نہ ہو اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ اس دعا اور درخواست میں بندہ اللہ تعالیٰ سے اپنی زندگی کے ہر پیچ اور اپنے عمل کے ہر پہلو میں سیدھے راستہ پر چلائے جانے کی استدعا بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہے، اس مطلوبہ راہ راست اور صراط مستقیم کے ساتھ تین قیدین لگی ہوئی ہیں، اے اللہ تو ہم کو سیدھے راستہ پر چلا، ان کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا، نہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ ان کا جو راہ راست سے بھٹک کر اپنی منزل مقصود کا راستہ کھو بیٹھے ہیں۔

اب راہ راست کی ان تین قیدون کی تشریح ضروری ہے جن میں سے پہلی قید تو تخصیصی ہے، اور پچھلی قیدین احترازی ہیں تخصیصی قید یہ ہے، کہ یہ سیدھا راستہ جس پر چلائے جانے کی درخواست ہے، وہ خاص ان بزرگون کا راستہ ہو جن پر انعام ربانی اور فضل الٰہی کی بارش ہوتی ہے، دو احترازی قیدین یہ ہیں، کہ ان کی راہ سے ہم کو بچایا جائے جن پر ان کی نافرمانی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اور نہ ان کا راستہ جو اپنی غلط روی کے باعث منزل مقصود سے دور جا پڑے ہیں قرآن پاک میں جا بجا یہ تصریحات ہیں کہ یہ انعام یافتہ گروہ کون ہے اور جن پر غضب ہوا وہ کون ہیں، اور جو راہ راست کو کھو چکے ہیں، وہ کون ہیں، قرآن پاک کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم وہ راہ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام چلے اور جن پر چلنے کی اللہ کے بندون کو دعوت دی، ارشاد ہے :-

اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (یٰسٓ)	اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو پیغمبر ہو اور صراط مستقیم پر ہو،

دوسری جگہ ہے :-

وَاِنَّکَ لَتَھۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (شوریٰ ۵)	اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے،
فَھَدَی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِہٖ وَاللّٰہُ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (بقرہ-۲۶)	یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے جو دین کی مختلف راہین نکالی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندون کو جو ایمان سے سرفراز ہیں ان سب سے بچا کر نبیوں اور صالحوں کے سیدھے راستہ پر چلاتے ہیں،

سورۂ انعام کے انیسویں رکوع میں عقائد، عبادات، معاملات، اور اخلاق کے اہم احکام کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے،

وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ (انعام - ۱۹)	اور یہ ہے میری سیدھی راہ سو اس پر چلو اور مت چلو دوسرے راستون پر کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دین گے، یہ کہہ دیا ہے تاکہ تم بچ سکو،

ان شواہد سے میرا مدعا ثابت ہے، کہ صراط مستقیم انبیاءؑ اور صلحاؑ کے راستہ کا نام ہے جس کے انبیاء علیہم السلام رہنما ہیں

اور جس کا دوسرا نام شریعت ہے جس کے لفظی معنی بھی راستہ ہی کے ہیں، صراطِ مستقیم کے کہنے ہی سے گو راستہ متعین ہو چکا ہے مگر احتیاط کا تقاضا اور رحمتِ الٰہی کا مطالبہ یہ تھا کہ اس راستہ کی مزید توضیح ایسی کر دی جائے جس سے اس راستہ پہ چلنے والے کا انجام بھی نظر کے سامنے آجائے، تو فرمایا "وہ راستہ جس پر وہ گروہ چلا جو اے اللہ تعالیٰ تیرے فضل و کرم اور انعام و الطاف سے سرفراز ہوا اور نہ ان کا راستہ جو مغضوب اور گمراہ گروہوں کا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ اس سیدھے راستہ پر چلنے کا انجام انعام و اکرام الٰہی ہے اور جس کے چھوڑ دینے کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نزول اور منزلِ مقصود سے بعد اور دوری ہے،

اب ہم کو اس انعام یافتہ گروہ کا پتہ چلانا ہے، سورہ نساء رکوع ۹ میں ہے،

وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا	اور اگر وہ بھی کریں جو ان کو کہا جاتا ہے تو ان کے
لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا وَإِذًا لَّآتَيْنَاهُم مِّن	حق میں بہتر ہو، اور زیادہ ثابت ہو، دین میں
لَّدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا	اور اس وقت ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب
مُّسْتَقِيمًا وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ	دیں اور ان کو سیدھی راہ پر چلائیں، اور جو لوگ
مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ	اللہ اور رسول کے حکم پر چلے ہیں، وہ ان کے ساتھ
وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ	ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا ہے
أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ وَ	نبی اور صدیق اور شہید اور صالح خوب ہے ان
كَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا، (نساء-۹)	کی رفاقت یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل

ان آیتوں میں سیدھے راستہ پر چلنے والے اطاعت گذار گروہوں کے چار نام یا اوصاف بتائے گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نوازش اور مقبولیت سے سرفراز ہیں یعنی انبیائے کرام علیہم السلام جو انسانی جماعتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے بندوں اور سرفراز افراد کے نام ہیں جن سے بڑھ کر رہنمائی اور انسانیت کے رہروؤں کے لئے رہبری اور بشر کی اصلاح اور ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے دوسرا نمونہ نہیں بنایا، اس کے بعد ان تین گروہوں کے نام ہیں جو ان رہنماؤں اور رہبروں کے راستہ پر چل کر صدیقیت اور شہادت، اور صلاح و فلاح کی منزلوں پر پہنچے ہیں، اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ان بنائے اور ڈھلے ہوئے نمونوں کو دیکھ کر اپنے کو درست کیا، اور دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ بنے،

اب ہم کو ان دو احترازی قیدوں کی طرف متوجہ ہونا ہے جن کے راستہ پر چلنے سے ہم کو اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، ان میں سے پہلے گروہ کا نام مغضوب ہے، اور جن سے رحمتِ الٰہی مسلوب ہے، گو روایات میں تصریح ہے کہ یہ گروہ یہود ہے، مگر قرآن پاک میں بھی یہ تصریح ہے کہ اس غضبِ الٰہی کے مورد یہود اور یہود کے متبع ہیں، بقرہ رکوع ۷ میں ہے

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور ماری گئی ان پر ذلت اور بے کسی اور کما لائے وہ
وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ، (بقرہ ۸-۷)	اللہ کا غضب اور غصہ،

پھر اسی سورہ کے رکوع ۱۱ میں ہے کہ پہلے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر غضب کے مورد ہوئے اور آخری دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار و کفر پر ہمیشہ کے لئے غضب پر غضب کے مستحق ٹھہرے،

فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ، (بقرہ ۱۱)	وہ غضب پر غضب یعنی دوہرے غضب کے مستحق ہوئے

اور اب ہمیشہ کے لئے لعنت اور غضب الٰہی کی آگ میں ڈال دیئے گئے، اور ہمیشہ کے لئے ان پر یہ حکم جاری کیا گیا، کہ اب دنیا کا کوئی

گوشہ ان کو اپنے دامن میں پناہ نہیں دیگا، وہ دولتمندی کے باوجود مفلس اور ذلیل وخوار رہیں گے، اور یہ حکم الٰہی ہو کہ کسی نہ کسی دوسری ظالم قوم کے غلام رہیں گے، اگر ان کو ہنگامی پناہ وقتاً فوقتاً ملے گی بھی تو ان کی دولت کے بٹورنے کی خاطر باری باری سے دولت پرست قومیں اپنی گود میں لیں گی، اور ان کی جیبیں خالی کرکے ان کو پھر زمین پر پٹک دیں گی، ارشاد ہوا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا	ان یہود پر ذلت پھینک ماری گئی، جہاں وہ پائے گئے،
بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا	لیکن اللہ کی دستاویز اور لوگوں کی دستاویز سے
بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ	یہ اس واسطے کہ وہ اللہ کے احکام کے ماننے سے،
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ	انکار کرتے رہے، اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے،
يَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا	یہ خصلت ان میں اس لئے آئی کہ وہ بے حکم اور
وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ، (آل عمران-۱۲)	حد سے بڑھ جانے والے تھے،

الغرض یہود پر اس غضب الٰہی کا نزول اور محکومی کی ذلت اور مسکنت اور قومی خواری کی لعنت میں وہ اس لئے گرفتار کئے گئے، کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے قبول سے منکر ہوئے، اور اب ان کی لعنت اس نبی آخر الزمان علیہ السلام پر ایمان اور اتباع کے سوا کسی اور تدبیر سے دور نہیں ہو سکتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کوئی گروہ بھی انبیاء کی راہ چھوڑے گا، اور ان کی لائی ہوئی اور بتائی ہوئی صراط مستقیم سے منہ موڑے گا، اس کے لئے یہی جزا ہے،

وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ (حج-۲) اور جسکو اللہ ذلیل کرے اسکو کوئی عزت دینے والا نہیں،

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت   بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

یہود کی پوری تاریخ آغاز سے لے کر اس زمانہ تک قرآن پاک کی صداقت پر شاہد صادق ہے،

حضرات! اب ہم کو تیسرے گروہ کا پتہ لگانا ہے، جو راستہ سے بھٹکا ہے، منزل مقصود سے دور چلا گیا ہے، اگرچہ روایات سے واضح ہے کہ یہ نصاریٰ کا گروہ ہے، لیکن قرآن پاک کی آیتیں خود بھی اس گروہ کا صاف صاف پتہ اور نشان بتا رہی ہیں، نصاریٰ کے ذکر کے سلسلہ میں ہے، اس سے پہلے تثلیث کا ذکر ہے پھر ان کی مجسمہ پرستی کا اس کے بعد یہ آیتیں ہیں،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ	اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور
وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ	ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو تم سے پہلے راستہ سے
وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ	بھٹکے تھے اور بہتوں کو گمراہ کیا تھا اور سیدھی راہ بھولے
(مائدہ-۱۰)	تھے،

اسی غلو فی الدین کی نصرانی حقیقت کا اظہار سورۂ نساء میں کیا گیا ہے،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا	(نساء-۲۳)	اے اہل کتاب نہ زیادتی کرو اپنے دین میں
تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ		اور نہ کہو اللہ پر مگر حق بیشک مسیح بن مریم اللہ
عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ		کے رسول اور اس کا کلمہ تھے،

بعض علمائے محققین نے لکھا ہے کہ یہود کا جرم احکام الٰہی میں تفریط اور کمی ہے، اور نصاریٰ کا جرم افراط یعنی احکام الٰہی پر زیادتی ہے، جس کو قرآن پاک نے غلو کہا، تفریط غضب الٰہی کے نزول کا اور افراط ضلالت کا موجب ہے،

اس تفصیل سے یہ بات ہویدا ہے کہ امتِ محمدیہ کو ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ تاکید ہے کہ یہ دعا مانگو کہ بار الٰہا ہم کو نبیوں کی راہ پر چلنے کی توفیق عنایت فرما، اور یہود و نصاریٰ جو تیرے مغضوب اور تیری راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، ان کے راستوں اور طریقوں سے ہم کو بچا، اس موقع پر یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ مغضوب اور ضال جس طرح اہلِ کتاب ہیں یعنی اپنی اپنی مزاجی مناسبت کی بنا پر وہی صورتیں متابعتہ شبہہ اہلِ کتاب میں بھی ہیں جن کی دو جماعتوں سے ہم کو قرآن نے واقف کرایا ہے، اور وہ مجوس اور صابئین ہیں جن میں ایران قدیم اور ہند قدیم کے باشندے بھی داخل ہیں، ان کے راستوں اور طریقوں کی پیروی بھی انبیاء علیہم السلام کے راستوں سے دور لے جاتی ہے،

انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل انسانی رہبری و رہنمائی کے مدعی گروہ کا نام حکماء ہے، جن کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا فیصلہ اپنی عقل و ذہنی حکمت سے کر سکتے ہیں، اور وحی الٰہی کے علم و معرفت سے مستغنی ہیں، اس لئے جن قوموں نے انبیاء کو چھوڑا ہے، انھوں نے یا تو براہِ راست حکماء کی راہ اختیار کی، یا حکماء اور انبیاء کے علوم اور تعلیمات میں اس طرح تطبیق اور مصالحت کی کوشش کی ہے کہ عقل پرستوں کے علوم و تعلیمات کو صحیح و صادق باور کرکے انبیاء علیہم السلام کے علوم و تعلیمات میں تاویلِ فاسد کی راہ اختیار کی ہے، انبیاء علیہم السلام کے امتیوں میں یہ راہ سب سے پہلے یہود نے اختیار کی، دیکھئے جب مصر سے نکل کر دریا پار ہوتے ہیں، تو سامری مصری دیوتا کی طلائی مورت بچھڑے کی شکل میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرتا ہے، اس وقت بنی اسرائیل پکار اٹھتے ہیں، کہ یہی تمھارا اور موسیٰ کا خدا ہے، هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى، اور بنی اسرائیل سربسجود ہو جاتے ہیں، اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے مواخذہ فرماتے ہیں، تو صاف کہتا ہے :-

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ، (طٰہٰ - ۵)	میں نے وہ دیکھا جو انھوں نے نہیں دیکھا، پھر میں نے اس فرستادہ خداوندی کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر خاک اٹھائی تھی، سو میں نے وہ مٹی اس کے اندر ڈال دی اور میرے جی کو بھی یہی بات سوجھی

آگے بڑھ کر جب بنی اسرائیل کسی دوسری بت پرست قوم کے درمیان پہنچتے ہیں، تو اپنے نبی سے فرمایش کرتے ہیں کہ

اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ، (اعراف - ۱۶)	جیسے ان کے دیوتا ہیں ہمارے لئے بھی ایک دیوتا بنا دیجئے،

موجودہ تورات میں بار بار یہ ذکر ملتا ہے کہ بنی اسرائیل نے غیر قوموں کے معبودوں کے آگے سر جھکایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، تو ان کا انکار کیا، ان کو طرح طرح سے ستایا، جن حواریوں نے ان کو نبی مانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف بری کے بعد حواریوں کی گمراہی کے لئے یہودی ہی آگے بڑھے، اور انہی میں کے ایک نئے مدعی الہام کے آگے بڑھکر تثلیث پرستی وغیرہ کے فاسد عقیدے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں داخل کئے، اور بالآخر ان کو گمراہ بنا کر چھوڑا، اور مصریوں اور یونانیوں کی دیو مالا کی مالا ان کے گلے میں ڈال دی گئی، جس کو وہ اب تک ڈالے ہیں پھر اسلام کے ظہور کے بعد امتِ محمدیہ مسلمہ کا جب وجود ہوا تو ان دونوں گروہوں نے مل کر اس نئی جماعت کی گمراہی کی چالیں اور سازشیں شروع کیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا،

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ دل سے چاہتے ہیں

لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ (آل عمران - ۷) کہ تم کو گمراہ کر دین،

اہل تاریخ جانتے ہین کہ اسلام مین سب سے پہلا فتنہ یہود نے کیونکر پیدا کیا، اور شبہہ اہل کتاب مجیون نے اس چنگاری کو پھونک پھونک کر ضلالت کا آتشکدہ کیونکر تیار کیا، پھر جب دمشق اور بغداد مین مسلمانون کی حکومتون کے تخت بچھے، تو یہی تھے جنھون نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ ارسطو و افلاطون کے نسخون کو آمیز کرکے اسلام کے عقائد و اعمال کا نیا صحیفہ بنا کر پیش کر دیا،

اے حضرات! بہتر ہو کہ اس موقع پر ماضی کی داستان تذکرہ کر دی جائے، اور حال کی کہانی سنائی جائے، سب کو معلوم ہی کہ یہود نے جب سے یورپ کی زمین مین یونانیون کے زمانہ سے قدم رکھا ہے، اور وقتاً فوقتاً مختلف ملکون کی عیسائی قومون کے بظاہر زیر سایہ رہ کر ان پر ذہنی و علمی اور مالی فرمانروائی کی ہے، اور جب اس قوم کو تنبہ ہوا ہے، تو اس نے ان کے خلاف ہنگامہ برپا کرکے ان کو تہ تیغ کرکے اور ان کی لوٹی ہوئی دولت کو تصرف مین لا کر خود ان کو اپنے ملک سے جلا وطن کرکے اپنی گلو خلاصی کی ہے، یہ واقعہ ایک دفعہ نہیں بلکہ یورپ مین بار بار پیش آیا ہے، اور جس کی آخری مثال نازی ہٹلر کی صورت مین ہمارے اور آپ کے زمانہ مین بھی پیش آئی،

یورپ کا ہر فتنہ اور ذہنی انقلاب کا ہر ہنگامہ جو دنیائے نصاری مین رونما ہوتا رہا ہی اس کی تہ مین جو قوت کارفرما ہوتی ہی وہ یہودی ہوتی ہی، وطنیت کا فتنہ، بین الاقوامیت کا فتنہ، ڈیموکریسی کا فتنہ، سوشلزم کا فتنہ، بالشوازم کا فتنہ ان مین سے کون چیز ہے جو یہود کی دماغی سرکشی اور ذہنی طغیان خیال کی ممنون نہین، آج یورپ اور امریکہ مین ایک طرف سرمایہ پرستی اور جمہوریت کا پرا قائم ہی اور دوسری طرف مزدورون اور کسانون کی دعوت کی غلط صورت اور سوشیالسٹ تحریک کی لادینی حکومت کے کیمپ لگے ہوئے ہین، اور دونون چیزین یہودیون کی طاغیانہ رہنمائی اور نصاری کی گمراہی کے دوگونہ عناصر سے مرکب ہین، اور ساری دنیا ان دونون طغیانی و گمراہی کے فتنون مین سر سے پاؤن تک مبتلا ہی افسوس کہ وقت کا تقاضا ان تشخیصین کی اصلی حالت کی تفصیل و تشریح و تطبیق کی اجازت نہین دیتا،

آج ہمارے اسلامی ممالک خواہ وہ اپنے کو آزاد کہین یا غلام، حاکم کہین یا محکوم، کیا انہی دو فتنون مین سے کسی ایک مین مبتلا نہین، اب یاد کیجئے، رب العالمین مالک یوم الدین نے اول روز سے ہم کو یہ بتایا تھا، کہ تم ہمیشہ ہر ایک حال اور اپنی ہر ایک چال مین انبیاء علیہم السلام کے راستہ پر قائم رہنا اور مغضوب اور ضال قومون کے راستون سے بچتے رہنا، مگر کیا یہ واقعہ نہین کہ ہم نے اس کا الٹا کیا، یعنی انبیاء کے راستہ کو چھوڑ کر مغضوب اور ضال قومون کی راہون کو اختیار کیا، اور آج بھی یہی حال ہی، آج مسلمانون کی ہر جماعت خواہ وہ کسی ملک مین ہو اپنی ترقی و اصلاح اور سعادت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی طرف نہین، بلکہ انہی مغضوب اور ضال قومون کی امامت کی اقتدا کے لئے بے قرار ہے، وضع وقطع تراش و خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات، رفتار و گفتار، تجارت و اقتصاد و معاملات اور حکومت و سلطنت غرض زندگی کے ہر شعبہ مین اس کا رُخ انبیاء علیہم السلام کی طرف ہے، یا مغضوب و ضال قومون کی طرف ہے، ہم زبان سے تو کہتے ہین کہ منہ میرا طرف کعبہ شریف کے، مگر رفتار کی سمت لندن، پیرس، ماسکو، برلن اور نیویارک ہے، زبان سے تو اپنی سعادت اور ہدایت کو انبیاء علیہم السلام کی اور خصوصاً سرور کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی مین منحصر جانتے ہین، مگر دل مین اپنی ترقی کا راز یورپ اور امریکہ کی پیروی مین منحصر مانتے ہین، ہم مین سے بعضون نے جو دانشمندی کے مدعی ہین، دین اور دنیا کے دو حصے کر رکھے ہین، اور دین مین انبیاء کی اور دنیا مین ان مغضوبون اور

گمراہون کی پیروی کے داعی ہین، لیکن دین و دنیا کی یہ تقسیم کی تاویل بھی انہی گمراہون کی تعلیم کا اعادہ ہے جنھون نے اپنے آسمانی صحیفون مین یہ لکھا پایا ہے، کہ "جو قیصر کا ہے، وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے، وہ خدا کو دو"، گویا وہ دو خداؤن کے قائل ہین، قیصر جو دنیا پر حکومت کرتا ہے، اور خدا جو آسمان پر فرمانروا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعلیم مین وہ واحد ہے، وہ قیصر کون ہے جو خدا کے ساتھ برابر کی حکومت کا دعوی دار ہے، لله ملك السموات والارض (آسمانون اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے)، ان مغضوب وضال قومون کی ایجاد واختراع، دولت وطاقت، حکومت وسلطنت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھون کو خیرہ کر دیا ہے، ان کی عریانی وبے پردگی ان کی نفس پرستی وہوسناکی وخود پسندی، ان کے تکبر واستکبار ان کے کفر وعصیان کی ہر تصویر ہمارے دل کو پسند ہے، ہمارے بچے، جوان، بوڑھے، عورت اور مرد ہر ایک اس کوشش مین ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ کے اس مشترکہ پیدا کردہ تہذیب وتمدن، طور وطریق، شکل ولباس، تعلیم وتربیت کی راہون کی اقتدا کی تیز سے تیز دوڑ مین دوسرون سے آگے بڑھ جائے، اور ہر اس ناصح کی تکذیب مین مصروف ہے، جو ان کو ان مغضوبون اور گمراہون کی پیروی سے باز رکھنے کی کوشش کرے، آج مسلمان نوجوان اپنی زندگی کے ہر پہلو مین اپنی ملت کے رہنمائے اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ نہین، بلکہ لینن، اسٹالن، ہٹلر، مسولینی، چرچل اور روزویلٹ کے نمونون کی تلاش اور ان کے روپ بھرنے مین ہر طرح کوشان ہین، اور انہی کی پیروی مین مسلمانون کی نجات سمجھتے ہین، انا للہ وانا الیہ راجعون،

اہل سیاست کو موجودہ مغضوب وضال قومون کے مذموم تمدن وتہذیب، مکروہ اور بے آئین نظام سلطنت و حکومت، ظالمانہ طریق حکمرانی وفرمانروائی، گمراہانہ طریق تعلیم وتربیت، فاسد اخلاق وکردار، اور قزاقانہ اقتصاد، وحشیانہ طاقت اور مجرمانہ سیاست پر افسوس نہین، بلکہ اس پر حسرت ہے، کہ اس مجرم، گنہگار، عریان، خوشنما، فاسد الاخلاق قزاق اور وحشی طاقت کے حکمران وفرمانروا اور ظالم نظام اقتصاد اور فاسد اصول قضا وعدالت کے مالک ہم کیون نہ ہوئے، ان کو یہ افسوس نہین کہ شیطان کا یہ تخت جبروت کیون بچھا ہے، بلکہ یہ افسوس ہے کہ ہم اس پر کیون نہ بیٹھے، نہین ان کو شیطان کے تخت الٹنے کی فکر نہین، بلکہ اس پر جلوس فرمانے کی فکر مستولی ہے،

مسلمان مدت سے اس حالت مین ہین کہ وہ اپنے کو بھول گئے ہین، اور دوسری قومون کی نقالی مین مصروف ہین، اسلام ایک مستقل نظام حیات، نظام اقتصاد، نظام سیاست اور نظام اخلاق کا نام ہے، خود اپنے نظامات سے روگردان ہو کر یا ان مین ترمیم وتبدیلی کر کے دنیا کے دوسرے ناقص وفاسد نظامات کو اختیار کرنے مین اپنی زندگی کی نجات سمجھتے ہین،

ترکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، شمالی افریقہ، ہندوستان، غرض وہ جہان کہین بھی ہین، خواہ وہ حاکم ہون محکوم، یورپ کی نقالی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہین، وہ دنیا مین قیصریت اور کسرویت کے علمبردار اور پیغمبرون کے بجائے ہلاکوؤن اور چنگیزون کے جانشین بن گئے،

آج انقلاب کا عہد ہے، مسلمانون کو چاہئے کہ وہ پھر سے اپنی رفتار کی سمت اور زندگی کے مقصد کو درست کرین، وہ اللہ کے محکوم، اس کی شریعت کے حامل اور دنیا مین اس کی شہنشاہی کے نمایندہ ہین، ان کو پہلے اللہ کے قانون کو اپنے اوپر اور پھر اس کے بعد دوسرون کے اوپر نافذ کرنا چاہئے،

مسلمانون کو ان معنون مین قوم نہین کہنا چاہئے جن معنون مین رنگ اور نسل ونسب اور وطن کے اجزائے ترکیبی سے دنیا مین قومین بنائی جاتی ہین، بلکہ انسانی جماعتون کا وہ ایسا مجموعہ ہین، جن کے ترکیبی اجزاء خاص خیالات، خاص عقائد،

خاص اعمال، خاص اخلاق، خاص تمدن، خاص اصولِ سلطنت و حکمرانی ہین، اسی لئے وہ دوسری قومون کے ساتھ متحد و محکوم ہوکر نہین بلکہ مسالمانہ و معاہدانہ اصول پر دوست بن کر زندگی بسر کر سکتے ہین، ورنہ ان کا وجود دوسری قومون کے ساتھ مخلوط ہوکر پائدار نہ ہوگا خصوصیت کے ساتھ اس احاطہ بمبئی مین جہان مسلمان تعداد مین نسبتہً کم ہین اور دنیا بھر کی مختلف قومون، مذہبون اور فرقون کے سمندر مین غرق ہین،

اے حضرات! ضرورت ہو ذہنیت کے بدلنے خیالات کے پلٹنے اور صحیح فکر کو سامنے رکھنے، اور صحیح نصب العین کو اپنے دل مین جگہ دینے کی جہان تک جمعیت العلمائے بمبئی کا تعلق ہے، اس مقصد کو حسب ذیل طریقون سے حاصل کیا جا سکتا ہے،

(۱) بمبئی مین ایک عظیم الشان مذہبی درس گاہ کا قیام عمل مین آئے، جس مین صحیح تعلیم و تربیت کی پوری نگرانی وحفاظت ہو،

(۲) یہان کی مسجدون مین قرآن پاک کے عام فہم درس کا انتظام کیا جائے، جس سے عام مسلمانون کو اپنے دین کی صحیح واقفیت ہو،

(۳) عام ماہانہ مواعظ کے ذریعہ سے اخلاق و عاداتِ فاسدہ اور شادی وغمی کے بے جا مراسم کی اصلاح ہو،

(۴) وقتاً فوقتاً اردو اور گجراتی و مرہٹی زبانون مین اسلامی رسالون کی اشاعت کا سامان کیا جائے،

(۵) ایسی مخلص جماعتین بنائی جائین، جو محلہ محلہ مین پھر کر مسلمانون مین کلمۂ توحید کی تلقین اور نماز کی تاکید کرین،

تابعین رض

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمر بن عبد العزیز رض، حضرت حسن بصری رض، حضرت اویس قرنی رض، حضرت امام زین العابدین رض، حضرت امام باقر رض، حضرت امام جعفر صادق رض، حضرت محمد بن حنفیہ رض، حضرت سعید بن مسیب رض، حضرت محمد بن سیرین رض، حضرت ابن شہاب زہری رض، امام ربیعۃ الرائی، امام مکحول شامی رض، قاضی شریح رض وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین رض کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور علمی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے،

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے قیمت: للعہ ر

اشتراکیت اور اسلام

از مسعود عالم ندوی

جس مین اسلام اور اشتراکیت کی تعلیمات کے تقابلی مطالعہ اور اشتراکیت کے خلاف فطرت معاشی اصولون کی علمی وفنی تنقید کی گئی ہے، نیز اس کے مابعد الطبیعی نظریون پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے، ضخامت ۔۔ صفحے قیمت عمر

منیجر

غیر اسلامی ممالک میں

سود و قمار وغیرہ کا حکم

از

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

جون ۱۹۴۵ء کے معارف میں مولانا گیلانی کا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت میں نظر سے گذرا جو اسلامی معاشیات کے سلسلہ میں بطور تحتانی عنوان لایا گیا ہے، یہ سلسلہ بہت ہی نافع اور مفید ہے، جو مولانا کی وسعت نظر پر دال ہے اور ان لوگون کے لئے جو اسلام میں مسائل معاشیات کے منکر ہیں، یا یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں اس باب کو مکمل طور سے نہیں بیان کیا گیا، بہت کچھ سبق آموز ہے، مگر کاش مولانا اس باب میں اس مسئلہ کو نہ چھیڑتے، جس پر اس وقت مجھے قلم اٹھانا پڑا ہے، اگر مولانا اس مسئلہ پر مقلدانہ طریق سے ہی کلام فرماتے، تو مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ مقلد کو اپنے امام کے قول پر فتوی دینے اور اس پر تفریع کرنے کا حق ہے، گو ہنوز یہ امر بھی محل کلام ہے کہ جس اطلاق کے ساتھ مولانا گیلانی دار الحرب میں ربا و قمار کو جائز کر رہے ہیں وہ امام اعظم کا مذہب ہے بھی یا نہیں؟ امام اعظم اور ان کے شاگرد امام محمد بن حسنؒ کے اصلی الفاظ اس مسئلہ میں کیا ہیں، اور کتب فتاوی میں جو کچھ مذکور ہے، وہ ان کے الفاظ کا مفہوم ہے یا نہیں؟ یہ مباحث علحدہ حیثیت سے لائق غور ہیں، لیکن ایک مقلد کو دائرۂ تقلید سے باہر قدم نکالتے ہوئے تو گردوپیش کے تمام پہلوؤن پر نظر کر لینا ضروری ہے، افسوس ہے کہ مولانا گیلانی نے ایسا نہیں کیا، اور بڑی عجلت میں ان لوگون سے جو اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مسالک پر چلنے کو خلاف احتیاط سمجھتے ہیں یہ مطالبہ کر ڈالا کہ "قرآن و حدیث و اجماع و قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہون تو پیش کرین" (معارف جون ۱۹۴۵ء ص ۴۳۰)

میری سمجھ میں نہین آیا کہ مولانا کو ان سے اس مطالبہ کا حق کس قاعدہ سے حاصل ہے؟ اگر وہ بقاعدہ مناظرہ گفتگو فرما رہے ہیں، تو دوسری جماعت منکر اباحت ہے، اور مولانا مدعی اور بالاتفاق بار ثبوت بذمہ مدعی ہے نہ بذمۂ منکر، اور اگر فقہی اصول سے گفتگو کی جا رہی ہے، تو دوسری جماعت احل اللہ البیع وحرم الربوا کو قید مکان سے مطلق مانتی ہے، اور مولانا اس کو دار الاسلام کی ساتھ مقید کرتے ہیں، اور مطلق کا اپنے اطلاق پر ہونا اصل ہے، تو جو اطلاق کا قائل ہے، وہ متمسک بالاصل ہے اس کے ذمہ بار ثبوت نہیں، بار ثبوت اس کے ذمہ ہے جو مطلق کو مقید قرار دے رہا ہے، ان کو اس کی وجہ خود بتلانا چاہئے کہ جب احل اللہ البیع مطلق ہے، کہ حلت بیع کسی مکان کی ساتھ مقید نہین تو اس کا قرین "وحرم الربوا" دار الاسلام سے کیون مقید ہے،

اسی طرح آیت:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ،

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت (بتون کے مجسمے) اور (فال پھینکنے کے) تیر یہ سب پلید ہیں شیطانی کام ہیں اور کچھ نہیں۔[۱۲]

میں خمر و انصاب و ازلام کی حرمت مسلمانوں کے لئے مطلق ہو یعنی نہ دار الاسلام میں اس کی اجازت ہے، نہ دار الحرب میں، پھر حرمت میسر (قمار) دار الاسلام سے کیوں مقید ہے، حالانکہ وہ خمر وغیرہ کے ساتھ ساتھ مذکور ہے، شریعت نے زنا کو حرام کیا ہو تو وہ ہر جگہ حرام ہے، یہی حال حرمت ربوا کا ہونا چاہئے، رہا یہ فرمانا کہ یہ معاملہ "ربوا" کا معاملہ ہی نہیں، بلکہ ایک مباح مالی کو قبضہ کرکے اپنی ملک بنانا ہو تو اس پر سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ربا کا معاملہ نہیں، کیونکہ لغتہً وعرفاً یہ عقد عقد ربا ہے، تعریف ربا اس پر صادق ہے، اور جب لغتہً وعرفاً یہ عقد عقد ربا ہے، تو یقیناً آیت کے تحت میں داخل ہو، اگر مولانا اس کو آیت ربوا سے خارج کرنا چاہتے ہیں، تو کوئی دلیل قطعی پیش کریں، قرآن نے تو کفار اہل حرب ہی کے قول کو اس آیت میں رد کیا ہے،

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا، (بقرہ - ۳۸)	یہ (عذاب) اس وجہ سے ہو کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربا ہی کے مثل ہو حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہو، اور سود کو حرام

مجھے یہ بتلایا جائے کہ انما البیع مثل الربوا کہنے والے کون لوگ تھے؟ جب قرآن نے کفار کے اس قول کو رد کیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کفار کے لئے بھی باہم عقد ربا کو جائز نہیں رکھتا، بلکہ بیع کو حلال اور ربوا کو حرام قرار دیتا ہے، جب کفار کے لئے بھی باہم یہ عقد جائز نہیں، اسی لئے کفار اہل ذمہ و اہل صلح کو ہمیشہ ربا سے منع کیا گیا، اور بصورت مخالفت ان کو ناقض عہد صلح قرار دیا گیا تو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ اس عقد کی کیونکر اجازت ہو سکتی ہے؟ پس ثابت ہوا کہ کافر کا عقد ربا بھی لغتہً وعرفاً ربا ہے، اور اس آیت کے تحت میں داخل ہے،

اب اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ مسلمانوں کو کافر حربی سے سودی لین دین کی اجازت ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ربا نہیں، اس کو دلیل قائم کرنا چاہئے، اور بتلانا چاہئے، کہ جو عقد لغتہً وعرفاً ربا ہے، وہ اس صورت میں ربا کیوں نہیں رہا، اور اگر مال حربی باوجود اس کے قبضہ و ملک میں ہونے کے ایسا مباح ہے، جیسے جنگلی جانور تو پھر کافر حربی سے کسی مال کا خریدنا بھی جائز نہ ہونا چاہئے، کیونکہ مال مباح جب تک مباح ہے، بیع و شراء کا محل نہیں، پس کافر کے ساتھ عقد ربا کی اباحت اس کی ساتھ عقد بیع کی حرمت کو مستلزم ہو گی،

اگر کہا جائے کہ لغتہً وعرفاً تو یہ ربا ہے مگر شرعاً ربا نہیں اور حدیث لَا رِبَا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِيِّ فِي دَارِ الْحَرْبِ اس کی دلیل ہے، تو مولانا کو معلوم ہونا چاہئے، کہ یہ حدیث خبر واحد بھی ہے، اور ضعیف بھی، خبر واحد ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ کسی

۱؎ اس کی مزید تائید آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا، سے ہوتی ہے، کیونکہ تفاسیر و احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ بقایا سود جس کے چھوڑنے کا آیت میں حکم دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا تھا جب کہ مکہ دار الحرب تھا، اگر یہ معاملہ حلال ہوتا، تو حلال معاملہ سے جو حق واجب ہو، اس کا مطالبہ ہر حال میں درست ہے، گو مطالبہ کے وقت وہ معاملہ ناجائز ہو، مثلاً ایک کافر نے دوسرے کافر سے ایک روپیہ کی شراب خریدی، ان کے لئے یہ معاملہ حلال تھا، پھر دونوں مسلمان ہو گئے، تو باوجودیکہ اب ایسی بیع و شراء درست نہیں، مگر پچھلا روپیہ وصول کرنا درست ہے، پس جب ربا میں پچھلا بقایا لینے کی اجازت نہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی حلال نہ تھا، پھر جب حربی حربی میں درست نہ ہوا تو مسلم اور حربی میں کیسے درست ہوگا، فافہم،

بھی اس کو حدیث مشہور یا متواتر نہیں کہا، وَمَنْ ادعیٰ فعلیہ البیان، اور ضعیف اس لئے ہے کہ امام صاحب نے اس کو حدثنا بعض مشیختنا عن مکحول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہکر بیان کیا ہے جس میں امام صاحب کے شیخ مجہول ہیں اور مکحول سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک سند متصل نہیں منقطع ہے،

آپ تقلید کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ امام صاحب نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے، اس لئے صحیح ہے، مگر یہ تصحیح تقلیدی ہوگی نہ تحقیقی، اور اس وقت گفتگو تقلیدی نہیں، کیونکہ آپ نے دائرۂ تقلید سے نکل کر دوسرے علماء سے دلیل کا مطالبہ کیا ہے"، اور صورت اول میں بھی خبر واحد سے آگے یہ حدیث نہ بڑھے گی، اور حنفیہ کا اصول ہے، کہ نص قطعی کے اطلاق یا عموم کو خبر واحد سے مقید یا مخصوص کرنا جائز نہیں،

اب آپ کے ذمہ امام صاحب کے اس قول کو خود ان کے اصول پر صحیح ثابت کرنا لازم ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اموال اہل حرب مباح ہیں، اس لئے وہ محل ربا ہی نہیں، پس امام صاحب نے آیت کے اطلاق کو باطل نہیں کیا، کہ اس کو ربا مان کر جائز کہا ہو بلکہ ایک مستقل حکم مان کر بیان کیا ہے کہ اموال اہل حرب بوجہ اباحت کے محل ربا نہیں ہیں، اس کا ایک جواب تو اوپر گذر چکا کہ اگر اموال اہل حرب مطلقاً مُباح ہیں تو ان کو آپس میں بھی معاملہ ربا جائز ہونا چاہئے، اور یہ نص کے خلاف ہے، اور اگر صرف مسلمان کے لئے مباح ہیں تو مسلمانوں کو ان کے ساتھ عقد بیع و شراء جائز نہ ہونا چاہئے"

دوسرے اسپر سوال یہ ہے کہ مال الحربی مُباحٌ یہ تو صغریٰ ہوا، اس کے بعد کبریٰ کا ثبوت آپ کے ذمہ باقی رہے گا کہ

وکل ما کان مُباحًا فعقد الربا فیہ جائز ۵	جو مال مباح ہو اوس میں عقد ربا جائز ہے یا
لیس ھو محلا للربا و دون اثباتہ خرط القتاد	یا وہ محل ربا نہیں، اور آپ اس کو ثابت نہیں کرسکتے،

فقہا نے لکھا ہے کہ بوقت حاجت باپ کے لئے بیٹے کا مال بقدر حاجت مباح ہے، تو کیا باپ کو بیٹے کے ساتھ عقد ربا بھی جائز ہے حالت اضطرار میں ایک مسلمان کو دوسرے کا مال لینا مباح ہے، تو کیا اس کے ساتھ عقد ربا بھی جائز ہوگا، اگر کوئی شخص اعلان کردے ابحت مالی لمن اخذہ (میں نے اپنا مال ہر شخص کے لئے مباح کردیا ہے جس کا جی چاہے لیلے) تو کیا اوس کے ساتھ عقد ربا جائز ہو جائے گا، کیونکہ اس کا مال مباح ہو چکا ہے، ہرگز نہیں، اگر آپ اس کے قائل ہو بھی جائیں، تو آپ کے امام اس کے قائل نہیں، پھر اموال اہل حرب کا مباح ہونا ایک دوسری اصل پر مبنی ہے، کہ "اہل الحرب کلھم ارقا ء" اہل حرب سب غلام ہیں، مگر اس سے مراد وہ اہل حرب ہیں، جو معصوم الدم نہ ہوں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ اگر کفار اہل حرب سے صلح ہو جائے، تو وہ غلام نہیں بنتے، بلکہ آزاد رہتے ہیں، تو اہل حرب کے اموال کی اباحت بھی مطلق نہ ہوگی، بلکہ اموال مقاتلین کے ساتھ مخصوص ہوگی، کہ مقاتلہ کے وقت اہل حرب کا جو مال بطور غنیمت کے ہمارے قبضہ میں آئے، وہ مُباح ہے اور اس میں بھی احراز بدار الاسلام شرط ہے، (کہ مال غنیمت دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف منتقل کردیا گیا ہو) اسی لئے حنفیہ کے نزدیک دار الحرب میں تقسیم غنائم جائز نہیں، اگر اموال اہل حرب کی اباحت پرندوں کے شکار کی طرح ہوتی، تو ان قیود کی کیا حاجت تھی، پھر اموال غنیمت میں بھی یہ جائز نہیں کہ جس مسلمان کا جس چیز پر قبضہ ہو جائے، وہ اس کا مالک بن جائے، بلکہ امام کی تقسیم کے بعد مالک ہوگا، اور مال غنیمت میں غلول وخیانت

۱؎ اور یہاں سے ان کا بھی رد ہو گیا جو دار الحرب میں مال حربی کو فئی قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مسلمان حربی سے عقد ربا کرکے مال فئی پر قبضہ کرتا ہے، ان کو جاننا چاہئے کہ مال فئی عامۂ مسلمین کا حق ہے، نہ کسی خاص شخص کا، بہرحال جو مال بطریق عقد کے حربی کی رضامندی سے لیا جاتا ہے، اگر یہ فئی میں داخل ہوتا تو امام ابو یوسف اور دیگر ائمہ کو اس کی حلت میں اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی،

سخت جرم ہے، اسی طرح اگر کفار کسی مسلمان کو دار الاسلام سے یا میدان جنگ سے قید کرکے دار الحرب لے جائین، یا کوئی مسلمان بدون استیمان کے متلصصا (جاسوس بنکر) دار الحرب مین جائے، اوس کے لئے بھی اموال اہل حرب بجز عورتون کے مباح ہین، کیونکہ قیدی یا متلصص سے کسی قسم کا معاہدہ یا صلح کا معاملہ نہین ہوتا، لیکن جو مسلمان دار الحرب مین مستامن بنکر جاتے ہین، یا کسی معاہدہ کے تحت وہان زندگی گذارتے ہین، خواہ معاہدہ قولی ہو یا حالی[1] اُن کے لئے اموال اہل حرب کا مطلقاً مباح ہونا مسلم نہین جس کو دعویٰ ہو وہ اس پر دلیل قائم کرے،

اس تقریر سے یہ قیاس بھی باطل ہوگیا، کہ لاربا بین المسلم والحربی (مسلمان اور حربی کافر کے درمیان ربا نہین) یہ حکم ویسا ہی ہے، جیسا لاربا بین العبد والمولیٰ (کہ غلام اور آقا کے درمیان ربا نہین) کیونکہ غلام اور آقا کا تعلق ایسا ہے، کہ آقا بدون غلام کی رضا کے بھی اوس کا مال لے سکتا ہے، وہ حقیقت مین آقا ہی کا مال ہے، غلام کا مال ہے ہی نہین، اور حربی اہل صلح سے بدون رضا کے اس کا مال لینا جائز نہین، پس یہان رضا کا شرط ہونا وہان شرط نہ ہونا خود اس قیاس کے غلط ہونے کو واضح کر رہا ہے" حربی کی رضا کا مشروط ہونا اوس کی ملکیت کی دلیل ہے، اور ملکیت کے ساتھ اباحتِ مطلقہ کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، پس شرطِ رضا کے ساتھ مولانا کا یہ فرمانا کہ مباح وجائز مال کا مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کرکے قبضہ کرلینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے" بہت ہی بعید از قیاس ہے، اگر مال حربی مباح ہے تو صرف قبضہ کافی ہونا چاہئے، اس کی رضا شرط نہ ہونا چاہئے، مین اوپر بتلا چکا ہون، کہ اباحتِ مال اہل حرب کا حکم مطلق نہین، بلکہ خاص حالات کی ساتھ مخصوص ہے، جب کہ حربی غیر معصوم الدم ہو خواہ مقابلہ ومقاتلہ کی وجہ سے یا مصالحت نہ ہونے کی وجہ سے پس جب لشکر اسلام دار الحرب پر حملہ آور ہو یا کوئی

---

[1] ودلیل اعتبار المعاهدة الحالیة ما رواه ابوداؤد فی باب صلح العدو والبخاری فی باب الشروط فی الجهاد بلفظ وکان المغیرة صحب قوماً فی الجاهلیة فقتلهم واخذ اموالهم ثم جاء واسلم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منه فی شیء الحدیث،

قال القسطلانی لان اموال المشرکین وان کانت مغنومة عند القهر فلا یحل اخذها عند الامن فاذا کان الانسان مصاحباً لهم فقد امن کل واحد منهما صاحبه فسفك الدماء واخذ الاموال عند ذلك غدر والغدر بالکفار محظور وانما تحل اموالهم بالمحاربة والمغالبة،

وذکر نحوه الکرمانی وصاحب الخیر الجاری ولا نعلم فیه خلافاً وفیه دلالة علی عدم اباحة مال الحربی عند الامن،

اور معاہدہ حالی کے معتبر ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے باب صلح العدو مین اور بخاری نے باب الشروط فی الجہاد مین نقل کی ہے، کہ مغیرہ اسلام لانے سے پہلے چند آدمیون کے ساتھ تھے، ان کو قتل کرکے ان کے مال پر قبضہ کرلیا، پھر آکر اسلام لائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا اسلام تو مین قبول کرتا ہون لیکن اس مال سے مجھے کوئی تعلق نہین،

قسطلانی کا بیان ہے کہ مشرکین کا مال اگرچہ غلبہ کے وقت غنیمت ہو لیکن امن کی حالت مین ان کا خون بہانا اور ان کا مال لینا جائز نہین ہے اور پھر جب انسان ان کا ساتھی ہو تو گویا دونون ایک دوسرے سے مامون ہون گے اور ایسی صورت مین قتل و مال لے لینا دھوکا ہے اور دھوکا کفار کے ساتھ بھی ممنوع ہے، البتہ ان کا مال جنگ اور غلبہ کی صورت مین حلال ہے،

اسی قسم کی رائے کرمانی اور صاحب خیر جاری نے بھی ظاہر کی ہے جس مین کوئی اختلاف نہین ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ امن کی حالت مین دار الحرب مین حربی کا مال اس طرح لینا جائز نہین ہے،

مسلمان تصص یا قید کی حالت مین دار الحرب جائے، اس صورت مین مسلم کو حربی سے عقد ربا جائز ہوسکتا ہے، کیونکہ ان حالات مین بدون رضا کے غصباً وجبراً بھی وہ اس کا مال لے سکتا ہے، تو بذریعہ عقد ربا کے تراضی کے ساتھ بدرجہ اولی لیگا، اور غالباً حدیث مکحول مین حربی سے ایسا ہی حربی غیر معصوم الدم مراد ہے، کہ وہی حربی کامل ہے، والمطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل (لفظ مطلق سے فرد کامل ہی مراد ہوا کرتا ہے) اور عجب نہین کہ امام صاحب کی مراد بھی یہی ہو کیونکہ ظاہر روایت مین یہ قول بہت مجمل ہے کتب فتاوی مین جو اس کی تفصیل[۱] مذکور ہے امام ابو حنیفہ اور محمد کے کلام مین وہ تفصیل ابھی تک نہین ملی، اور اس صورت مین جواز عقد ربا سے آیت کے اطلاق یا عموم کی تقلید لازم نہین آتی، کیونکہ آیت مین حرمت ربا کی علت اوس کا ظلم ہونا مذکور ہے لا تظلمون ولا تظلمون اور یہ علت اسی وقت پائی جائے گی جب کہ عقد ربا معصوم الدم کے ساتھ کیا جائے، اور غیر معصوم الدم کا نہ مال معصوم ہے نہ جان کہ قہر وغضب سے بھی اس کا مال لینا جائز ہے تو وہان عقد ربا سے ظلم کا تحقق نہ ہوگا، مگر دوسرے ائمہ نے اس حالت مین بھی صورت عقد ربا کو اس لئے گوارا نہین کیا کہ ربا پر نص مین وعید شدید وارد ہے، تو گو اس حالت مین حقیقت ربا متحقق نہین، مگر جس چیز پر وعید شدید وارد ہے، اس کی صورت سے بھی بچنا چاہئے، لیکن جن حالات مین حربی معصوم الدم ہو اوس وقت اس کا مال اوس کی ملک ہے، ہمارے لئے بدون اوس کی رضا کے حلال نہیں اس وقت اس کو اس درجہ مین مباح کہنا کہ عقد ربا سے حقیقت ربا متحقق نہ ہو، بعید از قیاس ہے، پس ہندوستانی مسلمانون کو کفار ہند کے ساتھ عقد ربا جائز نہ ہونا چاہئے، کہ آیت قرآنیہ کا اطلاق اسی کو مقتضی ہے"

غالباً ناظرین نے اس تفصیل سے سمجھ لیا ہوگا، کہ ہمارے مولانا گیلانی کا یہ ارشاد کہ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کی عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہین چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعوی، کس قدر حقیقت سے دور ہے، بلکہ برعکس واقعہ یہ ہے کہ نص قرآنی اور بخاری کی اوپر کی حدیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے درجۂ شک مین بھی ان کی اباحت کی گنجایش نظر نہین آتی، چہ جائیکہ اباحت کا قطعی دعوی"

کیا ہمارے مولانا کو معلوم نہین کہ اس مسئلہ مین جملہ ائمہ نے امام ابو حنیفہ کی راے سے اختلاف کیا ہے حتی کہ ان کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف بھی ان کے ساتھ نہین ہین، دوسرے ائمہ کے پاس نص قرآنی کا قطعی فیصلہ ہے جس کے مقابلہ مین امام ابو حنیفہ کے پاس بجز ایک ضعیف حدیث یا ضعیف قیاس کے کوئی بھی قوی دلیل نہین، اور اس حالت مین ہمارے لئے اتنا ہی بس ہے، کہ امام صاحب کے اوپر سے کسی طرح مخالفت نص قطعی کے الزام کو دفع کرکے ان کے دامن اجتہاد کو طعن وتشنیع سے بچالین نہ یہ کہ اتنی جراءت سے کام لین کہ دوسرے ائمہ سے یہ مطالبہ کرین کہ قرآن وحدیث واجماع وقیاس

---

[۱] اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کی مراد وہی ہے جس کا فقہا رنے اپنے فتاوی میں ذکر کیا ہے، تو اس سے زیادہ سے زیادہ اُس مال کی اباحت ثابت ہوگی جس کو مسلمان نے حربی کی رضامندی سے دار الحرب مین لیا، لیکن مال کی اباحت عقد کی اباحت کو مستلزم نہین ہو، مثلاً ایک شخص نے اس کا ثبوت دے دیا، کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق بائنہ دی، اور قاضی نے اس کے مطابق فیصلہ کردیا، لیکن ثبوت جھوٹا تھا، تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس (جھوٹے) مدعی کے لئے اس عورت سے اس بنیاد پر شادی کرنا جائز ہے، کہ امام موصوف کے نزدیک معاملات کے انعقاد اور فسخ مین ظاہراً و باطناً دونون پہلوؤن سے قاضی کا فیصلہ نافذ ہوگا، باوجودیکہ یہ طریقہ بالاجماع حرام ہے،

غرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت پیش کرسکتے ہون، تو پیش کرین"

اس ناچیز نے اعلاء السنن مین امام صاحب کے اس قول کے متعدد دلائل بیان کردیئے ہین، مگر ان کا حاصل اتنا ہی ہے کہ امام صاحب کا یہ قول بے دلیل نہین، اس لئے کسی کو ان پر طعن کا حق نہین باقی، انصاف یہ ہے کہ دیگر ائمہ کا قول اس باب مین بہت قوی اور بڑا وزنی ہے، اس لئے ہم کو نصِ قرآنی پر نظر کرکے بے تکلف یہ کہنا چاہئے کہ اس باب مین مذہب حنفیہ وہ ہے جو امام ابو یوسف نے فرمایا ہے، کہ وہی ساری امت کا قول ہے، اور طرفین کا قول مذہب نہین، بلکہ مذہب کی ایک ضعیف روایت ہے، بشرطیکہ اس کا مطلب وہی ہو، جو کتب فتاوی مین بیان کیا جاتا ہے، اور ان کی مراد حربی سے غیر معصوم الدم ہے تو اس صورت مین دوسرے ائمہ کا اختلاف محض تورع پر مبنی ہے حقیقی اختلاف نہین،

آخر مین مولانا گیلانی فرماتے ہین:-

"افسوس کہ علماے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہین کیا، ورنہ ادھر ڈیڑھ سو سال مین مسلمان جن معاشی دقتون مین مبتلا ہوگئے، غالباً صورت حال یہ نہ ہوتی، ملک کے باشندون کا ایک طبقہ صرف سود لیتا رہا اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک مین پیدا ہوگیا ہے، اس کی ذمہ داری اسلام پر نہین بلکہ زیادہ تر علما پر اس لئے ہے کہ ان کے معاشی نظام مین اس صورت کا علاج موجود تھا، لیکن انھون نے ایک جزو پر عمل کیا، اور دوسرے کو ترک کردیا"

گویا مولانا کے نزدیک معاشی توازن قائم رہنے کی صورت یہ تھی، کہ مسلمان کفار کو سود دیتے بھی، اور ان سے لیتے بھی، ذرا مجھے بتلایا جائے کہ دار الحرب مین مسلمانون کا حربی کو سود دینا کس امام کے قول مین جائز ہے؟ اس کی اجازت تو امام ابو حنیفہ نے بھی نہین دی، اور نہ علمائے ہندوستان مین سے کسی نے اس کو جائز کہا، علما ہمیشہ سودی قرضہ لینے کو حرام کہتے اور لوگون کو اس لعنت سے بچنے کی تاکید کرتے رہے،

لعن اللہ آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدہ، اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے پر بھی لعنت کی ہے، اور دینے والے پر بھی، اور اس کے لکھنے والے پر بھی، اور گواہ پر بھی، اگر مسلمان ان کی نصیحت پر کان دھرتے، اور فضول خرچی اور عیاشی سے جو سودی قرضہ لینے پر مجبور کرتی ہے، دور رہتے تو یقیناً اس ملک مین معاشی توازن اس طرح قائم رہتا، کہ نہ مسلمان کسی کو سود دیتے نہ کوئی ان سے لیتا، نہ ان کی جائدادین سودی قرضہ مین نیلام ہوتین، نہ دوسری قومون کے گھر گھی کے چراغ جلتے،

پھر مجھے بتلایا جائے کہ ہندوستان مین وہ کتنے مسلمان ہین جنھون نے علما کے فتوی کی وجہ سے سود لینا چھوڑا ہے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ ہے، وہ برابر اس کو سود پر چلا رہے ہین، اور کافرون سے نہین، بلکہ مسلمانون سے سود لے رہے ہین کیونکہ کافرون کو سودی قرضہ دینے والے ہندو مہاجن بہت ہین، وہ مسلمانون سے سودی قرضہ لینے کیون آئین گے؟ اور بہت سے مسلمان اپنا روپیہ بنک مین جمع کرتے ہین، اور برابر بنک سے سود لیتے ہین، مجھے بتلایا جائے کہ ایسے مسلمان کتنے ہین جو علما کے فتوی کی وجہ سے بنک کا سود چھوڑ رہے ہین،

مولانا جن جن لوگون کے دلون مین علمار کے فتوی کی کچھ وقعت ہے، وہ نہ تو کسی کو سود دیتے ہین اور نہ کسی سے

لیتے ہین، اور وہ اس طرح معاشی توازن کو قائم کئے ہوئے ہین اور جو مسلمان دوسرون کو سود دے رہے ہین، وہ برابر اُن سے لے بھی رہے ہین، پھر بھی جو اس ملک مین معاشی توازن قائم نہین ہوتا، اوس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان فضول خرچیون سے باز نہین آتے، اور تجارت وصنعت وحرفت کو عار سمجھتے ہین، فضول خرچی نے جائدادین برباد کر دین تجارت وصنعت وحرفت کا ان مین حوصلہ نہیں، اور کسی مین ہے بھی تو اصول تجارت سے واقف نہین، الا نادرا وقلیل مَا هُمْ، دوسری قومین تجارت وصنعت وحرفت کے میدان مین بڑھتی چلی جارہی ہین، اور مسلمان ملازمتون اور نوکریون کے پیچھے پڑے ہوئے ہین جس مین آمدنی محدود اور ان کے مصارف غیر محدود، پھر اس ملک مین توازن معاشی کیونکر قائم ہو سکتا ہے، پس علماء کو الزام دینا سراسر غلط ہے، کیونکہ جو علماء دار الحرب مین حربی سے معاملہ ربا کو ناجائز کہتے ہین، وہ اسی کو اسلامی حکم سمجھے ہوئے ہین' اسلام صرف قول ابی حنیفہ کا نام نہین، بلکہ قرآن وحدیث کے احکام کا نام ہے، اگر قول ابی حنیفہ ان کے موافق ہو گا تو اسلام ہو گا، ورنہ امام کے قول کا کوئی محمل حسن تلاش کیا جائے گا،ؔ اور فتوی ائمہ حنفیہ کے اُس قول پر دیا جائے گا، جو قرآن وحدیث کے موافق ہو،

پس آپ ہندوستانی مسلمانون کو تجارت وصنعت وحرفت کی ترغیب دیجئے، فضول خرچی سے روکئے کہ ترقی اقتصادی کا صحیح راستہ یہی ہے، کافرون سے سود لینے مین کچھ ترقی نہین، کیونکہ کفار مسلمانون سے سودی قرضہ لینے کبھی نہ آئین گے، البتہ جو تاجر یا زمیندار گورنمنٹ کو ٹیکس یا لگان دے رہے ہین، اگر وہ ڈاکخانہ یا امپیریل بنک مین روپیہ جمع کر کے گورنمنٹ سے سود وصول کرین تو ان کو بقدر اپنے ادا کردہ ٹکس ولگان کے گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے، افتی بہ سیدی حکیم الامۃ قدس سرہ کیونکہ یہ سود لینا نہین بلکہ اپنے حق کو وصول کرنا ہے، وَهُوَ مَسْئَلَةُ الظفر بجنس حقه نافهم ولا تعجل والله تعالیٰ اعلم واجل ؂

ؔ چنانچہ ہم نے قول امام کے دو محمل اوپر بتلا دیئے ہین، وَالحمدُ للهِ علی ذٰلک فلیراجع۔

عرفانیاتِ فانی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی

(۳)

جہان تک فانی کے فلسفیانہ خیالات کا تعلق ہے، ان مین بھی ہم کو کوئی خاص عمق یا ندرت و جدت محسوس نہین ہوتی، بلکہ وہ صرف قدیم تخیلات کی صدائے بازگشت ہین، جو صدیون سے پامال ہوتے چلے آرہے ہین، مثلاً

عالم جز اعتبار نہان و عیان نہ تھا ۔۔۔ یعنی کہ تو عیان نہ ہوا اور نہان نہ تھا

مفہوم کائنات تمھارے سوا نہیں ۔۔۔ تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہان نہ تھا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری ۔۔۔ ہون تو مین شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

ہر تجلی ہے اک نظام جمال ۔۔۔ لاکھ عالم ہین ایک عالم کیا

نشان مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہین ۔۔۔ خدا کہان نہ ملا، اور کہیں خدا نہ ملا

غور کرو ان اشعار مین جو خیالات ادا کئے گئے ہین، ان مین فانی نے کوئی ترقی یا اضافہ کیا ہے، یا کوئی ایسا خاص پہلو پیدا کیا ہے، جو اب تک اہل حقیقت کی نگاہون سے مخفی تھا، اکثر طرز ادا کی طرفگی فرسودہ خیالات مین بھی ایک خاص لطف پیدا کردیتی ہے مین اس کو بھی غنیمت اور شاعرانہ کمال کی ایک بڑی دلیل سمجھتا ہون، لیکن اس حیثیت سے بھی ان اشعار مین کوئی ندرت نہین،

بعض لوگون کا خیال ہے کہ فانی کے کلام مین کچھ تصوف کا عنصر بھی نظر آتا ہے، ممکن ہے کہ انھون نے کچھ تصوف کے مسائل بیان کئے ہون، لیکن تصوف کی روح ہم کو پورے مجموعۂ زیر تنقید مین کہین نظر نہیں آئی، کاش وہ اس جام لاہوتی کے لذت شناس ہوتے تو ان پر یاس و قنوط کی کیفیت طاری نہ رہتی، بلکہ اصغر کی طرح وہ جوش مستی مین تمام عرصۂ عالم پر چھا جاتے،

ہٹا کے شیشۂ و ساغر، ہجوم مستی مین ۔۔۔ تمام عرصۂ عالم پہ چھا گیا ہون مین

فانی کے کلام کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ انھون نے تنوع مضامین کا بالکل لحاظ نہین رکھا، اور اپنی جبین نیاز صرف آستانۂ غم پر جھکا کر بیٹھ گئے، اور یہ نہ سمجھے کہ ایک ہی قسم کے خیالات کا اعادہ سہیم ذوق شناس طبیعتون پر کس قدر گران گذرتا ہے، اور شاعر کے کلام کو کس حد تک بے کیف بنا دیتا ہے، جس طرح چمن کی رونق مختلف رنگ و بو کے پھولون سے ہوتی ہے، اسی طرح چمنستان تغزل کا سرمایۂ آرایش شاعر کے گوناگون جذبات و احساسات ہوتے ہین، افسوس ہے کہ فانی نے صرف داستان غم کو اپنا واحد موضوع شاعری قرار دے کر غزل کے دائرۂ سخن کو اس طرح محدود کردیا، کہ اس کی تمام رنگینئ لطافت، اور دل آویزی کا خاتمہ ہوگیا، انھون نے زندگی کو صرف غم کی نگاہ سے دیکھا، اور اس طرح دیکھا کہ اس کے کسی گوشہ مین ان کو بجز یاس و حسرت و اندوہ کے امید و آرزو کی کوئی روشنی نظر نہین آئی، ان کے دل کی پژمردگی و افسردگی کا یہ عالم تھا کہ وہ برق و باران کے دلفریب منظر

سے بھی کوئی لطف نہین اٹھا سکتے تھے، اور ان کے نزدیک اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے،

"اک بے قرار تڑپا، اک دلفگار رو دیا"

لیکن یہی سمان جب ایک صاحب ذوق کی نگاہ سے گذرتا ہے تو وہ جوش نشاط مین بے اختیار پکار اٹھتا ہے :-

خم گردون سے موج مے اٹھی ہے کس قیامت کی (اصغر)

اب تک جو کچھ کہا گیا، اس سے مقصود یہ دکھانا تھا، کہ فانی نے معنوی لحاظ سے اردو تغزل کے قالب حیات مین کوئی جدید روح نہین پھونکی، اب دیکھنا یہ ہے کہ انداز بیان کی حیثیت سے غزل پر ان کے کیا احسانات ہین ؟

تاثیر شعر کی جان ہے، اس کے لئے حسن خیال کے علاوہ حُسن بیان نہایت ضروری چیز ہے، اکثر بلند اور لطیف خیالات محض اس لئے غارت ہوجاتے ہین، کہ شاعر اپنی طرز ادا مین کوئی خاص ندرت اور طرفگی پیدا نہیں کر سکا، اس بنا پر جو شعرا نکتہ رس اور بلاغت شناس ہوتے ہین، وہ لطافتِ خیال کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی خوبی اور دلکشی کا خاص لحاظ رکھتے ہین، اور ہمیشہ اس کوشش مین رہتے ہین، کہ معمولی خیال بھی ایسے اچھوتے طریقہ سے ادا کیا جائے، کہ سننے والا وجد کرنے لگے، اس کے لئے غیر معمولی قدرتِ زبان درکار ہے، خواجہ حافظ کو دیکھو ایک معمولی سی بات کو لیتے ہین، اور اپنے حسن بیان سے معجزہ بنا دیتے ہین، مثلاً یہ خیال کہ دنیا مین بجز نیکی کے اور کوئی چیز باقی رہنے والی نہین، ایک نہایت معمولی خیال ہے کہ لیکن اس کو اس دلکش پیرایہ مین ادا کرتے ہین،

برین رواق زبرجد نوشتہ اند بزر   کہ جز نکوئی اہلِ کرم نخواہد ماند

مولانا روم کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ؟ لیکن اگر ان کو خواجہ حافظ کی قدرت زبان ملی ہوتی، تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان کے کلام کا حسن کہان سے کہان پہونچا ہوتا !

غرض شاعر کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ شاعر ہے، ناصح یا واعظ نہین، خواہ وہ فلسفہ لکھے، یا علمی و اخلاقی نکتے بیان کرے، خواہ اسرار محبت کی گرہ کشائی کرے، یا مناظر قدرت کی تصویر کھینچے، ہر موقع پر اس کا انداز بیان شاعرانہ رہنا چاہئے، ورنہ اس کی تمام جدت طرازیان برباد ہوجائین گی، اور سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوگا، خواجہ حافظ کا کمال یہی ہے، کہ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، فلسفیانہ مضامین ادا کرتے ہین، لیکن انداز بیان کی شاعرانہ رنگینی اور لطافت مین فرق نہین آنے پاتا،

افسوس ہے کہ فانی نے پیرایۂ بیان کی جدت اور دلآویزی کا لحاظ بھی کم رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے اکثر عمدہ خیالات بھی بے مزہ ہو گئے ہین، اس کا اندازہ مثالون سے ہوسکتا ہے،

اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہ تھی بارے   یون میرے سرآنکھون پر تمیز حق و باطل

کنایہ ہے کہ بجز حق کے اور کسی شے کا وجود نہین ہے، دنیا مین جو کچھ ہے سب کچھ حق ہے، باطل کی کوئی حقیقت نہین، خیال کی خوبی سے انکار نہین، لیکن غور کرو، طرز ادا کس قدر خشک اور پھیکا ہے، خصوصاً ثانی مصرعہ کی ثقالت اور گرانی قابل لحاظ ہے، جس نے انداز بیان کو بہت کچھ صدمہ پہنچایا ہے، علاوہ اس کے فانی کے شعر سے اس کا پتہ نہین چلتا کہ آخر باطل کا وجود کیون نہین ہے ؟ اور ہر چیز حق کیون نظر آرہی ہے ؟ اس کا سبب محض طرزِ ادا کا نقص ہے، وہ شعر مین کوئی ایسا لفظ نہ رکھ سکے جو اس نقص کو رفع کر دیتا، دیکھو اقبال سہیل اس مشکل کو کتنے آسان طریقہ سے حل کر دیتے ہین،

چھایا ہوا ہے دیدۂ و دل پر جمالِ حق   باطل بھی اب نگاہ مین باطل نہین رہا

یہ صرف قدرت زبان اور طرز ادا کی خوبی کا فیض ہے، کہ اس شعر مین ایک عمدہ دعوی اس قدر

عمدہ طریقہ پر ثابت کر دیا گیا ہے، کہ دل کو تسکین ہو جاتی ہے، اور سامع کے ذہن کو کوئی الجھن محسوس نہین ہوتی،

جبر و اختیار کے پامال موضوع پر فانی نے بہت زیادہ طبع آزمائی کی ہے، لیکن پیرایۂ بیان مین کوئی خاص ندرت یا طرفگی پیدا نہ کر سکے، چند اشعار ملاحظہ ہون،

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے مین اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہین
زندگی جبر ہے، اور جبر کے آثار نہین — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہین
جسم آزادی مین پھونکی تو نے مجبوری کی روح — خیر جو چاہا کیا، اب یہ بتا ہم کیا کرین
مختار ہون کہ معترف جبر دوست ہون — مجبور ہون کہ یہ بھی کوئی اختیار ہے
محشر مین جبر دوست سے طالب ہون داد کا — آیا ہون اختیار کی تہمت لئے ہوئے

اس قسم کے اور بھی اشعار ہین، جن کو ہم طوالت کے لحاظ سے قلم انداز کرتے ہین، فانی نے تقریباً ہر شعر مین جبر و اختیار کے الفاظ استعمال کئے ہین، حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا، کہ علمی اصطلاحات کے علانیہ استعمال سے انداز بیان کی تاثیر بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے، اور شعر مین شعریت باقی نہیں رہتی، خواجہ حافظ بھی جبر کے قائل ہین، اور اس خیال کو مختلف طریقون سے ادا کیا ہے، مثلاً

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہمان می گویم
برق غیرت کہ چنین می جہد از پردۂ غیب — تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کنم

دیکھو حافظ نے جبر یہ اختیار کا لفظ کہین استعمال نہین کیا ہے، بلکہ محض لطیف تشبیہات کے پردے مین اپنے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور یہی ان کے پیرایۂ بیان کے موثر ہونے کا راز ہے، نفس خیال مین کوئی خاص ندرت نہین، لیکن طرز ادا کی خوبی نے ان اشعار مین جو دلآویزی پیدا کر دی ہے، اس کو ہر صاحب ذوق بآسانی محسوس کر سکتا ہے،

اب ہم چند اشعار بلا کسی تشریح کے نقل کرتے ہین جن سے ناظرین کو اندازہ ہوگا، کہ فانی کا انداز بیان اکثر کس حد تک غیر شاعرانہ ہوتا ہے،

مین ہون اک مرکز ہنگامۂ ہوش رم ہوش — دل اگر عالم مستی ہو تو سر عالم ہوش
عدم ہوش پہ ہے، فطرت ہستی مائل — کس توقع پہ اٹھائے کوئی ناز غم ہوش
بیخودی مایۂ طوفان خودی ہے یعنی — محرم جلوۂ اسرار ہے نا محرم ہوش
مظہر ہستی و خلاق عدم ہے مری ذات — کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہم ہوش

ان اشعار کو پڑھو، ان مین کہین جذبات کی تپش یعنی شعریت کی روح نظر آتی ہے' یہ نہین معلوم ہوتا، کہ کوئی شاعر دل کی گہرائیون سے بول رہا ہے، بلکہ یہ صاف محسوس ہوتا ہے، کہ کوئی بزرگ پیرانہ سال مکتب مین بیٹھے ہوئے فلسفہ کا درس دے رہے ہین،

اب اسے دار پہ لیجا کے سلا دو ساقی — یون بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

انداز بیان خصوصاً مصرعۂ اول جس قدر لطیف ہے، وہ محتاج اظہار نہین، لیکن افسوس ہے کہ شاعر کو اتنا بھی [illegible]

کا، جس کو رندوں کی فطری صلاحیت کا اندازہ نہ ہو، اوران کو اتنا پلا دے کہ قابو سے باہر ہو جائیں، اور سزا دینے کی ضرورت پیش آئے،

ازل میں خلق ہوئی تھی جو بجلیوں کی روح — تری نگاہ مری جان بے قرار ہوئی

خیال اچھا تھا، لیکن دیکھو محض طرزِ ادا کی خامی کی وجہ سے بالکل برباد ہو گیا، پہلے مصرعہ کی سستی بندش اور گرانی الفاظ محتاج بیان نہیں،

قدیم لکھنوی انداز بیان کی بھی جھلک اکثر فانی کے کلام میں نظر آتی ہے، مثلاً:-

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ — کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا

اللہ رے جوش بادِ بہاری ترا اثر — پیمانہ لڑکھڑا کے صراحی سے لڑ گیا

صیاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا — بے درد بند بند کسی کا جکڑ گیا

میرے دل کو چین آجانے کی ضامن موت ہے — تم کسی دن نبض دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا

ہنسی آتی ہے تیری سادگی شوق پر فانی — وہ میت ہی پہ کب آئے جواب آئیں گے مدفن پر

نگاہِ شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا — مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں

طوقِ منت کے بڑھا، ہو گئی منت پوری — بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

ساتھ جائے گا مری میت کے سامان خلش — دل میں رکھ چھوڑا ہے پیکان نے تیرے تیر کے

ہائے کیسی کشمکش ہے یاس بھی ہے آس بھی — دم نکل جانے کو ہے خط کا جواب آنے کو ہے

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہائے — وہ جنازہ پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

ابھری ہوئی ہے چوٹ دلِ دردمند کی — رکھنا قدم تصورِ جاناں سنبھال کے

نگاہِ ناز کا صدقہ نیاز مند ہیں ہم — کبھی قبول ہمارا سلام ہو جائے

سُننے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ان اشعار کی پستی تخیل پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، ان مثالوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فانی نے لطافتِ زبان اور حسن اسلوب وجدت ادا کے لحاظ سے غزل کو کوئی خاص ترقی نہیں دی،

فانی جیسا کہ ان کی فارسی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے، ایک بڑی حد تک فارسیت کے ذوق سے آشنا تھے، اس میں شبہہ نہیں، کہ فارسی ترکیبیں انداز بیان کو موثر اور دلکش بنانے میں بہت زیادہ معین ہوتی ہیں، بشرطیکہ وہ ثقیل و نامانوس نہ ہوں، غزل میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ غزل میں جو جذبات ادا کئے جاتے ہیں، ان کی نزاکت مقتضی ہے کہ جو زبان اختیار کی جائے، وہ لطیف، شیریں، شستہ اور ہر قسم کی گرانی اور ثقالت سے پاک ہو، لیکن فانی اکثر اس نکتہ کو بھول جاتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

ہوش سے احتراز کر فاش نہ غم کا راز کر — دغدغۂ حساب کیوں شکوۂ روزگار کیا

ہوش کا سرمایہ یہ وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں — عالم اک مجموعۂ ذراتِ صحرا بیز ہے

دل لہو کر دے وہ ضبط رنج پنہاں چاہئے — ہر لہو کی بوند لیکن رہنِ طوفاں چاہئے

یہ بےحسی جو شاید تنقید زندگی ہے | کچھ شرح بیخودی ہے کچھ ہوش کا فسانہ
ذرے سے اکتساب بیابان کئے ہوئے | دل کی لحد پہ خاک اڑانے چلا ہے عشق

خط کشیدہ ترکیبوں پر غور کرو، غزل کی زبان کے لحاظ سے ان میں کہاں تک شیرینی اور لطافت ہے،

فانی نے اکثر ایسی ترکیبیں استعمال کی ہیں جن کا مفہوم غالباً وہی خود سمجھ سکتے تھے، مثلاً محشر سکوت، گریۂ حیران سکوت برہم، عشرت تجلی وغیرہ،

اس میں شبہہ نہیں کہ فانی کی زبان میں ایک حد تک صفائی اور برجستگی ضرور ہے، لیکن حسن اسلوب اور جدت ادا کے لحاظ سے اکثر فروگذاشتیں محسوس ہوتی ہیں، جن کے متعلق ہم سطور مذکورۂ بالا میں اشارہ کر چکے ہیں،

اگرچہ ہمارے معیار تغزل پر فانی کا کلام پورا نہیں اترتا، تاہم اس کو خوبیوں سے بالکل معرا قرار دینا سخت ناانصافی ہوگی، فانی کو قدرت نے جو فلسفیانہ نظر اور شاعرانہ دماغ عطا کیا تھا، اس سے اردو تغزل کی تہذیب ترقی کی بہت کچھ بجا طور پر توقع ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ گرد و پیش کے خارجی حالات کی ناخوشگواری سے اس درجہ متاثر اور افسردہ ہو گئے کہ ان کا دست طلب ساز محبت کے پردہ ہائے آتشیں کو چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا غم کدہ کبھی کبھی حسن تخیل کی شعاعوں سے بھی چمک اٹھتا ہے، اور ایسے اشعار بھی ان کے قلم سے بےساختہ نکل جاتے ہیں، جو عام غزل گو شعراء کی دسترس سے باہر ہیں، بطور نمونہ کے چند اشعار اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے ہم نقل کرتے ہیں، جن سے بخوبی اندازہ ہو گا، کہ فانی کی نگاہ یکسر عامیانہ نہ تھی۔

وہ دامن نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے | اٹھ اے نگاہ شوق اٹھ متاع جاں لئے ہوئے
سیاہیاں امید کی تجلیاں لئے ہوئے | ترے کرم سے کیا سماں ہے عالم گناہ کا
شبنم کو جس نے بادۂ عرفاں بنا دیا | کیفیت نگاہ سرور آفریں نہ پوچھ
ہر بوئے گل کو میکدۂ جاں بنا دیا | ہر دو سے گل کو جلوہ گہ کیف صد بہار
خود شعلہ بن اور وادی سینا سے گذر جا | خود برق ہوا، طور تجلی سے گذر جا
اے نشۂ دیوانگی ہوش اتر جا | سرکار محبت میں خبر بےادبی ہے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈھتا ہوا | اے جذب بیخودی ترے قربان جائیے
یعنی بقدر تلخیٔ صہبا سرور تھا | لطف حیات بے خلش مدعا کہاں
وہ بے دلی کی جان تمنا کہیں جسے | دل حاصل حیات ہے اور دل کا ماحصل
اب دو نگاہ دے کہ تماشا کہیں جسے | کب تک رہیں ذوق تماشا ہو کوئی
سجدہ ہی در یار ہے سجدہ ہی جبیں ہے | گم ہیں رہ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی
خزاں شہید تبسم ہوئی بہار ہوئی | بہار نذر تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
ہے فکر ترا شمع شبستان تمنا | ہے یاد تری رونق خلوت گہ خاطر
گناہوں سے فضائے دل منور ہوتی جاتی ہے | مری ہر معصیت ہے مطلع انوار صد رحمت

اس شعر کی لطافت پر ذوق سلیم جس قدر وجد کرے کم ہے، دو ایک شعر اور ملاحظہ ہوں،

لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے | یا رب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی

تیرا کرم کہ تو نے وہ دل کو عطا کیا جو غم بقدر حوصلۂ آسمان نہین
اس کشتی ہستی کو طوفان ہی مبارک تھا گرداب حوادث کے آغوش مین تھا ساحل

تلاش سے مجموعۂ زیر تنقید مین اس قسم کے بلند و پاکیزہ اشعار اور بھی مل سکتے ہین جنھین پڑھ کر ایک وجدانی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور جن سے کسی حد تک فانی کی مذکورۂ بالا فروگذاشتون کی تلافی ہو جاتی ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، آخر مین مجھ کو اس کے اظہار مین تامل نہین کہ عام غزل گو شعرا مین فانی کا کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اور اگر وہ لکھنویت کے برے اثرات سے پاک ہوتا، تو بلاشبہ جدید غزل گو شعرا مین ان کا درجہ بلند ہوتا، فانی کی ہر فروگذشت کو بآسانی نظرانداز کیا جا سکتا ہے لیکن لکھنوی مذاق تغزل کا انھون نے جو نمونہ پیش کیا ہے وہ خود ان کے عارض سخن کے لئے ایک بدنما دھبہ ہے جس کو مذاق سلیم کسی طرح گوارا نہین کر سکتا، اس لئے مین نے اس حصہ پر کسی قدر سختی سے تنقید کی ہے تاکہ آیندہ غزل گو شعرا اس سے احتراز کرین تاہم حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ حق و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، لیکن اگر قلم نے کہین نادانستہ بے راہ روی اختیار کی ہو تو مین اس کے لئے فانی مرحوم کی روح سے معذرت خواہ ہون،

آخر مین انجمن ترقی اردو سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اصحاب ذوق کے لئے فانی کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب شائع کرے، جس سے ان کے کمالات شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکے، اس مجموعہ میں خزف ریزون کے ڈھیر مین ان کے جواہر پارے بھی چھپ کر رہ گئے ہین،

فقہی کتابین

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے، جس سے جدید فقہ کی ترتیب مین مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۸۰ صفحے قیمت ہے

القضاء فی الاسلام

اس میں طریقۂ شہادت اور انفصال مقدمات کے متعلق قرآن حدیث اور فقہ کی کتابون سے اخذ کر کے اسلامی اصول اور قوانین کی تشریح کی گئی ہے، اور قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے، ضخامت ۸۲ صفحے، قیمت ۱۰ر

اسلامی قانون فوجداری

مولانا سلامت خان المعروف بہ حذاقت خان کی کتاب الاختیار کا ترجمہ جس مین تمام تعزیرات و جرائم کے متعلق پندرہ ابواب مین اسلامی قانون فوجداری کی تمام دفعات فقہ کی مستند کتابون کے حوالہ سے جمع کی گئی ہین، قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید اور ضروری ہے،

ضخامت ۵۳ صفحے قیمت ہے

منیجر

روما کا ایک خط

"اٹلی کے پایۂ تخت روما سے یہ ایک خط موصول ہوا ہے، چونکہ اس مین بعض امور عام ناظرین کی دلچسپی کے ہین، اس لئے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے" "م"

پیڈ وا، روما، اٹلی

۴ر دسمبر ۴۷ء

مکرمی جناب سید صاحب

السلام علیکم، آپ کو شاید یاد ہوگا کہ ۱۹۴۰ء کے شروع مین مین نے یہان سے آپ کو ایک خط لکھا تھا، مجھے آپ کا جواب بھی مل گیا تھا، اس مین آپ نے اس ملک مین مشرقی علوم کی ترقی اور نشو و نما کی بابت دریافت کیا تھا، آپ کا خط ملنے کے کچھ ہی دنون بعد جنگ شروع ہو گئی، اور پھر کوئی خط و کتابت کا سلسلہ نہ ہو سکا، جنگ کی یہ مدت خوش و ناخوش نہین گذری، آپ سمجھ سکتے ہین کہ جنگ کا زمانہ، ہندوستانی پروانۂ راہداری، خوراک کی قلت، پولیس کی جارحانہ تفتیش، اور نگرانی، غرض ان تمام وجوہ سے زندگی ایک عذاب بن گئی تھی، اس عذاب کے زمانہ مین بہر حال جو کچھ ممکن ہو سکا، مین نے خاصکر اسلامی علوم کی نشو و نما کی بابت کچھ مواد فراہم کیا، مگر وہ تمام جستہ جستہ یادداشت کی صورت مین ہے، اور پولیس کی نگرانی اور تفتیش کے خیال سے آج تک ایک لفظ نہین لکھا کہ مبادا کسی روز تمام سامان کی تلاشی ہو، اور یہ مضمون پا کر وہ سمجھے کہ مین کوئی روزنامچہ تیار کر رہا ہون، اور پھر اسے لیجائے، یہان ذاتی روزنامچے پولیس کی تحقیقات کا ایک ضروری جز تھے، تفتیش کے دوران مین پولیس اس قسم کے کاغذات پر پہلے قبضہ کرتی تاکہ اس سے پتہ چلے کہ کن کن لوگون کے حالات اس مین درج ہین، اور لکھنے والے کے کیا خیالات ہین، مسولینی کی حکومت اتنی جابرانہ تھی، کہ لوگ جب صبح کو اٹھتے تھے، تو خوش ہوتے تھے، کہ ایک رات اور آزادی کی گذر گئی، پولیس ہمیشہ آدھی رات کو یا صبح ۴ بجے آتی، اور خانہ تلاشی اور گرفتاریان کرتی، سلطان عبد الحمید خان کا نام مفت بدنام ہے، مسولینی نے جس قسم کی جابرانہ حکومت کی ہے، اس کی اگر آپ تفصیل سنین تو یقیناً کہین گے، کہ مشرق کا کوئی شخص بھی شیطنت کی اس حد تک نہین جا سکتا، بیٹا باپ پر جاسوسی کرتا ہے، شوہر اور بیوی ایک دوسرے پر شبہ کرتے ہین، بھائی بھائی مین بگاڑ ہے، اور لطف یہ کہ سب کے سب مسولینی کے تنخواہ دار جاسوس ہین، یہ ہے اس چیز کا کرشمہ جس کو کہا جاتا ہے تہذیب!

مشرقی علوم سے آپ کا کیا مطلب تھا ؟ مشرقی علوم مین تو سارے مشرق کے علوم آتے ہین، یعنی چینی، جاپانی، سنسکرت، عربی، فارسی، عبرانی زبانون کی تعلیم اور ان کی تاریخ پر تصنیفات، ان تمام علوم پر مواد فراہم کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے، البتہ عربی فارسی کے متعلق مین نے کچھ مواد فراہم کیا ہے، اگر آپ کہین تو ان کو ایک مضمون کی شکل مین مرتب کر کے بھیجون، اس سلسلے مین مشرقی علوم خاص کر عربی زبان کی تحصیل کی ابتدا نہایت دلچسپ ہے، یورپ مین یہ پہلا ملک ہے، جہان عربی زبان کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا، عام طور پر کتابون مین درج ہے، کہ پوپ نے اسلامی ممالک مین عیسائیت کی تبلیغ کے لئے عربی زبان کی تحصیل کو ضروری سمجھا، اور پادریون کے لئے مدرسے قائم کئے، یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر دو چیزین اور بھی ہین، جو میرے ذہن

مین آئی ہین، اور جن کے متعلق مین نے تھوڑی بہت تحقیقات بھی کی ہے، اول یہ عیسائی تبلیغ صلیبی جنگون کے بعد شروع ہوئی جس سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت نے دراصل ہتھیار بدل دیئے یعنی جب تلوار سے کام نہ چلا تو پھر قلم اور زبان کا ظاہراً پرامن طریقے پر استعمال ہونا شروع ہوا ۔۔۔۔۔ لیکن دوسری وجہ اور بھی دلچسپ ہے، یہ بات تو اب علمی دنیا مین رفتہ رفتہ آتی جاتی ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ بڑی حد تک اسلام کی مرہون منت ہے، اور اسلام کا یہ فیض صقلیہ اور ہسپانیہ سے شروع ہوا، صقلیہ مین جب اسلامی علوم کا آفتاب طلوع تھا، تو اس کی کرنین اس ملک تک برابر پہنچتی تھیں، انہی کرنون نے دراصل ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکی کو صاف کیا، اس سے عیسائی دنیا کے عقائد مین ایک ہل چل پیدا ہوگئی، پھر کلیسا کے بجائے عقل اور درایت کی رہنمائی تسلیم کی جانے لگی، لوگون کو خیال پیدا ہوا، کہ یہ سارا کرشمہ عربی علوم کا ہے، اس لئے عقل و درایت کے مخالفین نے اس طوفان کو روکنے کے لئے اصل عربی ماخذ کی طرف توجہ کرنی شروع کی تاکہ عقل کے حامیون کا جواب خود عربی مصنفین کی تصنیفون سے دیا جاسکے، یہین سے دراصل عربی علوم کی ابتدا ہوتی ہے، لیکن اس کا اب کوئی ذکر نہین کرتا، کیونکہ مسلمانان دگرگون اور مسلمانی در کتاب نے خیالات کی رو کو علم سے ہٹا کر استعماری سیاست کے میدان مین ڈالدیا ہے ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

دنیا مین فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

اس سلسلہ مین پرنس کاتانی کے کتب خانے مین ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ تین جلدون مین ہے، اور لاطینی زبان مین ہے، اس کا سنہ اشاعت غالباً ۱۶۵۵ء ہے، مصنف اس کا سوئستان کا باشندہ تھا، اس کتاب مین اس نے بتایا ہے کہ طامس اکوناس کے فلسفے پر بہت گہرا اسلامی اثر پڑا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کلیسا آج تک اس مصنف کے خلاف مضامین لکھتے ہین، اور اس کی غلطی فاش کرتے ہین، یہان ایک بات ضروری کہنی ہے، آپ کا ادارہ اسلامی تاریخ کے گم شدہ اور بھولے ہوئے اوراق کو جمع کرنے اور یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے، اس سلسلے مین غیر زبانون کا علم بے حد ضروری ہے، غیر زبانین اگر آج ہمارے ملک مین کم رائج ہین، لیکن کل ضرور ان کا علم زیادہ ہوگا، لیکن اس سلسلہ مین سب سے پہلے غیر زبانون کی کتابون کی فراہمی ضروری ہے، ہمارے کتب خانے غیر زبان کی کتابون سے بالکل خالی ہین، یہان اس ہنگامۂ دار وگیر مین صقلیہ اور ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ کی بابت بہت سے پرانے نسخے بازار مین آئے ہین، یہ اطالوی فرانسیسی اور ہسپانوی زبان مین ہین، یہ خیال کرکے کہ آپ کا ادارہ ان سے دلچسپی لیتا ہے، یہ خط آپ کو لکھ رہا ہون، دو تین کتابون کے نام لکھتا ہون، اول صقلیہ مین اسلامی دور کی تاریخ، یہ اطالوی زبان مین تین جلدون مین ہے پہلا اڈیشن اس کا ۱۸۷۲ء مین شائع ہوا، اور دوسرا ۱۹۳۳ء مین، قیمت کوئی پانچسو لیرا کے قریب، اسی مصنف (میکئیل اماری) کے قلم سے صقلیہ مین فریڈرک دوم کے حالات پر دوسری تصنیف بھی ہے ۱۸۵۶ء، قیمت کوئی دو سو لیرے، سوم صقلیہ پر اجانب کی حکومت ۱۸۸۴ء قیمت کوئی ۱۵۰ لیرے،

پھر ہسپانوی تاریخ پر کئی کتابین ہسپانوی زبان مین ملتی ہین، اس سلسلے مین ایک چیز اور آپ کو سناؤن، ہسپانوی اکادیمی کے صدر کے قلم سے ۱۹۳۵ء مین ایک طویل مقالہ ہسپانوی شاعری پر شائع ہوا، اس مین انھون نے بتایا ہے کہ جدید ہسپانوی شاعری، اور اس کے ذریعہ سے جدید یورپ کی شاعری بڑی حد تک عربی شاعری کی ممنون احسان ہے، یہ کوئی ۔ صفحے کا مضمون ہے، اس مین انھون نے اسلامی دور کی ہسپانوی شاعری پر ایک نہایت فاضلانہ تبصرہ کیا ہے،

پھر لفظی، صوری، اور معنوی لحاظ سے یورپ کی شاعری پر اس کے درجہ بدرجہ اثرات کو ظاہر کیا ہے، اگر موقع ملا، تو اس مضمون کا ترجمہ کرون گا، ورنہ پھر کسی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھون گا،

ہان تو اگر آپ مندرجۂ بالا یا اس قسم کی دوسری کتابون کو دار المصنفین کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہین تو اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ عبدالرحمٰن صدیقی، ایم ایل اے، اڈیٹر مارننگ نیوز، کلکتہ کو لکھین، براہ راست ہندوستان سے کسی قسم کی کوئی رقم یہان نہین آسکتی، البتہ لندن سے یہ رقم یہان آسکتی ہے، لیرا اور پونڈ کے درمیان جو نرخ تبادلہ مقرر ہوا ہے اس کی شرح ۱ پونڈ = ۴۰۰ لیرا ہے، عبدالرحمٰن صاحب اپنے لندن کے دفتر کے ذریعہ یا لندن مین اور کسی کے ذریعہ سے یہ رقم یہان بھیج سکتے ہین، پھر جون ہی آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہوگا، یہ کتابین آپ تک پہنچ جائین گی، میرے متعلق اگر آپ اور کوئی معلومات چاہتے ہون، تو وہ رحمٰن صاحب سے مل سکتی ہین،

آپ کو شاید یاد ہوکہ مین نے کائتانی کی تاریخ اسلام کے اردو ترجمہ کرنے کا ذکر کیا تھا، مگر آپ نے اس کے نفس مضمون کے متعلق کچھ شبہہ ظاہر کیا تھا، مین نے بعد کو جو اس کی اور دوسری تصنیفین دیکھین تو مجھے آپ کی راے یاد آئی، اور مجھے اس سے پورا اتفاق ہے، در اصل کائتانی کے اسلام کے متعلق صحیح خیالات اس کی تاریخ اسلام مین نہین ملتے، مگر اس کی دوسری چھوٹی تصنیفون مین ملتے ہین، اور ان تصنیفون کا بہت کم لوگون کو علم ہے، ان تصنیفون مین تو وہ بعض جگہ ازمنۂ وسطی کے پادریون سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اور وہ رویہ اختیار کرتا ہے، جو صلیبی جنگون کے جنون کو یاد دلاتا ہے، گو اس پر علم کا پردہ ڈالا گیا ہے جس پر معلومات اور غیر جانبداری کی خوب مینا کاری بھی کی گئی ہے، لیکن اس کا کتب خانہ بلا شبہ ایک عجیب چیز ہے، سنہ ۱۹۲۵ء میں اوس نے اپنا کتب خانہ یہان کے ایک بڑے کتب خانہ کو دے دیا، پندرہ برس یہ تمام کتابین کس مپرسی کے عالم مین پڑی رہین، جنگ کے زمانے مین جب یہان کے لوگون کو مصر، شام فلسطین پر قبضہ کرنے کا شوق چرایا، تو معلومات کی ضرورت ہوئی، اور پھر اس کتب خانے کو مرتب کرنے کی فکر ہوئی، گو کام پہلے شروع ہوگیا تھا، مگر پوری ترتیب سنہ ۱۹۴۰ اور سنہ ۱۹۴۱ مین ہوئی، اور مئی سنہ ۱۹۴۱ء مین اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، اس کتب خانے مین اسلامی تاریخ کی بابت فرانسیسی، جرمن، انگریزی، عربی، اور ایک حد تک روسی مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، پھر انیسوین صدی مین جو چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف ملکون مین شائع ہوتے اور جو بعض معلومات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہین، وہ بھی یہان ملتے ہین، اس کے قلمی نسخون کی ایک فہرست بھی شائع ہو چکی ہے، اگر آپ کو کسی معلومات کی یا کسی کتاب سے کچھ حصہ نقل کرنے کی ضرورت ہو، تو مرا سے مہربانی ضرور لکھئے،

آپ کی نظر سے ابن جبیر کا سفرنامہ ضرور گذرا ہوگا، اس کا عربی ایڈیشن لیڈن سے مدت ہوئی، پروفیسر دی گوئیے (DE. GOEJE) نے تصحیح کے بعد شائع کیا، پھر ۱۹۰۶ء مین اس کا ایک اطالوی ترجمہ یہان سے شائع ہوا، یہ ترجمہ میری نظر سے گذرا، میرے خیال مین یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ ہو،[1] میں تو آپ کے سامنے یہ تجویز پیش کرون گا کہ عربی سیاحون کے جتنے سفرنامے ہین، ان کا اردو ترجمہ شائع ہونا چاہئے، یہ معلوم کرکے افسوس ہوتا ہے، کہ یورپ کی زبانون مین ان کے ترجمے چھپتے ہین، جہان ان کے پڑھنے والے تھوڑے لوگ ہین، مگر خود ہماری

---

[1] معارف:- اس کا اردو ترجمہ رامپور سے شائع ہوچکا ہے،

زبان میں اس کے ترجمے موجود نہیں ہیں، حالانکہ ہماری تاریخ اور ثقافت کے لئے یہ سفر نامے کتنے ضروری ہیں،

حال میں یہاں عمر خیام کی رباعیات کا ایک ترجمہ شائع ہوا ہے، شروع میں ایک تنقیدی دیباچہ بھی ہے، اس دیباچہ میں وہی حالات درج ہیں جو تذکرۂ دولت شاہ اور دوسرے مغربی مصنفین کی تصنیفوں میں ملتے ہیں، مگر اس کی شاعری کو پرکھنے اور اس پر صحیح تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے ایک ایسی لسانی تیاری کی ضرورت تھی جو لغات کی ورق گردانی سے بالاتر ہو یعنی اس تمدن کی رگ رگ میں سرایت کرنے اور اسی فضا میں سانس لینے کی ضرورت تھی، اور یہ چیز اس براعظم کے باشندوں کے لئے آسانی سے ممکن نہیں، اس لحاظ سے مجھے اجازت دیجئے، اگر میں آپ کی تصنیف عمر خیام کا ذکر کروں، جو یہاں کی اس قسم کی تمام تصنیفوں سے کہیں بلند ہے، میں نے جب اس کا مترجم سے ذکر کیا، تو انھوں نے آپ کی تصنیف دیکھنے کا بہت شوق ظاہر کیا، گو اردو سے اپنی لاعلمی پر افسوس بھی کیا، پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران کی چوتھی جلد میں شعر العجم کا ذکر جس پیرایہ میں کیا ہے، اس سے اردو کا شوق بعض لوگوں میں بڑھ گیا ہے لیکن اردو کے شائقین میں ایک بڑا حصہ ایسا ہے، جو اردو کی تحصیل کو محض استعماریت کے آلے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے، کیونکہ بغیر اس آلے کے اس جماعت کے خیال کو نہیں سمجھا جا سکتا، جو یہ زبان بولتی اور لکھتی ہے،

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے،

اگر آپ ہوائی ڈاک سے جواب دیں گے تو مجھے جلد مل جائے گا، گو میں ہوائی ڈاک سے خط نہیں بھیج سکتا کیونکہ غیر فوجی اشخاص کو ہوائی ڈاک استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے،

خاکسار

ریاض احسن

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد

ادب اور زندگی

از جناب مجنون گورکھپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عارپتہ کتابخانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

یہ کتاب نئے ترقی پسند ادب، پرانے اردو ادب اور ادب کے بعض دوسرے پہلوؤن پر مصنف کی چند تنقیدی تقریرون اور مضامین کا مجموعہ ہے، ادب وزندگی، مبادیات تنقید، زندگی اور ادب کا بحرانی دور، ادب اور ترقی، ہندوستانی ناٹک، نظیر اکبرآبادی حالی کا مرتبہ اردو ادب مین، نیا ادب کیا ہے، اردو افسانے مین جدید میلانات، ان مضامین مین ترقی پسند ادیب کے نقطۂ نظر سے پرانے ادب پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے، اور نئے ادب کی حقیقت اور اس کی ضرورت واہمیت ظاہر کی گئی ہے، نیا اور ترقی پسند ادب نئی اصطلاح ضرور ہے لیکن نئی چیز نہین ہے، بلکہ وہ اپنے ماقبل کے مقابلہ مین نئے زمانہ کے مذاق ورجحان کا فطری نتیجہ ہے ہر دور کے ادب کو اس مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، صرف زمانہ کے مذاق ورجحان کا فرق ہے، اردو زبان کا موجودہ دور بھی اس سے مستثنیٰ نہین ہے پچھلے سو برس سے لیکر مصنف کی اس تالیف تک ہر زمانہ مین اُس کے رجحان و مذاق کے مطابق پرانا ادب بدلتا اور نیا اور ترقی پسند ادب پیدا ہوتا رہا، غالب اور سرسید کے عہد سے یعنی جب سے اردو مین خیالی افسانہ طرازی کے بجائے واقعیت وسنجیدگی پیدا ہوئی، خیالات و رجحانات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو ادب ترقی کے کتنے مدارج طے کر چکا ہے، سرسید کے زمانہ مین اصلاح معاشرت، تعلیم جدید، مغربی علوم و فنون اور مغربی خیالات کا زور تھا، اس لئے اس زمانہ کا ادب بھی اسی کا ترجمان ہے، شعروشاعری مین ترقی پسند خیالات کا نمونہ مولانا حالی کا مسدس اور مقدمۂ شعروشاعری ہے، اس کے بعد آزادی سیاست کا دور شروع ہوا، اس مین جس قدر ترقی ہوتی گئی اسی تناسب سے ادب پر سیاست کا رنگ چڑھتا گیا، اب اشتراکیت اور اقتصادیات کا زمانہ ہے اسلئے اس کے اثرات و نتائج بھی فطری ہین، اسلئے ترقی پسند ادب کوئی نئی چیز ہے، اور نہ اس کا موجودہ معیار آخری معیار ہے، آج کا ترقی پسند ادب پچاس سال کے بعد افسانۂ پارینہ اور قدامت کی دستاویز بن جائے گا، اس لئے قدیم ادب کے شیدائیون اور نئے ادب کے پجاریون مین نفس ترقی پسندی مین نہین بلکہ ترقی پسندی کی تعبیر اور اس کی بے اعتدالی اور انتہا پسندی مین اختلاف ہے

ترقی پسند ادیبون کا یہ کہنا کہ ہمارا پرانا ادب عوام اور نیچے طبقون کی زندگی سے الگ ہے، بڑی حد تک صحیح ہے لیکن یہ پرانے ادب اور پرانے ادیبون کا نقص نہین بلکہ ہندوستان کی جہالت کا نتیجہ ہے، ضرورت ادب پیدا کرتی ہے، ادب ضرورت نہین پیدا کرتا، ایسے جاہل عوام کے لئے جن مین ادب سے فائدہ اٹھانے ہی کی صلاحیت نہ تھی، ادب پیدا کس طرح ہوسکتا تھا جس قسم کے ادب و افسانون کا ذوق اس زمانہ کے عوام مین تھا، اور جس حد تک اس سے فائدہ اٹھانے کی ان مین صلاحیت تھی، اس قسم کا ادب موجود تھا، اور آج بھی ہو سنسکرت ہندی اور فارسی کے بہت سے عام پسند قصون اور حکایتون کے ترجمے بلکہ ہندی آمیز اردو کے کہانیون کی کتابین ہر زمانہ مین موجود تھین، جن سے عوام لطف اندوز ہوتے تھے، یہ صحیح ہے کہ اس مین دیہاتی زندگی کی مصوری

مزدوروں اور کسانوں کی اصلاح و ترقی کی تعلیم، اور خالص دیہاتی مذاق کی چیزیں نہ تھیں لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں ترقی پسند ادب کی اصلی غرض و غایت کے اعتبار سے موجودہ ترقی پسند ادب اور پرانے قصے کہانیاں دونوں جاہل عوام کے لئے برابر ہیں، بلکہ پرانے قصص و افسانے تو ان کی مجلسوں کو گرم بھی کرتے تھے، اور کم از کم ان کے لئے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے تھے، اور موجودہ ترقی پسند ادب سے استفادہ کا سوال تو الگ ہے ان کے کانوں تک اس کا پہنچنا بھی مشکل ہے اور وہ محض خواندہ طبقہ کی تفریح ذہنی کا ذریعہ ہے، ترقی پسند ادیبوں نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس سے کتنے غریب جاہل دیہاتی فائدہ اٹھا سکے ہیں، اور ان کی زندگی کہاں تک سنور سکی ہے، محض کاغذ کے صفحات پر فلسفہ بیان کر دینے سے تو کچھ حاصل ہوتا نہیں، جب تک عوام جاہل ہیں ان کے لئے لیلیٰ کا پرانا افسانہ اور مجنوں کی یہ نئی ڈائری" دونوں برابر ہیں، درحقیقت سیاست کے ساتھ ادب میں بھی وہی اندھی ذہنی غلامی کارفرما ہے، سارے ترقی پسند ادیب سوویٹ لٹریچر کی تو نقالی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے، کہ روس اور ہندوستان کے حالات میں فرق کتنا ہے وہاں انقلاب روس سے پہلے بھی عوامی ادب سے فائدہ اٹھانے والا خاصہ طبقہ موجود تھا، اور انقلاب کے بعد تو قریب قریب ہر شخص تعلیم یافتہ یا کم از کم خواندہ ہو گیا، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی حالت کو دیکھئے پھر دونوں کے سیاسی حالات میں بڑا فرق ہے، غرض یہ ہے کہ محض کاغذی گھوڑے دوڑانے سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، ضرورت اس کی ہے کہ پہلے ان کو نئے ادب سے فائدہ اٹھانے کے لائق بنایا جائے،

ترقی پسند ادیبوں کا سب سے بڑا عیب ان کی انتہا پسندی اور بے اعتدالی ہے، انھوں نے ترقی پسند ادب کو خاص طرز کے افسانوں اور نظموں میں محدود کر دیا ہے، اور مذہب و اخلاق کے استہزاء و استخفاف اور فحاشی اور عریاں نگاری کو نئے ادب کا ضروری جزء بنا لیا ہے جس سے نہ صرف اردو زبان بلکہ خود ترقی پسند ادب کی مقبولیت کو نقصان پہنچ رہا ہے، اور سنجیدہ طبقہ کو خواہ وہ قدیم تعلیم یافتہ ہو، یا جدید اس سے کراہت پیدا ہوتی ہے، کوئی زبان محض انقلابی افسانوں اور نظموں پر زندہ نہیں رہ سکتی، دین و مذہب کی تحقیر ترقی پسند ادب کا ایسا ضروری جزء بن گئی ہے، کہ لائق مصنف بھی جن کا شمار سنجیدہ اور خوش مذاق ترقی پسند ادیبوں میں ہے، اس کے خرافات سے اپنا دامن نہ بچا سکے، اور ان کے قلم سے ایسی لغو اور غلط باتیں نکل گئیں، جس کی توقع کسی پڑھے لکھے آدمی سے نہیں کی جا سکتی، مثلاً انھوں نے سامنتی دور کی کتابوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں "ایک وہ ہیں جن میں ترک دنیا اور درویشی کی تعلیم دی گئی ہے، دوسری وہ ہیں جن میں یا مجادلہ و مقاتلہ اور کشت و خون کی ترغیب دی گئی ہے، یا عیش و امارت و فرصت و فراغت کی زندگی کی تخئیل ہے، (ص) اس میں انھوں نے گلستان سعدی ...... کو بھی شامل کیا ہے، یہ تو بدگمانی نہیں کی جا سکتی، کہ مصنف کی نظر سے یہ کتاب نہیں گذری یا وہ اس سے واقف نہیں لیکن اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انتہا پسندی اور غلط روی انسان کو کہاں تک پہنچا سکتی ہے گلستان کے متعلق یہ ایسا انکشاف ہے جس کی جانب آج تک کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "نعوذ باللہ کلام مجید اور انجیل ادبی اختراعات اور معقول و مدلل ادبی خرافات ہیں" اور اس کے مقابلہ میں مہابھارت اور رامائن کو اپنے زمانہ کی غیر فانی یادگار قرار دیا گیا ہے، خوب ع :-

یا ترقی آیجاں یا تنزل ایں چنیں

خدا کے کلام کے مقابلہ میں یہ آزادی اور انسانوں کے مواخذہ کا یہ خوف بیشک ایک انقلابی کی یہی شان ہونی چاہئے اور دانشمندی کا تقاضا بھی یہی تھا،

اوراقِ گل مرتبہ جناب ضمیر احمد صاحب ہاشمی ڈپٹی ریونیو منسٹر ریاست رام پور، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۵۲ صفحے، کاغذ نفیس، کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت مرقوم نہیں، غالباً کتب خانہ یا بزم سخن رامپور سے ملے گی۔

اردو شاعری اور اساتذہ سخن کی قدردانی اور سرپرستی ریاست رامپور کی دیرینہ روایت ہے، دلی اور لکھنؤ کی محفل اجڑنے کے بعد یہاں کے گم کردہ آشیان نو اسنجون کو ریاست رامپور ہی کے سایۂ عاطفت مین پناہ ملی تھی، اور رامپور اردو شاعری کا تیسرا مرکز بن گیا تھا، اب بھی وہان شعر و سخن کا مذاق موجود اور بزم سخن کے نام سے ایک مجلس قائم ہے، جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مشہور اور نامور شعراء کو مدعو کرتی رہتی ہے، اس لطف مین دوسرون کو شریک کرنے کے لئے مجلس مذکور کی جانب سے اس کے مدعو کردہ انتیس مشہور شعراء کا یہ دلچسپ تذکرہ شائع ہوا ہے، اس مین ان شعراء کے مختصر حالات، فوٹو، قلمی عکسی تحریرین، کلام کا انتخاب اور اردو زبان و شاعری کی اصلاح و ترقی کے متعلق چند استفسارات کے جوابات ہین، اس جدت نے اس تذکرہ کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے، ظاہری نفاست بھی دلفریب ہے، کاغذ کے اس قحط کے زمانہ مین یہ اہتمام ایک ریاست ہی کر سکتی تھی، یہ تذکرہ ظاہری اور باطنی دونون خوبیون کے لحاظ سے اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

شمس بازغہ از جناب محمودہ رضویہ مدیرہ رسالہ شعاع، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت مجلد عہ، پتہ:- مجلہ شعاع اردو و انجمن ترقی اردو کراچی،

اردو مین سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا وافر اور مستند ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے، کہ اس کی مدد سے بآسانی سیرتِ نبوی پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جا سکتے ہین، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی قسم کا رسالہ ہے، واقعات صحیح اور اسلوب تحریر مناسب ہے، البتہ کہین کہین مبالغہ کا رنگ آگیا ہے، اور ایک دو مقامون پر واقعات کی ترتیب مین فرق ہے، غالباً اصل مقصود کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور ترتیب کا لحاظ عمداً نہین کیا گیا ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے لائق قدر ہے، کہ ایک خاتون کی تصنیف ہے، لیکن سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر شمس بازغہ کی تمثیل ایک عورت کی شکل مین بہت نامناسب ہے، اس تصویر کے نیچے مصنفہ کا نام اور اشتباہ پیدا کرتا ہے، کہ وہ شمس بازغہ کی تمثیل ہے، یا مصنفہ کی قلمی تصویر، کتاب کے آخر مین یزید اور زینب کا واقعہ بالکل بے جوڑ ہے، اس کو سیرت نبوی سے کیا تعلق، پھر اس قسم کے واقعات کے قبول کرنے مین بڑی احتیاط کی ضرورت ہے،

ہندوستان کی معاشی ترقی کا لائحہ عمل } مترجمہ جناب سعید احمد صاحب مینائی بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر، پتہ مکتبہ امداد باہمی طلبائے جامعہ عثمانیہ، انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن،

کسی ملک کی معاشی ترقی کے مفہوم مین وہ ساری ضروریات و لوازم داخل ہین، جو موجودہ زمانہ مین کسی ملک کی ترقی و آسودہ حالی کے لئے ضروری ہین، اس لحاظ سے ہندوستان کی معاشی حالت بہت پست ہے، یہان کے آٹھ معاشی اور کاروباری ماہرین نے ہندوستان کی آیندہ ابتدائی معاشی ترقی کی ضروریات اور اس کے مصارف کا ایک اجمالی خاکہ انگریزی زبان مین مرتب کیا تھا، لائق مترجم نے اردو مین اس کا ترجمہ کر دیا ہے، انگریزی مین تو اس قسم کی بہت سی کتابین ہین، لیکن اردو دان طبقہ کے معلومات کے لئے غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل کتاب نہ مل سکے گی اور اس زمانہ مین اس قسم کے مسائل عام ہین، اس لئے اس کتاب کا ترجمہ مفید ہے

"م"

جلد ۵۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۱۲۹-۱۳۰
زمانۂ حاضر کا انسان اور اقبال	ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۱۳۱-۱۴۱
انڈونیسیا	جناب مولوی محمد صابر صاحب ندوی کسماڑی متعلم مسلم یونیورسٹی	۱۴۲-۱۵۳
استدراک بر ترجمۂ ابن خلکان	جناب مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد	۱۵۴-۱۵۵
اردو کی دو قدیم کتابیں	جناب ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی لکچرار اردو لکھنؤ یونیورسٹی	۱۵۶-۱۵۷
تابش سہیل	جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل	۱۵۸
غزل	جناب عزیز احمد صاحب بلال جھانسی	
مطبوعات جدیدہ	"ا-ع"	۱۵۹-۱۶۰

شذرات

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ معارف اپنی پہلی ضخامت کی طرف آہستہ آہستہ لوٹ رہا ہے، پچھلے مہینہ سے ۳۲ صفحون پر شائع ہو رہا ہے، انشاء اللہ آیندہ ماہ سے ۴۸ پر ہوگا، اور امید ہے کہ چند ماہ کے بعد اس کی اصلی ضخامت پھر اپنی جگہ پر آجائے گی، صفحون کی کمی کے سبب سے مضامین کے تنوع اور رسالہ کی دلچسپی مین جو کمی آگئی تھی، ہم کو خود اس کا افسوس تھا، پھر بھی قدردانون کی طرف سے اوس کی مانگ برابر بڑھتی ہی رہی، اور کاغذ کے استعمال کی کمی کے حکم سے ہم اون کی تعمیل بروقت نہ کرسکے، امید ہے کہ یہ مشکل بھی دور ہو جائے گی،

چھ برس سے دنیا مین لڑائی کی جو تباہی چھائی تھی، اس مہینہ جرمنی کی شکست سے یورپ کے ملکون مین اس کا خاتمہ ہو گیا، تاریخ کے لحاظ سے یہ اپنی قسم کا کوئی نیا واقعہ نہین، ہمیشہ ہی سے یہ دستور الٰہی رہا ہے کہ جو اپنی تلوار کے زور سے دوسرون کو گراتے ہین، وہ آخر دوسرون کی تلوار کے زور سے ایک دن خود گرائے جاتے ہین،

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ لڑائی جس مقصد سے لڑی گئی، اس مین دنیا کو کہان تک کامیابی ہوئی، یا ہوگی چھوٹی قومون کی حفاظت، کمزور ملکون کی حمایت، اور جمہوریت کا بول بالا اس جنگ کا ترانہ تھا، اب ہم کو دیکھنا ہے اور تاریخ کو اپنے اوراق مین قلمبند کرنا ہے کہ آج زمانہ کے مہذب فاتح اور متمدن کشور کشا کہان تک میدان جنگ کے وعدون کو صلح کی میزون پر یاد رکھتے ہین، اور فتح و شکست کے نتیجون مین قوت اور ضعف کی پرانی بار بار کی دہرائی ہوئی دلیلون کے علاوہ اس مدعیانہ ترقی و تہذیب کا عہد بھی کچھ تبدیلی پیدا کرتا ہے یا نہین،

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک مین دنیا کی بڑی بڑی جبار و قہار قومون کی تباہی کا نقشہ پیش فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ قوت کا زور، طاقت کا گھمنڈ، دولت کا غرور اور ساز و سامان کی فراوانی نے ہمیشہ قومون کو حدود الٰہی سے قدم باہر نکالنے پر آمادہ کیا ہے، فرعون و نمرود اور عاد و ثمود، تبابعۂ یمن اور شاہان سبا کے واقعات کو قرآن پاک مین بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ واقعات اور انکے یہ نتیجے یہ قوت اور ان کے یہ پھل صرف پچھلی ہی قومون کے حق مین تھے، نہین دنیا کا کوئی دور، تاریخ کا کوئی ورق، اور زمانہ کا کوئی عہد ان واقعات اور ان کے ان

لازمی نتیجون سے کبھی خالی نہین رہا ہو، فاعتبروا یا اولی الابصار،

تاریخ کا یہ کس قدر عبرتناک انجام ہے کہ وہ ہٹلر، وہ مسولینی، وہ ہملر، وہ گوئرنگ، وہ گوئبلز جن کے لفظ لفظ کو دنیا تقدیر مبرم سمجھتی تھی جن کے ہر محال دعویٰ کو صرف ان کے کہدینے ہی سے ممکن یقین کر لیتی تھی جن کے رعب و دبدبہ سے زمین کا ہر قطعہ خوف و دہشت سے لرزہ براندام تھا اور جن کے ایک ایک قدم سے ہر وقت دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی، آخر وہ گھڑی آئی کہ بیکسی اور مایوسی نے ان کی ہر امید کا خاتمہ کر دیا، ان مین سے کسی نے اپنے ہاتھ سے آپ اپنا گلا کاٹ لیا، کسی نے زہر کا پیالہ پی لیا، کوئی اپنے دوستون کی تلوارون سے آپ مارا گیا، اور برلن جو کبھی بابل کا مینار تھا، آج خاک کے تودون کے سوا کچھ نہین،

یہ تو وہ نقشہ ہے جو لڑائی کے میدانون مین نظر آیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ سان فرانسسکو کے دلکش ایوانون اور اہم ملکون کی نشست گاہون مین کیا نظر آتا ہے، گو کہ مستقبل کے چہرے پر بھاری پردہ پڑا ہے، پھر بھی دوربین نگاہون کو شام کے سبزہ زارون، ٹریسٹ کے کنارون، پولینڈ کی وادیون، افریقہ کے ریگستانون، چین اور برما کے بندرگاہون، اور جزائر ہند کے ٹاپوؤن مین ابھی سے آنے والی شکلون کی پرچھائیان نظر آتی ہین،

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اشخاص کی طرح قومین بھی حرص و طمع اور لالچ اور نہ ختم ہونے والی زمین کی بھوک سے آزاد نہ ہون گی، ایک سان فرانسسکو کیا، سو سان فرانسسکو بھی دنیا مین امن اور چین پیدا نہین کر سکتے، جنرل اور سپہ سالار اپنی جیت اور ہار کی بازی ختم کر چکے، اب سیاست کے ماہرون اور ڈپلومیسی کے شاطرون کی بساطین بچھی ہین، اور تلوار کی بخشی ہوئی قوت کو قلم کی نوک سے کام مین لا رہے ہین،

یاد ہوگا کہ جرمن خطرہ کے عہد مین شام اور لبنان کے لوگون کو فرانس کی منظوری سے اتحادیون کی طرف سے خود مختاری کی سند عطا ہوئی تھی، ابھی زخمون سے چور فرانس بستر سے اٹھا بھی نہین، پھر بھی بستر سے اٹھنے کے ارادہ کے ثبوت مین سب سے پہلا قدم شام و لبنان سے ان کی اس مجبورانہ عطا کی ہوئی خود مختاری کی سند کو چھیننے ہی کی طرف بڑھ رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی قومون کی اخلاقی بیماری اتنی پرانی ہو چکی ہے، کہ موت کے سوا ان کا کوئی دوسرا علاج نہین،

جو لوگ یہ سمجھتے ہین کہ اقلیت والی قومین اکثریت کے مقابلہ مین کچھ نہین کر سکتین، وہ دیکھین کہ دنیا کی سب سے چھوٹی، سب سے پراگندہ اور آوارہ قوم یہود آج اپنی دولت کی قوت اور تنظیم کی مضبوطی سے دنیا کے سب سے زیادہ آزادی پسند ملک (امریکہ) کے پریسیڈنٹ، اور انگلستان کی سب سے زیادہ آزادی دوست پارٹی (لیبر پارٹی) کے نمایندہ کی زبانون سے اپنے دلی مقصد کا اظہار کر رہی ہے، اور ان کی مدد سے یہود فلسطین مین اپنے جبروت کا تخت بچھانا چاہتے ہین، اور اس طرح قرآن پاک کی پیشینگوئی اِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ الخ پوری ہو رہی ہے،

آج عیسائی اور یہودی قومون نے مسلمانون کے خلاف جو باہم اتحاد کیا ہے، وہ بھی قرآن پاک ہی کی تصدیق ہے بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ، مسلمانون مین جو لوگ ان کی ہر چیز مین نقالی کرکے قوت و عظمت حاصل کرنا چاہتے ہین، ان کو قرآن پاک کی ایک اور پیشینگوئی یاد دلانا ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (بقرہ - ۱۴)	تم سے یہود اور نصاریٰ اس وقت تک راضی نہین ہو سکتے، جب تک تم اپنا دین چھوڑ کر ان کی ملت اختیار نہ کرو،

مسلمان زبان سے اس تبدیلی کا انکار کرین گے لیکن ان کا ظاہر و باطن کیا ان کے زبان حال کا اعتراف نہین

مقالات

زمانہ حاضر کا انسان

اور

اقبال

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ

عشق ناپید وخرد می گزدش صورت مار | عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا مین سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ مین الجھا ایسا | آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعون کو گرفتار کیا | زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

زمانہ حاضر کا انسان! ایجاد و اختراع، فن و حکمت، سائنس اور ہنر کے لحاظ سے کمال کے انتہائی مدارج پر گامزن ہے، اس کی نکتہ رس اور باریک بین عقل نے ناممکنات کو ممکن بنا دیا، جو چیزین گمان و قیاس و وہم کے ماورا تھین، اب وہ روزمرہ کے حقائق مین شامل ہین، عقل جن کے ادراک و فہم سے عاجز تھی، اب وہ بلا تکلف استعمال مین آرہی ہین، اب ہم اپنے مقام پر بیٹھے سات سمندر پار کے بسنے والون سے گفتگو کرتے ہین، اپنے گھرون مین ٹلی وژن سٹ نصب کرتے ہین، تصویرین بولتی ہین اور ہمین اپنے دلربا نغمون سے مست کرتی ہین لاشعاعین (X-ray) ہمارے لئے ان دریچون کا کام دیتی ہین جن کے پٹ کھول کر ہم اپنے معدے اور انتون کو دیکھ سکتے ہین، ہماری سڑکیں ربر سے بنائی جا رہی ہین، ہماری کھیتی برقی قوت سے کٹتی ہے، ہمارے بالون مین پیچ و خم برقی لہرین پیدا کرتی ہین، طی الارض کی کرامت کا ہم سے ظہور ہوتا ہے، فاصلے ہمارے لئے وجود نہین رکھتے، ہمارے طیارون نے زمین کو گھیر لیا ہے، بہرحال ہم نے مشین ایجاد کی، اور مشین نے ہماری زندگی مین عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، اسی تغیر کی ماہیت اور اس کے دور رس نتائج پر ہمین یہان اقبال کے ساتھ ایک نظر ڈالنی ہے، اور بتلانا ہے کہ زندگی پر مشین کے تسلط کی وجہ سے جو تہذیب پیدا ہوئی ہے، وہ فساد قلب اور فساد نظر مین مبتلا ہے، اس کی روح مین عفت، اس کے ضمیر مین پاکی، اس کے خیال مین روحانی علو و بلندی اور اس کے ذوق مین لطافت و پاکیزگی مفقود ہے،!

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب | کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح مین پاکیزگی تو ہے ناپید | ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال کی نظر مین عہد حاضر کا انسان قلب اور نظر کے امراض فاسدہ مین مبتلا ہے اور یہ امراض یون تو بے شمار ہین لیکن ان مین کے زیادہ مہلک یہ ہین :

لادینی اور تشکیک، جبر یا اپنے اختیار و آزادی کے فقدان کا احساس، لذت پرستی، اور واقعیت یا ع

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است" کا فلسفہ،

آئیے کچھ دیر کے لئے اقبال کے ساتھ ان روحانی امراض پر ایک نظر ڈالیں:

(۱) تشکیک ولادینی: تہذیب حاضر کے زیر اثر جو نسل پیدا ہوئی ہے، وہ عملاً دین و ایمان سے خالی و عاری ہے، اس کی نظر میں مذہب ایک "جنون خام" ہے، اور "ہستی غائب" کے تلاش کرنے والے احمق اور نادان ہیں، علوم جدیدہ کی بنا محسوس پر ہے، موجود ان کی رو سے وہی ہے جو محسوس ہے، حقیقت کا علم ہمیں ادراک، مشاہدہ اور ارتسام کے ذریعہ ہوتا ہے، اور ہمارے تمام تصورات ان ہی ارتسامات کی نقول ہیں، ارتسام تصور کی اصل ہے، تصورات کے پہلے ارتسامات کا ہونا ضروری ہے، لہذا کسی چیز کا جاننا اس کا حواس کے ذریعہ ادراک حاصل کرنا ہے، تو جاننے کے معنی "حصول ارتسامات" کے ہوئے یعنی احساس کرنے کے، ہمارے لئے وہی چیز حقیقی ہوگی، جس کو ہم محسوس کریں گے، مذہب کا معروض "ہستی غائب" ہے، جس کا کوئی ادراک یا احساس ممکن نہیں، لہذا اس کا کوئی علم قابل حصول نہیں، لہذا اس کی تلاش ایک سیاہ بلی کی تلاش ہے، جو ایک تاریک کمرہ میں کی جارہی ہے، جو اس کمرہ میں موجود نہیں، یہ ہے استدلال دور حاضر کے نوجوانوں کا جو اپنا مسلک، مذہب کے خلاف انتہائی تجربیت یا احساسیت (Sensationism) کو قرار دیتے ہیں، اقبال نے ان کے ان خیالات کو اس طرح ادا کیا ہے، اور آخر میں بیدل کے الفاظ میں ان کا فلسفیانہ جواب بھی دیدیا ہے، جس کی توضیح ہم بعد میں چل کر کریں گے،

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ ۔۔۔ نادان ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش!
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ۔۔۔ ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش!
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی ۔۔۔ اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش!
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام ۔۔۔ ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش!
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور ۔۔۔ مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش!

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است،
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنون مباش!

مذہب سے بیزاری کا نتیجہ یہ ہے، کہ عصر حاضر کے نوجوانوں کے لئے نہ زندگی کی کوئی غایت ہے، اور نہ تخلیق کائنات کی کوئی غرض یا مقصد، بلکہ وہ اس سوال ہی کے اٹھانے کو حماقت تصور کرتے ہیں، کہ کیا زندگی کی کوئی غایت ہوسکتی ہے اور عالم کا کوئی مقصد؟ بیس طلبہ کی ایک جماعت (جو عمر کے لحاظ سے بیس پچیس سال کے درمیان تھے) سے پوچھا گیا، کہ مذہب کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے، تو صرف تین نے اس کی جانب اپنا میلان ظاہر کیا، آٹھ نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ کی ایجابی یا سلبی جانب پر کوئی غور ہی نہیں کیا، اور باقی نو کھلے لامذہب تھے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جو تناسب دیندار اور بے دین طلبہ کا ان جوابات سے ظاہر ہوتا ہے، وہ کس طرح غیر معمولی یا استثنائی سمجھا جائے، مسلمانوں کی نئی پود میں لادینی اور الحاد کے اس میلان کو اقبال نے ایک اثر انگیز نظم میں جس کا عنوان "فردوس میں ایک مکالمہ" ہے یوں ظاہر کیا ہے،

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز ۔۔۔ حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز
اے آنکہ ز نور گہر نظم فلک تاب ۔۔۔ دامن بچراغ مہ و اختر زدۂ باز!
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیان کر ۔۔۔ واماندۂ منزل ہے کہ مصروف تگ و تاز؟

مذہب کی حرارت بھی ہو کچھ اس کی رگون مین — تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمی آواز ؟
باتون سے ہوا شیخ کی حالی متاثر — رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز !
جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا — آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدون مین تزلزل — دنیا تو ملی طائر دین کر گیا پرواز
دین ہو تو مقاصد مین بھی پیدا ہو بلندی — فطرت ہے جوانون کی زمین گیر زمین تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی — دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی — ظاہر ہے کہ انجام گلستان کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو — پیدا ہین نئی پود مین الحاد کے انداز
یہ ذکر حضور شہ یثرب مین نہ کرنا — سمجھین نہ کہین ہند کے مسلم مجھے غماز

"خرما نتوان یافت ازان خار کہ کشتیم
دیبا نتوان بافت ازان پشم کہ رشتیم" (سعدی)

طائر دین کے پرواز کر جانے، اور الحاد کے انداز پیدا ہوتے ہی کردار مین تغیر کا رونما ہونا ضروری تھا، اوامر و نواہی کی پابندی اور رضاے الٰہی کا خیال، سزا کا خوف اور جزا کی امید، یہ سب محرکات ہمارے نوجوانون کے ہان ناقابلِ التفات ہین، اور نہ لائق توجہ، جدید نفسیات (تحلیلی نفسیات Psycho-analysis) نے انھین تعلیم دی کہ ذہن انسانی کا بیشتر حصہ غیر شعوری ہے، انسانی شخصیت کی مثال برف کے اس انبار کی سی ہے، جو سمندر مین بہتا رہتا ہے، اس کا تھوڑا ہی سا حصہ سطح شعور کے اوپر نظر آتا ہے، باقی سب نیچے پوشیدہ ہوتا ہے، یہ حصہ جس کو غیر شعوری نفس کہا جاتا ہے، نہ صرف نسبتہً بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے، بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی نفس شعوری سے کہین زیادہ عظیم الشان ہے، شعور مین جو کچھ نمایان ہوتا ہے، وہ اس غیر شعوری نفس ہی مین پیدا ہوا ہے، اور اس راہ سے آیا ہے، یا یون کہو کہ اس کا تعین غیر شعوری نفس ہی سے ہوتا ہے، لہذا انسان کے ذہن کا شعوری حصہ کوئی زیادہ اہمیت کی چیز نہین، اس لئے کہ اس کا سارا مواد اور اس کے سارے اعمال و وظائف ان قوتون کے اظہار ہین، جو ہمارے باطن مین مستور اور پوشیدہ ہین، جن کا نہ ہمین عام طور پر علم ہوتا ہے، اور نہ یہ ہمارے تصرف و اختیار مین ہوتے ہین،

ان ذہنی حالات سے واقف ہونے کے بعد یہ بات فوراً سمجھ مین آجاتی ہے، کہ ہماری ساری خواہشات اور آرزوؤن کا مبدأ غیر شعوری نفس ہے، اب غیر شعوری نفس مین کیا ہو رہا ہے، ہم نہین جانتے، جب نہین جانتے، تو ظاہر ہے کہ ان پر ہمارا تصرف یا اختیار بھی نہین ہو سکتا، لہذا جب کسی غیر شعوری خواہش کا ظہور شعور مین ہوتا ہے، تو وہ ہمارے اختیار مین نہین ہوتی، ہمارا اس پر کوئی اقتدار نہین ہوتا، ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہین، ہماری سیرت نتیجہ ہے ان تاثرات، تحریکات، ترغیبات اور قوتون کے باہمی عمل یا تعامل کا جو غیر شعوری دائرہ مین جاری ہین، اور جن کا ہمین کوئی علم نہین، اگر ہم سے اب یہ کہا جائے کہ ہمین ضبط نفس سے کام لینا چاہئے، بری خواہشات پر قابو رکھنا چاہئے، ان کی نفی کرنی چاہئے تو یہ ہمارے بس کی بات نہین !

اگر ہم ان کے ضبط پر قادر بھی ہون تو جدید نفسیات کی تعلیم ہے، کہ ان کی نفی یا ان کا دبا دینا ہماری ذہنی

صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے، آسکر وائیلڈ نے کہا تھا کہ کسی خواہش نفسی سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی تکمیل کر لی جائے، جدید نفسیات اس قول کی تصدیق کر رہی ہے، ہماری توانائی و قوت کے مبدأ اصلی کو جو ڈی بی ڈو (Libido) کہلاتا ہے، فرائیڈ اس چشمہ آب سے تشبیہ دیتا ہے، جو زمین کے نیچے بہ رہا ہے، اور کسی مخرج کی تلاش میں ہے، اگر تم اس چشمہ کو پشتہ لگا کر روک دو، اور اس کے پانی کو بہ کر نکل جانے نہ دو، تو پھر یہ بند ہو کر کیچڑ پیدا کرتا ہے، جو فوراً ہمارے شعور کو آلودہ کرتا ہے اور ہماری ذات کو مضر اخلاط اور متعفن بخارات سے مسموم کر دیتا ہے، یہ کیچڑ گویا مولفات (Complexes) سے تعبیر کر اور بخارات عہد حاضر کی زندگی کے وہ بے شمار عصبی امراض (Neurosis) اور سقیم خوف (Phobias) ہیں جن کا نفسی تحلیلی علاج کرنا چاہتی ہے، اور علاج کا طریقہ بھی یہی ہے، کہ ان رکی دبی خواہشات کو ظاہر ہونے دیا جائے اور مریض کو ان کی موجودگی کا علم ہو جائے، جس کے تحت شعور دائرہ میں یہ مقفل پڑی تھیں، اور سڑ کر روگ پیدا کر رہی تھیں،!

دین و مذہب کی روح تو یہ ہے کہ اوامر الٰہی کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کی کوشش کی جائے، اور جدید نفسیات کی تعلیم یہ کہ خواہشات کو بے لگام رکھنا ہی صحت ذات کے لئے ضروری ہے، جہاں نفس کو اشتعال ہوا یا ہوس رانی سے زبردستی روکا گیا، کہ انسان کی شخصیت سیکڑوں عصبی امراض اور سقیم خوف و ترس میں مبتلا ہو جاتی ہے، اظہار ذات (Self-expression) نہ کہ انکار ذات (Self-denial) جدید نفسیات کا مشورہ ہے یعنی نفس کو خواہشات یا باصطلاح مذہب ہوی سے روکا نہ جائے، ان کی تکمیل کی جائے، اور اسی ہوس رانی کا نام اظہار ذات ہے!

ڈی، ایچ، لارنس (D. H. Lawrence) وغیرہ کے ناولوں نے ان خیالات و اصول کو اتنا عام اور قابل فہم بنا دیا ہے کہ تحلیلی نفسیات کے دقیق اصطلاحات اور مشکل مباحث عوام کی راہ میں کوئی روک نہیں رہے،!

ان تعلیمات و خیالات نے مذہب و اخلاق کی بیخ کنی کر دی، نوجوانوں کے قلوب مسخ ہو گئے، ان کے دماغ روشن لیکن "دل تیرہ" "نگہ بے باک" ہو گئی، ان کی عقل اور ان کا دل "طواف آب و گل" میں گرفتار ہو گیا، ان کے تن تو فربہ لیکن جانیں لاغر ہو گئیں، جاوید نامہ میں ان ہی کی حالت کو ان دردناک الفاظ میں پیش کیا گیا ہے،

گر خدا سازد ترا صاحب نظر	روزگارے را کہ می آید نگر
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز	چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل	زوج زوج اندر طواف آب و گل

کچھ آگے چل کر زیادہ وضاحت کی گئی ہے،

نوجوانان تشنہ لب خالی ایاغ	شستہ رو تاریک جان روشن دماغ!
کم نگاہ و بے یقین و نا امید	چشم شان اندر جہان چیزے ندید!
ناکسان منکر ز خود مومن بغیر	خشت بند از خاک شان معمار دیر!

یعنی دین و مذہب کو ہاتھ سے کھو کر عقل و استدلال کو اختیار کر کے نوجوانوں نے کیا پایا؟ مادی عقل نے ان کے قلوب میں کیا انقلاب پیدا کر دیا؟ ان کے نقطہ نظر کو کس طرح بدل دیا؟ اور نقطہ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چارسو ان کے لئے کیسے بدل گئے؟ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا،

جان لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب	دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک!

قلب سے عشق و ایمان رخصت ہوا، اور تاریکی چھائی، دل تیرہ اور نگہ بے باک ہوگئی، روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی، اس کے عوض تن مین فربہی پیدا ہونے لگی، زاغ کی عمر بھی تو غلیظ کھا کر دراز ہوتی ہے اور وہ ہوتا بھی سرگین خوری کے لئے ہے،

عمر زاغ از بہر سرگین خوردن است، (رومی)

شاید اسی سرگین خوری نے انھین شستہ رو روشن دماغ کر دیا، لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی، اور عفت ان سے رخصت ہوگئی!!

اے مسلمانان فغان از فتنہ ہاے علم و فن اہرمن اندر جہان ارزان و یزدان دیریاب

(۲) جبریت :۔ علوم جدیدہ (خصوصاً نفسیات تحلیلی) نے ہمارے نوجوانون کو تعلیم دی کہ ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہین، کیونکہ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا تمام شعوری واردات و واقعات کا مبدا، غیر شعوری نفس ہے، ہماری شعوری خواہشات اور افکار عکس ہین ہمارے غیر شعوری عناصر کا جن مین کم وبیش حذف و اضافہ کر لیا جاتا ہے، ہم نہین جانتے، ہماری غیر شعوری نفس کے دائرہ مین کیا ہو رہا ہے، اور جب نہین جانتے تو ظاہر ہے کہ ان پر ہمارا کوئی تصرف بھی نہین ہوسکتا، اور جب ان پر ہمارا تصرف نہین تو ان کے ہم ذمہ دار بھی نہین، لہذا ان غیر شعوری خواہشات مین سے کسی کا ظہور شعور مین ہوتا ہے، تو وہ ہمارے اختیار مین نہین ہوتی، اور ہم اس کے ذمہ دار نہین قرار دئے جاسکتے، بالفاظ دیگر ہم اپنے شعوری افکار و خواہشات کے ذمہ دار نہین، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ ہم سوچتے ہین، اور کرتے ہین، ان کے ہم ذمہ دار نہین قرار دیے جاسکتے، مختصر یہ کہ اگر شعور کو غیر شعوری اعمال کا نتیجہ قرار دیا جائے، تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعین ان ہی اعمال سے ہوگا، جو اس کو پیدا کرتے ہین، شعوری واقعات و حالات اس پوشیدہ و مستور نفسیاتی مشینری کے عمل کا محض دھوان اور شعلہ ہین جس کا نہین شعور نہین، علم نہین،

پرستاران مذہب و اخلاق کا یہ کہنا صحیح نہین، کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے، اور وہ ہمارے افکار و خواہشات پر حکمرانی کرتا ہے، انھین اپنے اقتدار مین رکھتا ہے، جو خواہشات کہ ہماری روح کے مفاد کے خلاف ہوتی ہین، انھین وہ ترک کر دیتا ہے، اور جو اس کی فلاح کے معاون ہوتی ہین، انہین کو اختیار کرتا ہے! صحیح یہ ہے کہ صرف جبلتین ہی انسانی اعمال کی حقیقی محرکات ہین، انہی جبلتون کی تشفی کے لئے ہم عمل کرتے ہین، جب تک کسی جبلت کی تشفی مقصود نہ ہو، نہ ہم سے عمل سرزد ہوسکتا ہے، اور نہ ہم غور و فکر ہی کرسکتے ہین، جبلی میلانات اور ان کی زبردست مشینری نہ ہو تو ہماری عضویت کسی عمل کے قابل ہی نہ رہے، وہ اس گھڑی کی طرح بیکار ہو جائے جس کی کمانی ٹوٹ گئی ہو،

اگر ارادہ کوئی جدا اور مستقل شے بھی مان لیا جائے تو بھی وہ اس وقت تک بے عمل اور بے کار ہوگا، جب تک کہ کوئی جبلت اس سے کام نہ لے، لہذا جب تک کہ ہم ارادہ کو کسی ناجائز خواہش کے دبانے کے لئے استعمال کرنے کی خواہش نہ کرین اس وقت تک ہم اس ناجائز خواہش کو نسیاً منسیاً نہین کرسکتے، اب ارادہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کی خواہش دوسری خواہشات کی طرح اساسی طور پر جبلی ہوتی ہے جس کے وقوع اور جس کی قوت کے ہم کسی طرح ذمہ دار نہین قرار دیے جاسکتے ہم اپنے اقتضا اپنی فطرت اور جبلت سے مجبور ہین، اپنے اقتضا، اپنی فطرت یا اپنی جبلت پر ہمین کوئی اقتدار نہین، ع

اے شیخ پاک و امن معذور دار مارا!

مسلمانون کی نئی پود مین جبریت کا اثر عقیدہ "تقدیر" کی غلط فہمی کی وجہ سے زہر کی طرح سرایت کر گیا ہے، اور

ان کے عمل کی قوت کو مفلوج کر دیا ہے، نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت رہی، اور نہ سالک میں مستی کردار، شاعر کی نوا، مردہ افسردہ و بے ذوق ہو کر رہ گئی، مرد مجاہد مفقود ہو گیا!

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

تقدیر کے عقیدے نے مسلمان کو عمل سے غافل کر دیا، "شراب الست" بے عملی کا خوب بہانہ بنی، قسمت ہی کا لکھا ایسا تھا کہ مسلمان کشمکش زندگی سے بھاگ کھڑا ہوا، اور جمود و خمود نے اس کے قوائے عمل پر اپنا تسلط قائم کر لیا!

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

جس قرآن کی تعلیم نے مسلمانوں کو مرد میدان کا امیر بنا چھوڑا تھا، اب اسی قرآن سے ترک جہان کی تعلیم اخذ کی جا رہی ہے! غلاموں کو تفسیر بھی خوب آتی ہے، جس دین میں مصلحت، جنگ و شکوہ تھی، اب اس کی مصلحت غار و کوہ بھی جا رہی ہے، جبر ہی کے عقیدے اور تعلیم نے مسلمان کو عمل سے محروم کر دیا، مجاہدہ سے وہ غافل ہو گیا، اور اس کا لازمی نتیجہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوا، خودی مردہ ہو گئی "قفس حلال اور آشیانہ حرام ہو گیا"!

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہان کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غرض اقبال کی نظر میں مسلمان خود اپنے کو اور اپنے خدا کو فریب دے رہا ہے، جب وہ تقدیر کا بہانہ کر کے عمل سے بے پروا ہو رہا ہے،

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی — عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

(۳) لذت اندوزی: اگر ہم عمل و مجاہدہ سے اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتے، اگر ہم اپنے مستقبل کو سنوارنے میں اتنے ہی مجبور ہیں، جتنے کہ اپنے ماضی کے بدلنے میں تو پھر ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے جیسی بھی کہ وہ ہے، پوری طرح بہرہ اندوز ہونا چاہئے، اور جو کچھ مل جائے (بغیر اس کے بدلنے کی کوشش کے) لطف اندوز ہونا چاہئے،

ایام جوانی و شباب اولیٰ تر — با خوش پسران جام شراب اولیٰ تر
این عالم فانی چو خراب است بیاب — در جائے خراب ہم خراب اولیٰ تر (خیام)

زمانہ حاضر کے انسان نے یہ دیکھ کر کہ مستقبل نہ صرف نامعلوم ہے، بلکہ ہمارے حیطۂ قدرت سے بھی باہر ہے، عقلمندی اور ہوشیاری اس میں دیکھی کہ حال سے پوری طرح تمتع حاصل کیا جائے، اپنی عمر کے موجودہ وقت کو خوش دلی سے بسر کیا جائے اس لئے شراب ناب اور بوس و کنار (Wine & Kisses) کو اس نے حیات آتیہ کی موعود لذتوں سے زیادہ غنیمت تصور کیا! عصر حاضر نے اس کو یہ تعلیم دی کہ مذہب کا یہ فرمان کہ انسان کو ہوائے نفسانی کی مخالفت کرنی چاہئے

اور خواہشات طبعی کو شرع کے تحت میں رکھنا چاہئے نہ صرف نا قابل عمل ہے، بلکہ شخصیت انسانی کے لئے قطعاً مضر بھی فرائڈ نے ذرا تفصیل سے بتلایا کہ موجودہ زمانہ کی بے شمار ذہنی بیماریاں عصبی امراض، ہسٹریا، اور زندگی سے بیزاری اور عدم طمانیت نتیجہ ہیں جوانی مین فطری خواہشات کو دبانے اور روکنے کا، صحت و طمانیت کے لئے انکار ذات نہیں اظہار ذات کی ضرورت ہے، انکار ذات ان لوگون کا فلسفہ ہے جو خود لذت اندوزی کے قابل تو رہے نہیں، دوسرون کو بھی اس سے محروم کرنا چاہتے ہین، اپنے مصائب پر غم و حزن، واویلا اور سینہ کوبی خود رحمی (Self Torture) آیندہ زندگی کے موہوم و تخیل حادثات سے خوف اور ہول نقد وقت کو ہاتھ سے کھونا اور شخصیت کی عمارت کو جڑ سے اکھاڑنا ہے،

لہذا عصر حاضر کی روح کا نوجوانون سے خطاب یہ ہے :-

تا کے زغم زمانہ محزون باشی باچشم پر آب و دل پر خون باشی
می نوش بعیش کوش و خوش دل باش زان پیش کزین دائرہ بیرون باشی (خیام)

اسی لئے عصر حاضر کا نوجوان اس عقیدہ کا پورا قائل نظر آتا ہے، کہ اوقات فرصت کو لذت اندوزی مین صرف کرنا چاہئے، وہ ان افعال و اعمال کو لذت بخش تصور کرتا ہے، جو روح کی باطنی خواہشون اور تمناؤن کی تکمیل کرتے ہین، اور یہ جنس خواہشات کے سوا کچھ نہین، رقص و سرود سے ان کی تکمیل ہوتی ہے، یہ اظہار ذات کے عمدہ ذرائع ہین، زندگی کی آخری غرض و غایت کا تو ہمین واضح علم نہین لیکن اتنا تو صاف ہے کہ ع

حالے خوش باش و عمر برباد مکن!

اس طرح لذت اندوزی و اظہار ذات زندگی کی غایت قرار دی جاتی ہے، اور اصرار کیا جاتا ہے کہ ہمین اپنے نفس کو خوش رکھنا چاہئے اور یہ خوشی اور راحت خود نفس کی خاطر ہے، زندگی کے فرائض کو انجام دینے کی خاطر نہین، مختصر یہ کہ عصر حاضر کا نوجوان اقبال کے الفاظ مین بدن ہی مین غرق ہے، اور جان سے بے خبر!

ترسم این عصرے کہ تو زادی دران در بدن غرق است و کم داند ز جان

اور بدن ہی کی راحت و لذت کو غایت تصور کیا جاتا ہے!

نژاد نو کا روشن دماغ مسلمان زادہ اقبال کی نظر مین سراپا تجلی افرنگ ہے، وہان کی عمارت گرون کی محض ایک تعمیر ہے، از خود بیگانہ اور مست فرنگ ہے، لہذا اس نے بھی اپنی زندگی کا مقصود، طواف آب و گل کو قرار دے رکھا ہے اور ان ہی کے شعار کو اپنا شعار بنا لیا ہے، ان ہی کے علوم کو سیکھا، اور ان کو اپنے قلب مین ذخیرہ کر رکھا ہے، ان کے اثرات اس کے چہرہ پر صاف ظاہر ہین، اب وہ پہچان تک نہین پڑتا، کہ وہ وہی خود ہے، یا کوئی اور! اس کی عقل ان ہی کے افکار کی قید مین گرفتار ہے، اور اس کے گلے کا سانس تک غیر کا ہے، اس کا نہین! اس کے دل کی آرزوئین بھی اس کی نہین غیرون کی ہین، اور اس کی گفتگو جو اس کی زبان سے جاری ہے، وہ بھی اجنبیون کی ہے اس کی کہان! اس کا ساغر اپنا نہین اس مین شراب بھی شراب فرنگ ہے، ان اشعار مین اس غیرت سوز حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے :-

علم غیر آموختی اندوختی روے خویش از غازہ اش افروختی!
ارجمندی از شعارش می بری می ندانم تو توئی یا دیگری!
عقل تو زنجیری افکار غیر در گلوے تو نفس از تار غیر

برنہانت گفتگو ہا مستعار | در دل تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ | سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگران | جام ہم گیری بوام از دیگران

اقبال عصرِ حاضر کے اثرات میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو اس طرح ملوث دیکھ کر خون کے آنسو بہاتا ہے، اور درد اضطراب کی حالت میں ان کے مہلک امراض یعنی ان کے ظلمت آباد بے چراغ ضمیر کو، ان کی غلامی اور حریت دشمنی کو، ان کی لادینی اور الحاد کو، ان کی فرنگ مستی، اور اپنی عینیت و حقیقت سے بیگانگی کو، ان کی بزدلی اور موت سے خوف زدہ ہونے کو، ان کی لذت پرستی اور عیش کوشی کو، یورپ کے باطل علوم کو اپنے سینوں میں جگہ دے کر ان کے بتوں کے آگے سجدہ ریز ہونے کو، اس طرح اپنے دل و دماغ کو سومنات بنا لینے کو اپنے آقا سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کس درد کے ساتھ پیش کرتا اور دعا کا طالب ہوتا ہے،

این مسلمان زادۂ روشن دماغ | ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
این غلام ابن غلام ابن غلام | حریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دین در ربود | از وجودش این قدر دانم کہ بود
این ز خود بیگانہ این مست فرنگ | نان جو می خواہد از دست فرنگ
مومن و از رمز مرگ آگاہ نیست | در دلش لا غالب الا اللہ نیست
از فرنگی می خرد لات و منات | مومن و اندیشۂ او سومنات

قم باذنی گوے او را زندہ کن،
در دلش اللہ ہو را زندہ کن!

نژادِ نو کو خطاب کر کے جاوید نامہ میں اقبال نے جو نصیحت کی ہے، اس کا حاصل بس اتنا ہے، کہ دانش برہانی میں حیرت کی فراوانی ہے، سادہ دلوں کے یقین کو فلسفیوں کے نکتہ ہائے دقیق، پر ترجیح دے کر بے دلیل و برہان از روے جان یعنی قلب کی گہرائیوں سے اپنے خالق کی الوہیت اور محمدؐ عربی کی رسالت کا اقرار کرلے،

لا الہ گوئی بگو از روے جان | تا ز اندام تو آید بوے جان

الوہیت حق کے اقرار کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ ہی کو اپنا معبود و رب جانے یعنی سرِ نیاز ان ہی کے آگے خم کرے، اور دستِ سوال ان ہی کے آگے پھیلائے، ساری کائنات میں حق کے سوا نہ کسی کو نافع سمجھے، اور نہ نقصان پہنچانے والا، اپنی بندگی اور عبودیت کا رشتہ حق سے جوڑ کر سارے عالم سے غنی ہو جائے، اور بے نیاز! یہی معنی ہیں اس شعر کے،

ماسوی اللہ را مسلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست!

اپنی حاجتوں کا رخ حق کی طرف پھیر دینے سے، اپنی احتیاج و ذلت کا رشتہ قادرِ مطلق سے جوڑ لینے سے انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے خوف و بے جگر مجاہد، آزاد و بے باک مرد، مردِ حر، جس کا سر کسی فرعون کے آگے جھکتا ہے، اور نہ سلطان و امیر سے وہ مرعوب ہوتا ہے، جس کی قوت بازو اور شوکت و جلال کا اندازہ آسان نہیں جس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں جس کی ہیبت سے کائنات لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے!

اسی لئے اقبال لاالہ یعنی توحید الوہیت کو یعنی اس ایمان و اقرار کو کہ اللہ ہی ہمارے الہٰ ہیں، معبود و رب ہیں، محض گفتار نہیں قرار دیتا، بلکہ ایک بے پناہ تیغ قرار دیتا ہے، جس کی ضرب کاری ہوتی ہے، جو سارے عالم سے معبودیت کی نسبت کاٹ کر رکھ دیتی ہے، اور اس کے قائل کو سارے عالم سے غنی اور بے نیاز کر دیتی ہے!

این دو حرف لاالہ گفتار نیست　　لاالہ جز تیغ بے زنہار نیست

زیستن با سوز او قہاری است　　لاالہ ضرب است و ضرب کاری است

لاالہ کا کامل ذوق و فہم حاصل کرنے کے لئے کسی مرد حق کی صحبت ضروری ہے. قلب میں اس کا اذعان و یقین کسی کی نگہ کی مستی پیدا کرتی ہے،

اے پسر ذوق نگہ از من بگیر　　سوختن در لاالہ از من بگیر!

یہی معنی ہیں شیخ جیلی کے اس قول کے :-

خذ العلم با فواہ رجال اللہ و لا من　　مردان حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں

الصحائف والدفاتر،　　اور دفتروں سے نہیں،

اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، قلوب کے زنگ کو دھوتی ہے، ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لیجاتی ہے، اقبال کے مرشد معنوی عارف روم نے مرد حق کی صحبت کے اثرات کو یوں بیان کیا تھا،

خواہی کہ درین زمانہ فردے گردی　　یا در رہ دین صاحب دردے گردی

این را بجز از صحبت مردان مطلب　　مردے گردی چو گرد مردے گردی

اسی لئے قرآن میں کونوا مع الصادقین کا حکم دیا گیا!

یہ یقین، انقلاب انگیز یقین و مستی، سوز و ساز کا یہ رنگ، یہ ذوق و سرور، یہ علم حق عصر حاضر کے مکتبوں اور مدرسوں یا یونیورسٹیوں سے حاصل نہیں ہو سکتا، مکتب اپنے مقصود سے بے خبر ہو گئے ہیں، یہاں وہ علم حاصل ہوتا ہے، جو تخمین و ظن ہے، سراپا حجاب ہے، جو قلب و نظر کا فساد پیدا کرتا ہے، فکر خام بخشتا ہے، جو انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ ہے، اس کا عالم کتاب خوان تو ضرور ہوتا ہے لیکن صاحب کتاب نہیں،

مردان حق کی نگہ کے فیض سے قلب میں یقین و اذعان پیدا ہوتا ہے، شدت یقین و اذعان جو ایمان کا دوسرا نام ہے، ایمان کا لازمی نتیجہ شدت حب یا عشق ہے، الذین آمنوا اشد حبا للہ اس پر صریح دلیل ہے، اور اقبال شدت حب یا عشق کے معنی توحید پر ایمان یا شدت یقین ہی کے لیتے ہیں،

عاشقی توحید را بر دل زدن　　وانگہے خود را بہ ہر مشکل زدن!

یعنی لاالہ کا یقین جب قلب کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے، تو عشق پیدا ہوتا ہے عشق گویا سراپا یقین ہے، سکون و ثبات ہے، ام الکتاب ہے، حقائق حیات کی معرفت کا آلہ عشق ہے، علم نہیں، فتح باب عشق سے ہوتا ہے، علم سے نہیں، ع

علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

قلب میں عشق کا شعلہ پیدا ہوتے ہی خودی بیدار ہوتی ہے، خودی نتیجہ ہے لاالہ کے اذعان و ایقان کا، توحید کا ایمان کا، شدت حب یا عشق کا، حق تعالیٰ کی ربوبیت پر، ان کی معبودیت پر، ان کی مالکیت و حاکمیت پر یقین میں غیر اللہ

کی غلامی سے نجات دلاتا ہے، سارے عالم سے غنی بناتا ہے،

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسی یقین و ایمان سے ہم میں خودی یا "احساس نفس" پیدا ہوتا ہے، ذات کی تعیین ہوتی ہے، ہمارا ضعف قوت سے، ذلت عزت سے، فقر غنا سے بدل جاتا ہے، موجوداتِ عالم میں سے ہم نہ کسی سے ڈرتے ہیں، اور نہ کسی کو نافع وضار سمجھتے ہیں،

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم مومن ہو تو اُن سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو،

کا حکم ہمیں سارے عالم سے بے خوف کر دیتا ہے، ہمیں حق کے سوا نہ کسی سے امید و رجا ہوتی ہے، اور نہ کسی سے خوف دیتی ہیں،

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ کیا اللہ بندہ کے لئے کافی نہیں،

کہکر ساری کائنات سے مستغنی ہو جاتے ہیں، اور صحیح معنی میں مخاطب ہو جاتے ہیں، اس قول کے

أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ تم ہی بلند ہو اللہ تمھارے ساتھ ہے،

اسی خودی کی موت سے عرب و عجم پر جمود طاری ہے ع

خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب و تاب بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور کہ بیچ کھائے مسلمان کا جامۂ احرام

ایمان کا نتیجہ عشق اور عشق کا نتیجہ خودی کی بیداری یعنی قوائے عمل کا جاگ اٹھنا! عشق سے عمل کی قوتیں کس طرح جاگ اٹھتی ہیں، صاف سمجھ میں آتا ہے، عشق کا ایک خاصہ تفرد ہے یعنی عاشق کے لئے معشوق کے سوا سارے علائق منقطع ہو جاتے ہیں، وہ دونوں جہان سے فارغ ہو کر صرف معشوق ہی کا ہو جاتا ہے، معشوق کا ہر حکم عاشق کے لئے قضائے مبرم ہو جاتا ہے، اس کے ہر امر کے امتثال اور بجا آوری میں اس کو راحتِ جان میسر ہوتی ہے، اب اس کو نہ تیغ و خنجر کا خوف رہتا ہے، اور بحر و بر کا، وہ "شمشیر کی مانند برندہ و براق" ہو جاتا ہے اسی شعلہ کی تنویر نے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو اپنا سارا تن من دھن اسلام کی راہ پر قربان کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، ان ہی کے کارناموں کی طرف اشارہ ہے اقبال کے ان اشعار میں:

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دین
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگین
عشق مکان و مکین، عشق زمان و زمین
عشق سراپا یقین اور یقین فتح باب!

عشق کا شعلہ قلب میں سلگ کر اس کی ظلمتوں کو نور سے بدل دیتا ہے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور روح کا تجلیہ، رذائل اخلاق محاسن سے بدل جاتے ہیں، موت جیسی مبغوض شے اب محبوب ہو جاتی ہے، مومن مشتاق کو اپنے محبوب حقیقی کے بقا کی تڑپ ہوتی ہے، موت ہی کے پل پر سے گذر کر اس کو حق تعالیٰ کی رویت نصیب ہوتی ہے اس لئے موت اس کے لئے ایک تحفہ ہے، جس کا وہ اشتیاق کے ساتھ منتظر ہوتا ہے، یہی معنی ہیں حضورؐ انور کی اس دعا کے

اللّٰھُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَعْلَمُ اَنَّ الٰہی موت کو اس شخص کے لئے محبوب کر دیجئے جو

محمدٌ رّسولُ اللہ ، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا رسول جانتا ہے ،

کیونکہ اس کے لئے موت راہِ شوق کی آخری منزل ہے یہ اس کو کوے دوست مین پہنچا دیتی ہے ، دوست کو دوست سے ملا دیتی ہے ؛

بگزر از مرگے کہ سازد با لحد — زانکہ این مرگ است مرگِ ام و دد
مرد مومن خواہد از یزدانِ پاک — آن دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آن دگر مرگ انتہاے راہِ شوق — آخرین تکبیر در جنگاہ شوق ،
جنگ مومن چیست ہجرت سوے دوست — ترکِ عالم اختیارِ کوے دوست (رومی)

جس شخص کی نظر مین موت محبوب ہو جائے اس کے قلب پر مال وجاہ کی محبت کیسے غالب ہو سکتی ہے ، حرص و بخل کی اس مین گنجایش کہان کبر وریا و کینہ کیسے پیدا ہو سکتے ہین وہ بھی لاالہ پر ایمان وا ذعان اس امر کا یقین ہے کہ زمین وآسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کے مالک اور حاکم حق تعالیٰ ہین ، لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جب حقیقی مالک حق تعالیٰ ہین تو ہم محض امین ہوے مال و دولت چند سال کے لئے جو ہماری عمر کی مدت ہے امانت ہے ، امانت ملک نہین ، جب ملک نہین تو اس سے محبت کیسی ؟ سچا اور ایماندار امین ہر وقت استرداد امانت کے لئے تیار رہتا ہے ، اور اس کو اپنے دل مین جگہ نہین دیتا ، اس کا دل تو دلداری کے لئے وقف ہے کیونکہ وہ جانتا ہے ع

یک دل داری بس است یک دوست ترا (جامی)

جب مال کی محبت کی جگہ اس کے قلب مین نہین تو طمع یا حرص کے پیدا ہونے کا کیا سوال ، اس فقرِ حاضر[۱] سے اس کا قلب فارغ ہوتا ہے ، خوفِ مرگ ، حُبِّ مال وجاہ ، حرص وطمع سے نجات غم وحزن سے نجات ہے ، جس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف الہرم[۳] یا نیمہ پیری سے تعبیر کیا ہے ، اب ذوقِ توحید کا سرشار عاشق اللہ است حق تعالیٰ ہی کے لئے زندہ رہتا ہے مال و گنج کے لئے نہین حق تعالیٰ کے اوامر و احکام کے امتثال کے لئے زندہ رہتا ہے ، جاہ وحشمت کے لئے نہین ، اس کا مرنا بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے خوف و رنج سے نہین ، ہم وغم سے نہین ،

بہر یزدان می زید نے بہر گنج — بہر یزدان می مرد نز خوف و رنج
انگہان خندد کہ او بیند رضا — ہمچو حلواے شکر او را قضا (رومی)

لاالہ کو بے دلیل و برہان از روے جان ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلب مین حق تعالیٰ کی محبت وعشق کی آگ سلگ گئی خودی بیدار ہوئی ، عمل کی دنیا آسان ہو گئی ، علم مین وسعت پیدا ہو گئی ، قلب مین محبت وسرور کا نشہ اٹھا ، نفس کا تزکیہ[۲] دل کا تصفیہ روح کا تجلیہ ہو گیا ، رذائل اخلاق صفاتِ حسنہ مین مبدل ہو گئے ، لاتناہی ترقی کی راہ کھل گئی ، زندگی لذتِ پرواز کا نام ہو گیا !

یہ ہین وہ اقدار اور اقدار کے حصول کی راہ جو اقبال عصر حاضر کے نوجوانون کے آگے پیش کرتا ہے ، خدا ہمین فہم سلیم عطا کرے ، اور ان اقدار کے تحقق کی توفیق دے ، اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی ،

---

[۱] حدیث : ایاکم والطمع فانہ الفقر الحاضر (جاوید نامہ ص ۲۴۵)

[۲] تمام صفاتِ قبیحہ سے قلب کا تزکیہ لاالہ الا اللہ کے ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے یہ معلوم کرنا ہو تو دیکھو میرا رسالہ "قرآن اور سیرت سازی" مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

[۳] نوجوانا ! نیمہ پیری است غم — ضعفِ ایمان است و دلگیری است غم
(تلمیح بحدیث مشہور : الھم نصف الھرم (جاوید نامہ صفحہ ۲۴۵)

کی جنت ہے"

اے آر ہوپ مونرف (A. R. Hope moncriff) نے آج کی دنیا (The world of Today) مین ان جزائر کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے:-

دنیا کے کسی گوشہ مین فطرت کی گلکاریان اس قدر مسحور کن نہین جس قدر ملایا کا مجمع الجزائر ہے، فطرت سے اور بے نظیر حسن اور عجائبات کے متلاشی کے لئے وہ اپنے اندر دلچسپیون کا بڑا سامان رکھتا ہے، سیاح اور شعراء کے رنگین ترین الفاظ بھی اس کے دلکش استوائی سمندر اور کنول سے لدے ہوئے ساحلون کا ایسا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہین، اس کے دلفریب مناظر دیکھنے کے لئے Tenyson جیسی شخصیت بھی اس استوائی خطے مین سیر کرنے کی آرزومند تھی، استوائی جزیرون مین جاوا سب سے دولت مند اور مشرق کا باغ ہے"

ہندستان کے پرانے صحیفون - Brhut Katha کے اور "Katha Kosa" Jatak کے اوراق مین سونے کا ملک یا سونے کا جزیرہ کے نام سے اب بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے،

آبادی | ماہرین علم الاقوام کی رائے اندونیسی باشندون کی نسل کے بارہ مین مختلف ہے، کوئی انھین نوسیلی (Polinesian) نسل سے بتاتا ہے، کسی نے کالاپرنگ نسل سے کہا ہے، بعض نے منگول اور استرالینو بتایا ہے، ایسے لوگ بھی ہین جنھون نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ ان باشندون کا اصلی مسکن اندوچائنا تھا، آریون کی مزاحمت سے وہ لوگ جزائر مین منتشر ہو گئے، یہ سب رائین اپنی جگہ پر صحیح ہو سکتی ہین، لیکن اس کا بھی امکان ہے، کہ کچھ لوگ ادھر ادھر سے آکر یہان آباد ہو گئے ہون اور بعد مین کسی سیاسی دباؤ نے ان سب کو ایک رشتہ مین منسلک کر دیا ہو، اور وہ آپس مین گھل مل کر ایک نسل بن گئے ہون، بہرحال یہان کی قدیم آبادی جس قوم سے بھی تعلق رکھتی ہو، قدیم تاریخون کی چھان بین اور علمائے یورپ کے متفقہ بیان سے اتنی بات تو پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے، کہ اندونیسا کی آبادی ایک ہی نسل سے ہے، محققون نے یہان کے باشندون کی تقسیم تین گروہ مین کی ہے،

(۱) اصلی ملایو (Proto malay) ان کا مرکز جزیرہ سماٹرا ہے، یہ شروع سے لے کر اب تک مختلف حیثیتون سے ترقی کے منازل طے کر رہے ہین، اور وہ تقریباً سارے جزائر مین پھیل گئے ہین، ان کی آنکھ، بال، اور چہرے کی ساخت منگول کے مشابہ ہے، قد میانہ اور رنگ گندمی مائل بہ سفیدی، جسم کم و بیش گٹھیلا ہوتا ہے، جزائر کی تقسیم اور مقامات کے اختلاف سے وہ قدرتی طور پر مختلف گروہون مین بٹ گئے ہین، ان مین آچینہ، گایو، لیونگ (سماٹرا کے) سونڈا اور مدورا (جاوا کے) بنجر (بورنیو کے) اور بوگیس (سلیبس کے) مشہور ہین،

(۲) غیر مہذب گروہ (Primitive) یہ جزائر کے گلزار جنگلون اور دور دراز پہاڑون مین آباد ہین، یہ لوگ رفتہ رفتہ نئی روشنی مین قدم رکھ رہے ہین، باتک، شاکی "شامنگ" اور تانگ ملایا، اور سماٹرا مین اور ایک بورنیو مین پائے جاتے ہین،

(۳) نیگریٹو (Negrito) یہ غیر مہذب گروہ کی ایک شاخ ہے، گو یہ آپس مین مختلف ہین لیکن ان کی عام خصوصیات بالکل یکسان ہین، نیوگنی مین پاپوا اور ان کی خاص تعداد جزائر ملوکو اور شمالی سلیبس مین پائی جاتی ہے،

ان کے بال گھونگروالے اور رنگ سیاہ ہوتا ہے جنگلی جانور اور پھل ان کی غذا ہے، ان کے متعلق محققون کی تین رائین ہین

(۱) یہ جزائر کے اصلی باشندے ہین،

(۲) خاص ایشیائی خطہ (Asia main land) کے اصلی باشندے ہین،

(۳) افریقہ سے آئے ہوئے قبائل ہین، یہ آخری رائے سب سے زیادہ قابلِ قبول مانی جاتی ہے،

اقتصادیات | قدیم زمانہ مین ان جزائر کی اقتصادی اہمیت اتنی زیادہ تھی، کہ وہ سونے کے مُلک یا سونے کے جزیرہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، اور اب تو ان کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے، کہ Dorothy woodman ان کے متعلق یون لکھتا ہے، کہ

"بحرالکاہل کے یہ ہزارون جزائر موجودہ اقتصادی دنیا مین بہت بڑی اہمیت رکھتے ہین، ان کی پیداوار یورپ اور امریکہ کے کروڑون آدمیون کی اقتصادیات پر اثر انداز ہوگئی ہے"

چونکہ وہ خطِ استوا پر واقع ہین، اس لئے خاص طور پر استوائی پیداوار کا خزانہ ہین، اور وسادر کے لئے شکر، کافی ربر، ناریل، سنکونا، تمباکو، سیاہ مرچ اور دیگر مصالحے ان کی مشہور پیداوار ہین، تقریباً ہر جگہ ان کی بہت بڑے پیمانہ پر کاشت کیجاتی ہے، اگر ضرورت پڑے تو یہ جزائر ساری دنیا کے لئے ربڑ اور شکر مہیا کرتے ہین، تمباکو، ۲ ہزار ٹن سیاہ مرچ ۳۰ ہزار ٹن، ناریل چار لاکھ ٹن، کم و بیش ہر سال ان جزائر مین پیدا ہوتے ہین، امریکی ربڑ کمپنی (U.S.A) (Good year Tire & Rubber & Tire stone Tire Rubber Co) ان جزائر کے ربڑ کے چوتھائی حصہ پر قابض ہے، دنیا کی ربڑ کی تمام پیداوار کا نصف سے زیادہ حصہ صرف ملایا سے حاصل ہوتا ہے Murray oulton نے یہ لکھا ہے کہ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر سماٹرا کی پوشیدہ دولت کا استعمال کیا جائے اور اس کی زرخیز زمین کی کاشت کی جائے، تو وہ ساٹھ یا ستر ملین باشندون کی کفیل ہوسکتی ہے، ممالک متحدہ کی درآمد ۱۹۳۹ء مین ان جزائر سے ۹۹ فی صدی کونین ۶۲ فی صدی کو بیوکا، ۷ فی صدی بکری کے چمڑے اور ۸۶ فی صدی تو بیوکا ہے، ان پیداوارون کے علاوہ انڈونیشیا معدنیات کے لحاظ سے بھی کم نہین ہے، یون تو Balikpapan Tarakan Tanjoeng PURA PALEMBANG تیل کے لئے اہم جگہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی جگہ جگہ تیل کے چشمے ہین جس قدر تیل رومانیا اور ایران مین نکالا جاتا ہے، اس سے کہین زیادہ بورنیو مین نکلتا ہے، امریکی تیل کمپنی (No 20 Standard oil Co) کے (Jersey & California) کے ذریعہ جزائر کے تقریباً ۴۰ فی صدی تیل کے منافع حاصل کرتی ہے، (Banka Malay Peninsula اور Billiton) ٹین کا خزانہ ہے، یہان سے تیس ہزار ٹن سالانہ برآمد ہوتا ہے، دنیا بھر مین جس قدر ٹین ملتا ہے، اس کا تہائی حصہ ملایا سے نکلتا ہے، لوہے کوئلے سونے، چاندی اور ہیرے کی کانین بھی یہان پائی جاتی ہین، ۱۹۳۵ء مین صرف جزیرہ نماے ملایا سے ۲۹۰۰۰ آونس سونا نکالا گیا ہے، (Murray Oulton) نے سماٹرا کے متعلق لکھا ہے، کہ اس کا معدنی ذخیرہ بہت زیادہ مشہور رہے، لیکن یہ بھی سائنٹفک استعمال کا منتظر ہے، اگرچہ حال ہی مین تیل کی نکاسی بہت بڑھ گئی تھی، وہان قیمتی کوئلہ کا خزانہ ہے تانبے، ٹین، لوہے جیسی معدنیات کے ساتھ ساتھ بیش قیمت دھات سونا اور چاندی بھی ملتی ہے،

الغرض جزیرہ سماٹرا مین ہر وہ چیز موجود ہے جس سے وہ دنیا مین ایک امیر ترین ملک بن سکتا ہے،

جزائر کی یہ ساری پیداوار اور خام اشیا سنگاپور کے بازار میں یکجا ہو کر ساری دنیا کے مختلف حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں، Dudley Stamp نے لکھا ہے، کہ جاوا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، لیکن اس کے باوجود بھی یہاں کی تجارتی برآمد کلکتہ کی تجارتی برآمد سے زیادہ قیمتی ہے، انڈونیسیا کی تمام اشیا کا ٹھیکہ باہر والوں کے ہاتھ میں ہے، اور قابلِ افسوس بات یہ ہے، کہ ان میں یہاں کے باشندوں کا کوئی حصہ نہیں، غرض ان جزائر کے گرانمایہ ذخائر اقتصادی دنیا کے اہم ترین عنصر ہیں،

۱۶۰۲ء میں ڈچ ایسٹ انڈیز کمپنی (Dutch East Indies) کی بنیاد پڑی، اس کا خاص مقصد انڈونیسیا میں تجارت اور اس سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا تھا، اس کو ملکی انتظام سے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ ان میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی، البتہ تجارتی مفاد کے لئے وہ مقامی عہدہ داروں پر اپنا تسلط جماتی تھی، یہ لوگ ولیعہد (Regent) یا نائب حکومت کہے جاتے تھے، کمپنی کے لئے قلی اور کارندے مہیا کرتے تھے، انہیں لوگوں نے انڈچانا کی کاشت میں چاول کی پیداوار بڑھا کر فرانس کے لئے سرمایہ فراہم کیا، ایوتھ (Tin, Sulphur) کے مزدوروں نے برطانیہ کے لئے اقبالمندی کا سامان تیار کیا، اور جاوا کے نہتوں نے تیل کے کنوئیں کھود کر ڈچ والوں کی زندگی کا معیار بلند کر دیا،

اس سے انڈونیسیا کو فائدہ ضرور پہونچا، اس لئے کہ پڑتی زمینیں بڑے پیمانہ پر کاشت کی جانے لگیں، بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم ہونے لگے، کان کنی کی وجہ سے پہاڑی اور ویران مقامات آباد ہو گئے، بے شمار بندرگاہوں کی تعمیر عمل میں آئی جس میں یورپ، امریکہ، آسٹریلیا اور جاپان کے بڑے بڑے تجارتی جہاز لنگر انداز ہوتے تھے، اس سے انڈونیسیا کی رونق روز بروز بڑھتی گئی، اور سچ تو یہ ہے، کہ انھیں کی بدولت انڈونیسیا کی سرزمین دولت اگل رہی ہے، لیکن اصلی باشندوں کی حالت یہ ہے کہ وہ دانہ دانہ کے محتاج اور آبادی چھوڑ چھوڑ کر غیر آباد جگہوں میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے......

انیسویں صدی کے وسط میں وہاں ایک زبردست قحط پڑا، جس میں باشندوں کی بڑی تعداد ضائع ہو گئی، کمپنی کی یہ پالیسی کسی حالت میں بھی اچھی نگاہوں سے دیکھی نہیں جا سکتی ہے، کہ اس نے اپنے تجارتی مفاد کے مقابلہ میں باشندوں کی فلاح و بہبود کی قطعی پرواہ نہ کی، اور اسی لئے جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ میں منتقل ہو گئی، اسی طرح ڈچ ایسٹ انڈیز کمپنی، ڈچ مشرقی مجمع الجزائر کے موجودہ نظامِ حکومت میں منتقل ہو گئی،

بٹاویا کے ابتدائی جمہوری عہد میں انقلابِ فرانس کے اثرات نظر آنے لگے تھے، چنانچہ ڈچ ایسٹ انڈیز کمپنی کی نااہلی اور ناانصافی Home Parliament میں پیش کی گئی، اس پر غور کرنے کے لئے ۱۸۰۰ء میں گورنمنٹ نے ایک کمیشن اس ہدایت کے ساتھ مقرر کیا، کہ جن اصول اور طریقوں پر مقبوضہ ممالک کی تجارت ہونی چاہئے، وہ ایسے ہوں جو جزائر شرق الہند کے لئے عظیم ترین فلاح و بہبود اور سرکاری تجارت نیز ملکی مالیات کے لئے سب سے زیادہ منافع پیدا کریں؛

پھر رفتہ رفتہ گورنمنٹ کی جانب سے کئی ترمیمات ہوئیں، ان میں ۱۸۵۴ء کا قانون ڈچ آبادکاری کی تاریخ میں دور آفریں واقعہ (Land mark) کی حیثیت رکھتا ہے، انیسویں صدی میں انقلابِ روس کا اثر اس ملک پر بھی پڑا، چند حریت پسند رہنماؤں نے آبادکاری کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ وہ عام دلچسپی کا باعث بن گیا، نتیجہ ۱۹۰۱ء کا یہ فرمان کہ "اہلِ جاوا کی فلاح و بہبود کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا" اسی کا نتیجہ تھا، کاش دو صدی حکومت

---

(۱) انڈوچائنا کا باشندہ۔ (۲) Spuh ملایا میں ٹین کی بہت مشہور کان کا نام ہے،

حکومت کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں پہلی بار نیدرلینڈ گورنمنٹ نے براہ راست انڈونیسیا کے لئے ۴۰ ملیون [illegible] کی رقم اس شرط پر دینی منظور کی، کہ اس کو پندرہ سال کے اندر جاوا اور مدورا کی اقتصادی ترقی میں صرف کیا جائے،

سیاسیات انڈونیسیا کی سیاسی حیثیت ایک بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے، اس پر ایسے ایسے فرمانرواؤں نے حکومت کی ہے جن کی اہمیت سلطنت کے رقبہ اور فتوحات کے لحاظ سے کسی طرح قدیم بڑے بڑے حکمرانوں سے کم نہ تھی، مغرب میں ہندوستان تک شمال میں فلپائن و جزیرہ نمائے کوریا تک مشرق اور جنوب میں دیگر جزائر تک ان کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی، ان کا جنگی بیڑا اپنے وسیع نوآبادیات میں چکر لگاتا رہتا تھا، جو بحر الکاہل اور بحر ہند میں واقع تھے، جاپان، چین اور جزیرہ مڈگاسکر ان کے تجارتی بیڑے کے جولانگاہ تھے،

ہندو عہد جزائر شرق الہند، اپنے خزانوں کی وجہ سے دوسری قوموں کے لئے قدیم زمانہ سے آج تک جاذبیت کا باعث بنا ہوا ہے، ہندوستان کے تاجر اسی دولت کی تلاش میں وہاں پہونچے یہی تجارتی آمد رفت نوآبادیات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، ہندوؤں کا نوآبادیاتی زمانہ پہلی یا دوسری صدی میں شروع ہو چکا تھا، لیکن ابو زیاد حسن (عربی مورخ) کا بیان ہے کہ ہندوؤں کی عظیم الشان سلطنت جو مجمع الجزائر کے بڑے حصہ اور جزیرہ نمائے ملایا پر حاوی تھی، وہ نویں صدی کے وسط سے لیکر دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک پورے عروج پر تھی، چینی اور عربی مورخ دونوں کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں صرف "سایلینڈرا" کی زبردست سلطنت کو سیاسی اور تجارتی فوقیت حاصل تھی،

اس کے بعد انڈوجاوی عہد حکومت شروع ہوتا ہے، اس دور میں سلطنت ماتارام، کجاجارن، تادری اور سنگھاساری خاندان قابل ذکر اور پرشکوہ سلطنتیں تھیں، تیرہویں صدی میں "ماجاپاہیت" کی سلطنت سب سے آخر اور سب سے بڑی تھی جو تقریباً تمام انڈونیسیا پر حکمران تھی، اور اپنی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اور حکومتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ حکومت مانی جاتی تھی، سیاسی اقتصادی اور علمی حیثیت سے بیرونی انڈونیسیا میں بھی اس کا چرچا تھا، ہندو اور انڈوجاوی عہد حکومت کی تفصیل ایک ضخیم کتاب کی محتاج ہے، اس موقع پر اتنا لکھنا کافی ہے، کہ ان کے آثار کئی سو سال گذر جانے کے بعد آج بھی انڈونیسیا کے بعض بعض حصوں میں عالیشان مندروں اور بلند بالا بتوں جیسے (Mendoet Borobudur) وغیرہ کی صورت میں پائے جاتے ہیں، بلکہ جزیرہ بالی آج بھی ہندو عہد کی زندہ یادگار ہے، اور انڈوجاوی حکومت مٹتے ہی اسلام کا نیر اقبال طلوع ہوا،

اسلامی عہد اسلامی انڈونیسیا میں اسلام کی روشنی کب اور کن لوگوں کے ذریعہ پہونچی اس کا قطعی طور پر بتانا ناممکن سا ہے، اس لئے کہ تاریخ کے صفحات اس باب میں خاموش ہیں، لیکن جہاں تک قیاس رہنمائی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ عرب تاجروں کے ذریعہ یہاں اسلام پہنچا، اہل عرب بہت قدیم زمانہ سے مشرقی ملکوں میں تجارت کرتے تھے، آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں چین کے صوبہ کانٹن میں عرب تاجر کثرت سے نظر آتے تھے، پندرہویں صدی میں جب کہ پرتگال والے ملایا کے جزائر میں پہونچے، تو مشرقی ملکوں کی تجارت پر اہل عرب کو قابض پایا، جو دسویں صدی سے یہاں تجارت کرتے تھے، انڈونیسیا کی بندرگاہوں میں ان کی خاصی تعداد آباد ہو گئی تھی، اور وہاں انھوں نے اپنے مذہب کا بیج بو دیا تھا، اس تجارتی تعلق نے رفتہ رفتہ سیاسی حیثیت اختیار کر لی، اور انڈونیسیا میں ہندو حکومت کے تباہ شدہ کھنڈر پر کئی اسلامی ریاستوں کی بنیاد پڑی، یہ بارہویں اور تیرہویں صدی کا زمانہ تھا، اور ملکوں کے برخلاف انڈونیسیا کی اسلامی تاریخ

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان جزیرون مین اسلام کی کامیابی مسلمان فرمانرواؤن اور اسلامی مبلغین دونون کی یکجہتی اور پرخلوص کوشش کا نتیجہ ہے، مبلغون نے ان جزیرون مین اسلام کی تخم ریزی کی، اور مسلمان فرمانرواؤن کے ہاتھون اس کی آبیاری ہوئی، ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماٹرا کے سلطان سمدرا نے شاہان دہلی سے دوستانہ تعلقات پیدا کرلئے تھے، اس سلطان کے دربار مین دو فقیہ موجود تھے، ان مین ایک شخص شیراز اور دوسرا اصفہان کا باشندہ تھا، ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب اشاعتِ اسلام مین لکھا ہے کہ مسلمانون نے اندونیسا مین اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاحین بھی کین لیکن ان کے اندر فاتحانہ نخوت و پندار اور شاہانہ تعلّی وخودستائی نہ تھی، اور نہ انھون نے سپین اور ہالینڈ کے عیسائی فاتحون کی طرح یہ دعویٰ کیا کہ ہم کسی زبردست قوم کے آدمی ہین، اور ہمین ہر قسم کی سرفرازی و برتری حاصل ہے تاکہ ملک کے باشندون کو ذلیل سمجھ کر اُن پر ظلم کیا جائے، بلکہ مسلمان صرف تاجر کی حیثیت سے یہان آئے اور اپنی لیاقت اور ذہانت اور بہترین تہذیب کی مدد سے اسلام کی خدمت مین مصروف رہے، حکومت کے بل پر لوگون کو آزار پہنچانا یا دولت سمیٹنا ان کا مقصد نہ تھا،

غرض ان مبلغون کی کوششون سے اسلام کی روشنی مختلف سمتون مین پھیل گئی اور یہان کے باشندے اسلام کی دولت سے سرفراز و سربلند ہوتے گئے، یہان تک کہ اب اندونیسا کی زیادہ آبادی مسلمانون کی ہے، ۷ لاکھ ۳۵ ہزار ۲۶۸ مربع میل کے رقبہ مین، ۷ کروڑ، ۷ لاکھ، ۲ ہزار ۲۳۳ کی آبادی مین تقریبًا ۶ کروڑ مسلمان ہین،

یورپین دور سمندری راستہ دریافت ہونے کے بعد جب یورپ والون کے لئے مشرقی ممالک کا دروازہ کھلا تو پہلے پہل پندرہوین صدی کے آغاز مین پرتگال والے پہونچے، پھر اسپین والون کی باری آئی، اور پندرہوین صدی کے وسط مین ہالینڈ کے بحری بیڑے (Cornelis de Houtman) کی زیر قیادت اندونیسا کی طرف روانہ ہوئے اُور سولہوین صدی کے آغاز مین جاوا کے شہر Djakarta پر اپنا علم نصب کیا، اور شہر Betavia کی بنیا ڈالی، جو اندونیسا کا دار السلطنت تھا، اس کے بعد انگریزون کی آمد ہوئی، ان کے علاوہ چینیون نے بھی بڑی تعداد مین اندونیسا کی آبادی مین اضافہ کیا، لیکن قسمت نے یہ موقع صرف اہل ہالینڈ کو دیا، کہ وہ بحیثیت حکمران اتنے دنون تک اندونیسا کی سرزمین پر اپنا جھنڈا لہراتے رہے،

۱۹۲۳ء کے دستوری قانون کی رو سے شرق الہند ڈچ سلطنت کا ایک مستقل جز مان لیا گیا، اور اس دن سے حکومت کی باگ براہ راست تاج ہالینڈ کے ہاتھ مین منتقل ہوگئی، گورنر جنرل کا تقرر جس کے اختیارات اور جس کا عہدہ ہندوستان کے وائسرائے کے برابر ہے، براہ راست تاج ہالینڈ کے اختیار مین ہے، اور وہی ملک کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے، اس کا صدر مقام (Head quarter) بٹاویا (Betavia) کا شہر ہے، گورنر جنرل کی ایک کونسل ہے جو ایک وائس پریسیڈنٹ اور چار ممبرون پر مشتمل ہے، ان مین سے ایک ممبر اندونیسی ہوتا ہے، یہ لوگ نظم و نسق کے تجربے کے لئے منتخب ہوتے ہین، اس کے علاوہ آٹھ اور شعبے ہین، جنگی، سمندری، عدالتی وغیرہ، ہر ایک شعبہ کا ایک ڈائرکٹر ہے، جو گورنر کی طرف سے ان شعبہ جات کا ذمہ دار ہوتا ہے، بقیہ حصون مین ریزیڈنسی طریقہ رائج ہے، ہر ریزیڈنسی ایک ڈچ ریزیڈینٹ کے ماتحت ہوتی ہے، لیکن جاوا متعدد ریجنسیون پر منقسم ہے، ان مین سے ہر ایک ریجنسی مقامی نواب (Native Regent) کی ماتحتی مین ہے، اس کا ایک حصہ مقامی ریاست (Native State) ہے جو محدود

خود اختیاری حکومت کی حیثیت رکھتی ہے،

اندونیشیا کی الگ اپنی پارلیمنٹ ہے، جس کو فولکسراد (Volksraad) کہتے ہین، اس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۸ء مین ہوا تھا، فولکسراد صرف مشاورتی مجلس ہے، انتظامی امور سے اس کو عملی تعلق نہیں، سال مین اس کے دو اجلاس ہوتے ہین؛ ان مین سے ایک خاص بجٹ کے لئے ہے،

اندونیشیا کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ریاستہاے متحدہ امریکہ کے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر (Cordell Hull) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جو انھون نے اپریل ۱۹۴۰ء مین دیا تھا، کہ نیدرلینڈ انڈیز کی سیاسی حیثیت مین کوئی تبدیلی براہ راست بہت سے ممالک کے مفاد پر اثر انداز ہوگی، کیونکہ بحرالکاہل کے بین الاقوامی سیاسی تعلقات مین یہ جزائر بڑی اہمیت رکھتے ہین، ان جزائر کی اندرونی زندگی یا اوس کی موجودہ سیاسی حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی بنیاد اگر صلح و آشتی کے علاوہ کسی چیز پر ہوئی تو نہ صرف ان جزیرون کا امن وامان اور سکون خطرہ مین پڑ جائے گا، بلکہ اس کی لگائی ہوئی آگ سارے بحرالکاہل کے سکون کو جلا کر خاکستر کر دیگی،

قومی تحریک اندونیشیا مین جذبۂ قومیت کے ابھرنے کا باعث یہان کی غیر ملکی حکومت ہے، اٹھارہوین صدی کے اخیر مین یہان ڈچ حکومت قائم ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا، جب یورپ مین قومیت اپنی پوری نشو ونما کو پہنچ چکی تھی، انقلاب فرانس سے قومیت کی تاریخ مین ایک نئے باب کا اضافہ ہوا تھا، ان قومون کی بڑھتی ہوئی طاقت نے قومی خود غرضی کو قومیت کا معیار قرار دے رکھا تھا، اور دنیا کی کمزور اور غیر منظم قومین اس خود غرضی کا نشانہ بن رہی تھین، قومیت کا نصب العین اقتصادی منفعت، سیاسی طاقت اور حکومت تھا، چنانچہ اسی نصب العین کے ماتحت اندونیشیا پر بھی قبضہ کیا گیا، اور دوسرون کے قومی مفاد کی خاطر اندونیشیا کے مقاصد پس پشت ڈال دیئے گئے، ۱۸۶۸ء مین جاپان مین زبردست انقلاب ہوا، اور نصف صدی کے مختصر عرصہ مین جاپان دول عالم کی صف اول مین شامل ہوگیا، ۱۹۰۵ء مین روس کی سلطنت سے اس کا تصادم ہوا، اور وہ جزیرہ نماے کوریا پر قابض ہوگیا، پورٹ آرتھر مین توپون کے دھماکون نے ساری دنیا کو چونکا دیا، اور مشرقی اقوام اس آواز سے جاگ اٹھین، اندونیشیا جو اس کا قریبی پڑوسی ہے، اس سے زیادہ متاثر ہوا، جنگ عظیم کے بعد انقلاب روس رونما ہوا، جو اندونیشیا مین بڑی حد تک جذبۂ قومیت کا محرک ہوا، چینیون کی بڑھتی ہوئی آبادی، اور دوسری قومون کی دست درازیون نے بھی اندونیشیا کے جذبۂ قومیت کی آبیاری کی،

ڈچ شہنشاہیت کے دوسو سالہ دور مین اندونیشیا اقتصادی اور معاشرتی دوڑ مین دوسرے ملکون سے بہت پیچھے رہ گیا تھا، اس لئے بیرونی حکومت کا بوجھ اندونیشیا والون کو کھلنے لگا، اور ان مین آزاد اور بااختیار ہونے کا جذبہ کام کرنے لگا، قومیت کا تصور اندونیشیا والون کے دماغ مین جگہ پانے لگا، اور ان مین عام بیداری پیدا ہونے لگی، ملکی ادب و ثقافت کو زندہ کیا جانے لگا، قومی زبانون کو ترقی ہونے لگی، مذہبی سرمایہ کو قومی زبانون مین منتقل کیا جانے لگا، ماضی کی بھولی ہوئی روایات کی یاد تازہ کی جانے لگی، غرض ملک مین ایک عام معاشرتی اصلاح کی کوششین شروع ہوگئین، اور اسی کے ذریعہ قومی تنظیم وجود مین آئی، اور بیرونی حکومت سے جمہوری حکومت کا مطالبہ کیا گیا، مغربی تعلیم و تہذیب کے اثر سے اندونیشیا والون مین ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے اصلاح معاشرت کی طرف قدم بڑھایا، چنانچہ ۱۹۰۸ء مین انجمن بودی اوتومو (Boedi Oetomo) کی بنیاد پڑی، گو یہ انجمن شروع مین ایک ادبی انجمن تھی،

اور اس کا حلقہ جاوا کی ایک مختصر جماعت تک محدود تھا، لیکن بعد مین اس نے سیاسی حیثیت اختیار کر لی، اور اس کی وسعت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، یہان تک کہ ملک کی دوسری سیاسی جماعتین اسی انجمن کی شرمندۂ احسان ہین، قومی جماعتون مین شرکت اسلام، انڈونیسا قومی لیگ اور انڈونیسا اتحاد المسلمین قابل ذکر ہین، شرکت اسلام نے ۱۹۲۳ء مین فلکسراد (Parlia ment) کے خلاف عدم تعاون کی تجویز پاس کی، ۱۹۲۶ء مین انڈونیسا کمیونسٹ پارٹی نے جاوا مین اور ۱۹۲۷ء مین سماٹرا کی سرزمین مین حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، ۱۹۲۹ء مین بودی انوموتے حکومت سے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، اسی طرح سے دوسری قومی جماعتین بھی اپنی حیثیت کے مطابق جنگ آزادی مین ہاتھ بٹاتی رہین، قومی تحریک کی بدولت انڈونیسا کی سیاسی فضا مین ہر طرف قومی بیداری کے مظاہر نظر آنے لگے،

زبان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، انڈونیسا مین مختلف زمانون مین مختلف قومین آتی رہین، اس لئے فطری طور پر وہ مختلف تہذیبون کا مقام اتصال بن گیا، اور یہ تہذیبین نہ صرف انڈونیسا والون کے عقیدہ، رسم و رواج اور آرٹ پر اثر انداز ہوئین، بلکہ اس کی زبان و ادب بھی ان سے متاثر ہوئے، اسی لئے انڈونیسی ادب مین دنیا کی مختلف تہذیبون اور تمدنون کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے،

انڈونیسا کئی جزیرون کا مجموعہ ہے، ہر جزیرہ کی الگ الگ بولی ہے، ایک صوبہ کی زبان دوسرے صوبہ سے جدا ہے، یا کم سے کم لب و لہجہ، تلفظ اور طرز گفتگو مین اختلاف ہے، ان زبانون مین زیادہ مشہور ملایو، جاوی، بوگیس، باٹک اور آچیہ زبانین ہین، اور ہر زبان اپنا رسم الخط اور ادب رکھتی ہے، لیکن ان سب مین صرف ملایو زبان ایسی ہے جو صدیون سے انڈونیسا مین قریب قریب بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ لوگ جن کی بولیان الگ الگ ہین کسی نہ کسی حد تک یہ زبان بولتے اور سمجھتے ہین، اب انڈونیسی قوم کی تحریک بیداری کو جس کی کوشش ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ انڈونیسی باشندون کی سعی و عمل کو متحد کیا جائے، ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی، جو سب فرقون، جماعتون اور گروہون کے درمیان مشترک ہو، اور قومی تحریک کے مقاصد کی ترجمانی کر سکے، چونکہ انڈونیسا ایک ایسا نام ہے، جو احساس وحدت اور جذبۂ اتحاد کا صحیح ترجمان ہے، اس لئے جزائر ملایو کا نام انڈونیسا رکھ دیا گیا، اور اس کی نسبت سے اس کی زبان بھی انڈونیسی زبان بن گئی، یہ تبدیلی جذبۂ قومیت کی پہلی جیت تھی، قومی وحدت کے لئے اتحاد زبان ضروری ہے، اور ملایو زبان عرصۂ دراز سے تمام جزائر کی مشترکہ زبان تھی، اس لئے وہی قومی زبان قرار پائی، اور اس کا نام ملایو زبان کے بجائے انڈونیسی زبان رکھ دیا گیا، ملایو زبان ایک حد تک تنگ و محدود تھی، لیکن اب انڈونیسی زبان نے اپنا دامن اتنا وسیع کر لیا ہے جتنی ایک قومی زبان کے لئے ضرورت ہے، اس کے الفاظ صرف سنسکرت اور عربی ہی زبان سے نہین لئے جاتے، بلکہ جزائر انڈونیسا کی سب مقامی بولیان اور مغرب کی ساری زبانین خاصکر ڈچ زبان انڈونیسی زبان کا ماخذ ہین،

ملایو زبان کے انڈونیسی زبان بننے کے ساتھ ہی رسم الخط کا سوال بھی پیدا ہوا، اس کا پہلا رسم الخط عربی تھا، لیکن نام کے بدل جانے سے اس کی پہلی خصوصیت اور حیثیت باقی نہین رہی، وہ تمام انڈونیسا کی واحد زبان تسلیم کر لی گئی، اس لئے عربی رسم الخط اب مناسب نہین رہا، انڈونیسا مین جو مختلف زبانین رائج تھین، ان سب کے رسم الخط الگ الگ تھے، اگر انڈونیسی زبان کے لئے عربی رسم الخط اختیار کیا جاتا، تو اس قسم کے اختلافی سوالات پیدا ہونے کا امکان تھا کہ جاوی زبان کا رسم الخط کیون نہ اختیار کیا جائے، جب کہ اس رسم الخط کے جاننے والے زیادہ لوگ ہین، اس قسم کے صوبجاتی

سوالات کو جو ہر تحریک کے لئے خطرناک ثابت ہوتے ہین، روکنے کے لئے تعلیم یافتہ گروہ اور انڈونیشی تحریک کے لیڈرون نے عربی حروف کے بجائے رومن حروف کو انڈونیشی زبان کے رسم الخط کی حیثیت سے پسند کیا، اس نازک مسئلے کو بہت احتیاط سے حل کیا گیا، اور بغیر کسی مخالفت کے آہستہ آہستہ رومن رسم الخط انڈونیشی زبان کا رسم الخط بن گیا، انڈونیشی زبان کے لئے رومن حروف اختیار کرنے کی یہ مصلحت بھی تھی، کہ وہ عربی حروف اور صوبجاتی زبانون کے حروف کی بہ نسبت انڈونیشی زبان کی آوازون اور لہجون کو زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل طور پر ظاہر کرتا ہے، اور رومن حروف کا سیکھنا بھی زیادہ آسان ہے، انڈونیشی زبان خود بھی سادہ اور آسان زبان ہے، اس رسم الخط کی بدولت انڈونیشی زبان کی مقبولیت اور بڑھ گئی ہے، وہ بہت جلد سارے انڈونیشیا کی بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے پھیل گئی،

ادب انڈونیشیا پر قدرت کی نوازشین بے شمار ہین، آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے، کثرتِ بارش کی وجہ سے سارا ملک گھنے جنگلون سے بھرا پڑا ہے، انڈونیشیا کی سرزمین مین بے انتہا نشیب و فراز ہین جس مین شاندار پہاڑیان، شاداب وادیان، دلآویز ندیان، نظر فریب آبشار اور بے نظیر ساحلی پیچ و خم پائے جاتے ہین جن سے حسن مناظر کے علاوہ آبپاشی اور نقل و حمل مین بڑی امداد ملتی ہے، اور وہ بہترین بندرگاہ کے لئے بہت موزون جگہ ہے، اس کے مناظر کے حسن و خوبی نے لوگون کی سیرت، اخلاق و عادات اور رسم و رواج پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے، ان کی روایات، ان کی تاریخ، ان کا فلسفہ، ان کے فنون لطیفہ سب اسی فطرت کی فیاضی کے زیر سایہ پیدا ہوئے ہین، اس کے علاوہ اس کا اجتماعی ماحول، چین، ہندوستان، فارس اور عرب جیسے تمدن کے قدیم گہوارون کی مختلف تہذیبون سے متاثر ہے، اس ماحول نے کچھ نہ کچھ جزوی طریقہ پر سہی انڈونیشی باشندون کے احساسات جذبات اور خیالات پر بھی اثر ڈالا ہے۔

قدیم انڈونیشی ادب مین جمود و تعطل کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہین دیتی، اور اس کا قدیم ادبی سرمایہ زیادہ تر ایسے قصے کہانیون پر مشتمل ہے جو حیرت انگیز واقعات اور تعجب خیز حادثات سے پُر ہین، اس کو علمی معلومات، اصلاحی پروگرام، اور سماجی معاملات سے کوئی تعلق نہین، اس مین یا تو محض دیو اور پریون کی کہانیان تھین، جو ہندو مذہب کی روایات مین ملتی ہین، یا الف لیلہ کے قصے اور امیر حمزہ کی داستان لیکن موجودہ ادب کا مطمح نظر تمامتر اصلاحی ہے، اس مین مذہبی، علمی، سیاسی، ادبی ہر قسم کا لٹریچر موجود ہے، جذبۂ حب الوطنی اور انقلاب کا علمبردار ہے، اس کا اسلوب نہایت آسان اور سہل ہے، نثر نگارون مین بعض اہل قلم قدیم لٹریچر سے متاثر ہین، بعض مغربی ادب کے دلدادہ ہین، کچھ ایسے بھی ہین، جن کی توجہ تمامتر صوبجاتی ادب کی جانب ہے، لیکن سب کے سب ایک ایسی راہ کی تلاش مین ہین جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کے تلاطم کا اظہار موزون طریقہ سے کرسکین نظم کا بھی یہی حال ہے، غیر مانوس ترکیبون، پیچیدہ اور دقیق استعارون مبہم اور دور از قیاس تشبیہون، لغو اور بعض موضوعون کو جو خاص پرانی شاعری کی خصوصیات ہین، چھوڑ کر ادب مین جدت پیدا ہورہی ہے، اس وقت کا ادب انقلابی خیالات، حب الوطنی کے جذبات قوم کی زبون حالی کی دلسوز فریاد، اور شاندار مستقبل کے ولولہ انگیز پیامات سے لبریز ہے نظم، غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ہر صنف مین تجدید و اصلاح نظر آتی ہے، اور سائنٹفک مذاق بڑھ رہا ہے، یہ تمام اصلاحات جدید اثرات کا نتیجہ ہین، انڈونیشیا کے جدید شعراء تعلیم و تربیت، اعتقاد و مذہب، رنگ و نسل، وضع و قطع، مشاغل و مصروفیت اور طرز زندگی وغیرہ کے اختلاف کے باوجود صرف ایک انقلابی نظریہ رکھتے ہین، روزنامہ اخبارات، ماہانہ رسالے، ہفتہ وار اور سہ روزہ اخبارات کافی تعداد مین نکلتے ہین، اور مختلف النوع

کتابون کی اشاعت دن دونی رات چوگنی ہورہی ہے، اگرچہ دوسری ترقی یافتہ زبانون کے مقابلہ مین ابھی اس کی رفتار سست ہے تاہم پہلے سے بہت زیادہ ہے، مختلف علوم و فنون کو بھی انڈونیشی زبان مین منتقل کرنے کی کوشش جاری ہے، اور وہ دن دور نہین جب وہ علمی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کرلے گی،

تعلیم ہندوؤن کے دور حکومت مین سنسکرت زبان کی اشاعت و ترقی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہان قدیم زمانہ مین تعلیم کا اچھا خاصہ چرچا تھا، پھر مسلمانون کے عہد زرین مین تعلیم مین مزید ترقی و اصلاح ہوئی، خصوصاً مذہبی تعلیم نے بڑی تیزی کے ساتھ رواج پایا، مسجدین حلقۂ درس بن گئین، جگہ جگہ مدرسے قائم ہوئے، عربی زبان کا شوق صرف عام پبلک ہی تک محدود نہ تھا بلکہ بعض مسلمان فرمانروا بھی اس سے بڑی حد تک متاثر تھے، ابن بطوطہ سلطان سمدرا کے متعلق لکھتا ہے، کہ عربی زبان سے اوس کے شغف اور نظم و نثر مین شوق کا یہ حال تھا، کہ جب کبھی اس کے پاس کوئی عالم ادیب یا شاعر نہ ہوتا تو مکہ و مدینہ کے اکابر علما سے استفادہ کے لئے حجاز چلا جاتا، انڈونیشیا مین عربی زبان سے دلچسپی کا آج بھی یہی حال ہو، وہان کے طالب علم اپنے وطن اور اعزہ و اقربا کو چھوڑ کر سمندر پار محض عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چلے جاتے ہین، دنیا کے تمام اسلامی مدارس خصوصیت کے ساتھ مصر و حجاز اور ہندوستان کے مدرسون مین ان کی خاصی تعداد ہے،

اسلامی عہد کے آخری دور مین مغرب کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلہ مین اسلامی سلاطین کی جنگی مشغولیت کی وجہ سے ملکی فلاح و بہبود کو بڑا نقصان پہنچا، اس سے تعلیم بھی متاثر ہوئی، اور مغربی اقوام کے برسر اقتدار ہونے کے بعد ۱۹۲۹ء تک اس کی تلافی نہ ہوسکی، ۱۹۳۰ء مین جاکر پھر تعلیم کا نظام قائم ہوسکا، لیکن وہ ابھی ابتدائی منزل مین ہے، پرائمری اور مڈل اسکولون کے ساتھ چند ہائی اسکول بھی ہین، اور Surabaya اور Batavia مین ٹکنیکل کالج قائم ہوئے ہین ۱۹۴۰ء مین بٹاویا مین یونیورسٹی کی بنیاد پڑی، اس کے علاوہ تجارتی کالج، زراعتی کالج اور ڈیکل کالج بھی کھولے گئے، اس وقت گورنمنٹ کی توجہ سب سے زیادہ حفظان صحت کی جانب ہے، تاکہ انڈونیشیا سے بیماریون خاص کر متعدی امراض کا انسداد ہوجائے، ملک مین نئے طریقۂ تعلیم کا اجرا پہلے پہل پبلک کے ہیجان، اور بے اطمینانی کا باعث ہوا، اور وہ اسکو مشکوک نگاہون سے دیکھتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی تعلیم کو خاطر خواہ فروغ حاصل نہ ہوسکا، اور اس سے ملک کو بڑی حد تک نقصان پہنچا، گو دو چار پڑھے لکھے لوگ پیدا ہوگئے لیکن ان کی حیثیت سرکاری دفاتر کے پرزے سے زیادہ نہ تھی، تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لوگون مین نئی تعلیم کا شوق پیدا ہوگیا، نئے دور کا آغاز اسی نقطہ سے شروع ہوتا ہے، پھر قومی تحریک کے فروغ نے لوگون کو جدید تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ کیا، اور وہ ادارے جو کچھ دنون پہلے شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کیجانے لگی غیر سرکاری اور پبلک ادارون کا قیام اسی احساس کا نتیجہ تھا، غیر سرکاری ادارے اپنے مقصد مین نصاب تعلیم کے لحاظ سے تین طبقون مین تقسیم کئے جاسکتے ہین، ایک خالص مذہبی، دوسرا خالص عصری، تیسرا دونون مین مشترک،

مذہبی ادارے انڈونیشیا کی آبادی مین تقریباً ۹۰ فی صدی مسلمان ہین، اس لئے وہان اسلام کی اہمیت مسلم ہے، اسلام ہی نے اہل انڈونیشیا کی ذہنیتون مین انقلاب پیدا کیا تھا، اسی نے ان کی اصلاح کی، اور اس کا اثر اہل انڈونیشیا کی زندگی کے تمام شعبون پر پڑا، اس کا یہ نتیجہ ہے، کہ ان مین تعلیم خصوصیت کے ساتھ مذہبی تعلیم جس تیزی سے پھیل گئی اسکی

مثال ملنی مشکل ہے، یہ اسلامی روح ہی کا اثر ہے، کہ انڈونیشیا مین نہضۃ العلما (جاوا) تربیۃ الاسلامیہ وطوالب (مغربی سماٹرا) اورجمعیتہ وصلیہ (مشرقی سماٹرا) جیسے بڑے مذہبی ادارے موجود ہین، اوران کی شاخین ملک کے مختلف گوشون مین پھیلی ہین، مدارس نصابیہ کے مقابلہ مین مدارس نظامیہ کی تعداد کم ہے، جن مین صرف اسلامی اور ثانوی درجون تک تعلیم ہوتی ہے، اس مین مذہبی لٹریچر اور اسلامی تاریخ کو خاص اہمیت دیجاتی ہے، ذریعہ تعلیم انڈونیسی زبان ہے،

عصری ادارے | عصری ادارون کے روح رواں وطن پرست ہین، ان کا نظریہ قومیت ہے، ان کا مشہور ادارہ تامن سیوا (Yaman Siswa) ہے جس کا نام انڈونیشیا مین بڑی عقیدت کے ساتھ لیاجاتا ہے، اس کا نصاب تعلیم کم وبیش سرکاری کالجون اور اسکولون کے مساوی ہے، قومیت کے اثر سے ڈچ زبان کے بجائے انڈونیسی زبان اس کا ذریعہ تعلیم ہے، سارے انڈونیشیا مین اس کی شاخین پھیلی ہوئی ہین،

مذہبی وعصری ادارے | ان ادارون مین جمعیت محمدیہ Balai Pend-اور Pirgoe roean Rajat (Balai Rajat) اپنی جامعیت کے لحاظ سے ممتاز ہین، موخرالذکر دونون ادارون کا اثر زیادہ ترجاوا مین اور کم تر دوسری جگہون پر ہے، لیکن جمعیۃ محمدیہ کا اثر سارے انڈونیشیا مین ہے، اس جمعیت کے مقاصد یون تو بہت وسیع ہین، لیکن ان مین دو زیادہ اہم ہین، ایک "اسلاف کے اعمال صالحہ اور اسوۂ حسنہ کی تجدید واحیاء اور دوسرا وقت کے مطابق لوگون کی تربیت" دوسرے زمانہ کی ترقیون اور ایجادات وانکشافات سے مکمل واقفیت" اس سے متعلق پانچ شعبے ہین، ان مین ایک شعبہ تعلیم کا ہے، اس کے ماتحت دو قسم کے مدارس ہین،

(الف) ایک وہ جن مین دن کے وقت تعلیم ہوتی ہے، ان مدارس کی تعداد تقریباً سات سو ہے، ان مین ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک کا بہترین انتظام ہے، ان درسگاہون مین دینی وعصری دونون قسم کی تعلیم ہوتی ہے، عصری تعلیم انگریزی یا ڈچ زبان مین دیجاتی ہے، اور دینی تعلیم عربی اور انڈونیسی زبان مین،

(ب) دوسرے مدارس شبینہ جن مین رات کے وقت تعلیم دی جاتی ہے، ان کی تعداد بھی کئی سو ہے،

اس جمعیت کا ایک شعبہ اصلاح نسوان بھی ہے، اس کے ماتحت عورتون کی اصلاح کے لئے ایک انجمن قائم ہے اس کا نام جمعیت عائشہ ہے، اس جمعیت کے ذریعہ عورتون کو ان کی ضروریات کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اس میں کم سن اور نوجوان عورتون کے علاوہ بوڑھی عورتون کی تعلیم کا بھی انتظام ہے،

ان خاص خاص ادارون کے علاوہ اور بھی بہت سے پبلک اور پرائیوٹ مدارس ہین جن کی بدولت انڈونیشیا مین ۸ فی صدی تعلیم یافتہ ہین،

خاتمہ | انڈونیشیا کی قیمتی پیداوارون اور اس کی خام اشیا نے اس کی جانب صنعتی ممالک کی ہوس کو بہت بڑھا دیا ہے، جاپان مشرق کا جدید ترقی یافتہ صنعتی ملک ہے، اس کو نہ صرف اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے توطن کے لئے زمین کی ضرورت تھی، بلکہ خام پیداوار کے حصول اور اپنی مصنوعات کی کھپت کے لئے بازار کا مسئلہ بھی اس کے لئے اہم تھا، مشرق بعید کے وسیع علاقے جاپان کی ان ضروریات کی تکمیل کرسکتے تھے، لیکن جاپان کی بیداری سے بہت پہلے یہان مغربی اقوام کا اقتدار قائم ہوچکا تھا، اور اس کے لئے ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع باقی نہ رہا تھا، اس لئے اس نے ان ممالک سے بزور مغربی اقوام کے اثر کو زائل کرنے کی پالیسی اختیار کی، چنانچہ منچو اور چین کے دوسرے زرخیز علاقون پر قابض ہونے کے بعد

اس کی توجہ جزائر بحر الکاہل کی طرف مبذول ہوئی، بحر الکاہل مین جاپان کی جنگی کارروائی بڑی حد تک اسی پالیسی کا نتیجہ ہے،

۷ دسمبر ۱۹۴۱ء میں مشرق اور مغرب کے تعلقات مین ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، جاپانی مغرب کی تمام چالون کو سیکھ کر اس کی حقیقت سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے، جاپانی بم ٹھیک (Prince of wales) پر گرا، ایسا ہی برطانوی بم (Gneisenau) پر پڑا، جاپانی ٹینک ملایا کے جنگلون سے گذرے جن کے بارے مین برٹش جنرل کا عقیدہ تھا کہ وہ ناقابل گذر ہین، گھونگر والے سیاہ فام پاپوا جنھون نے کبھی پہیا (wheel) کی صورت تک نہ دیکھی تھی، ان کے لئے جاپانی غوطہ خور طیارے یورپین ایجادات کا ذریعۂ تعارف ثابت ہوئے، سائنس کی نئی نئی ایجادات و اختراعات کا ادنیٰ مظاہرہ جاپانی فوج کی بدولت ملایا کے ساکی (Sakai) اور سامنگ (Samang) نے حیرت سے دیکھا، بورنیو کے وحشی ڈائک (Dayak) نے جو دنیا کی ترقیون سے بالکل بے خبر جانورون کی کھال پہنے جنگلی شکارون مین مشغول رہتے تھے، جاپانیون کی آتشباری کا ہولناک تماشا دیکھا، مختصر یہ کہ جزائر والون نے گوری فوجون کو جاپانی سنگینون سے پیچھے ہٹتے ہوے دیکھا، اور چند ہفتون کے اندر اندر مغربی اقوام کی ساری کائنات لٹ گئی،

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سمندر کی حفاظت Prince of wales اور Refulse کے سپرد تھی، سنگاپور کے خاص پھاٹک پر ۶۵۰۰۰ برٹش فوج کا پہرا تھا، آسٹریلیا اور امریکہ کے زبردست ہوائی بیڑے آسمان پر پرواز کر رہے تھے، ڈچ کا طاقتور بحری بیڑا سمندر مین سرگرم عمل تھا، ان تمام روک تھام اور سعی و کوشش کے باوجود جاپانی شہنشاہیت کا ہیبتناک اژدہا مشرق بعید کے تمام ڈچ برٹش امریکی و فرانسیسی نو آبادیات کو ایک ایک کرکے نگل گیا، اب آیندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے، انڈونیسا کے متعلق ضروری حالات و معلومات پیش کرنے کے بعد ٹائمس (۲۸ فروری ۱۹۴۲ء) کے اس اڈیٹوریل نوٹ پر مضمون ختم کیا جاتا ہی،

"مشرق بعید مین برطانوی اقتدار اپنی پرانی شکل مین کسی طرح واپس نہین لایا جاسکتا، دنیا کے اس حصہ کے آیندہ خاکہ مین پرانے برطانوی استحصال کے لئے کوئی جگہ نہین، بیسوین صدی کی دنیا کو برطانیہ اب بھی دیکھ سکتا ہے، برطانوی نوآبادیاتی نظام کے اندر جو روح کارفرما رہی ہے، اور اس کے ساتھ اس نظام کو چلانے کے لئے جو وسائل اختیار کئے گئے، ان کو دنیا کی تنقیدی عدالت نے کچھ بہت اچھی نظرون سے نہیں دیکھا، ان سخت نکتہ چینیون کو دور کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہین، کہ برطانوی مدبرین اس مسئلہ پر پھر ایماندارانہ نظر ڈالین، اور دور رس اور نتیجہ خیز اصلاحات عمل میں لائین"۔

جس ملک کے حالات کا ذکر اور باشندون کا تعارف پچھلے چند صفحات مین کیا گیا ہے وہی "میرا ملک اور میری قوم" ہی۔

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی حالات ہندوستانی زبان مین لکھے ہین،

ضخامت ۲۴۲ صفحے : قیمت ۱۲؍

منیجر

استدراک بر ترجمۂ ابن خلکان

از

جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی

فروری ۱۹۴۵ء کے معارف میں تاریخ ابن خلکان کے فارسی ترجمہ کے عنوان سے ہمارے مکرم دوست قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کے متعلق کچھ باتین میرے علم مین بھی ہین، افادۂ عام کے خیال سے اس کو مندرجۂ ذیل سطور مین تحریر کرتا ہون،

اس کتاب کا فارسی ترجمہ جو ہندوستان مین ہوا، اس کے چار نسخون کا ذکر کیا گیا ہے، دو برٹش میوزیم لندن مین ایک محکمہ دیوانی حیدرآباد اور ایک پروفیسر شیرانی کے پاس ہے، ۱۹۳۸ء مین جب کہ مین لکھنو مین مقیم تھا، اور شبلی اکیڈمی کی طرف سے تاریخ ہند کے لئے مواد حاصل کرنے کی غرض سے شمالی ہند کے کتب خانون کا دورہ کر رہا تھا، تو مجھے معلوم ہوا کہ راجہ صاحب سلیم پور کے پاس بھی قابلِ قدر کتب خانہ ہے،

راقم جناب راجہ صاحب بالقابہ کا بحد مشکور ہے، کہ انھون نے اپنے کتب خانہ سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمایا، اس کتب خانہ مین ابن خلکان کے فارسی ترجمہ کا ایک نسخہ نامکمل نظر سے گذرا، یہ کتاب وہان کی فہرست مین فن تاریخ کے نمبر ۱۰ پر ہے، اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:-

"آرایش دیباچہ مناقب و مآثر سلاطین رفیع مقدار و نمایش روزنامچہ خصائص و مفاخر خوانین گردون اقتدار۔۔۔۔۔الخ"

خط نستعلیق زبان فارسی، خوشخط، ½۱ بالشت طویل، اور ایک بالشت عریض کل صفحات (۹۰) ہین، اس کا آخری حصہ مفقود ہے، یعنی آخر سے ناقص ہے،

اس کا اختتام "سلطان صلاح الدین یوسف کے خرابی عسقلان بوقت جنگ صلیبی" پر ہوتا ہے، ظفر الوالہ مین اس کا نام "منظر الانسان" لکھا ہے[1] لیکن کتاب مذکور مین اس کا نام منظر الاعیان لکھا ہوا پایا، چونکہ ظفر الوالہ مین طباعت کی متعدد غلطیان موجود ہین، مثلاً کئی مقامون پر افغان کو اوغان لکھا ہے[2] اسی طرح کہین ارابہ اور کسی جگہ عرابہ تحریر کیا ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ ظفر الوالہ مین جو منظر الانسان لکھا ہے وہ بھی طباعت کی غلطی ہے، دراصل اس کا نام منظر الاعیان ہی ہوگا

ظفر الوالہ مین مصنف کا نام یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان دیا ہے[3] لیکن سلیم پور کے مخطوطہ مین یوسف بن احمد بن عثمان ہے یعنی عثمان اور احمد کے درمیان محمد کا نام نہین ہے، حضرت عثمان شمع برہانی کی وفات ۸۶۳ھ مین ہوئی ہے اور (۲۶) برس بعد اس کتاب کا ترجمہ ہوا، اس وقت مترجم کی عمر تقریباً تیس چالیس ہونی چاہئے، ان کے ایک اور پوتے تھے جن کا نام سید عالم تھا، اور ان کی شادی شیخ داؤد نبیرۂ حضرت رکن الدین شکر گنج کی لڑکی سے اس وقت

---

[1] ظفر الوالہ ص ۳۰ [2] کتاب مذکور ص ۲۳، [3] ظفر الوالہ ص ۳۲،

ہوئی تھی، جب کہ عثمان پورہ شہر سے باہر ابھی آباد نہین ہوا تھا،[۵]

محمود اعظم گجرات کا بہترین بادشاہ گذرا ہے، جس طرح دوارکا فتح کرنے کے بعد اس کی یادگار مین شفاے محمود شاہی کے نام سے واگھ بھٹ کا ترجمہ کرایا، اسی طرح جاپانیر کی فتح کے بعد اس نے ابن خلکان کی تاریخ کا ترجمہ کرنے کا حکم صادر کیا،

ابن خلکان کی نسبت یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے، کہ خلکان خاندان برامکہ مین سے تھا، وہ بات بات پر فخریہ کہتا، کہ میرے بزرگ برامکہ مین ایسے تھے، اور ویسے تھے، جب لوگ سنتے سنتے عاجز آگئے، تو انھون نے کہنا شروع کیا کہ "خل ما کان" (جو ہوگیا اس کو جانے دو) رفتہ رفتہ لوگ اس کو "خل ما کان" کہنے لگے، جو کثرت استعمال سے خلکان ہوگیا،[۵]

مترجم نے دیباچہ مین لکھا ہے، کہ فتح جاپانیر کی تاریخ ۸۸۹ھ ہے، اور اسی سال ترجمہ کا حکم ہوا لیکن اس کی ابتدا ۹۰۳ھ مین کی گئی، افسوس ہے کہ ڈاکٹر ریو نے یہ نہین بتایا، کہ شاہی حکم کا اجرا پانچ برس تک کیون ملتوی رہا، شخصی حکومتون مین شاہی احکام کا التوا بغیر کسی مخصوص وجہ کے نہین ہوسکتا، اصل حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانہ مین یہ کتاب بہت نایاب تھی، اتنی مدت اس کے متعدد نسخون کو تلاش کرنے مین صرف ہوئی ہوگی،

مولانا یوسف صاحب عثمان پورہ کے اس مدرسہ کے معلم تھے، جو شمع برہانی کے وقت مین قائم ہوا تھا، ان کی ساری عمر تعلیم و تعلم مین گذری، کسی کتاب کے ترجمہ کا تجربہ ان کو نہ تھا، اسی لئے پہلا ترجمہ ۹۰۴ھ مین کیا، اس مین اکثر جگہ متن کا خلاصہ اور اختصار کر ڈالا، عربی اشعار یا تو حذف یا بغیر ترجمہ کے نقل کر دیئے، غالباً اسی وقت اس کی متعدد نقلین بھی ہوئین، چنانچہ بعض کتب خانون مین اسکی نقل موجود ہے، اس مین بہت ہی مختصر دیباچہ ہے جس مین حمد و ثنا، نام بادشاہ، اور تاریخ فتح جاپانیر کے سوا کچھ نہین ہے،

پھر جب ۹۰۵ھ مین اس پر نظر ثانی کی تو اپنا دیباچہ علحدہ لکھا جس مین دستور کے مطابق بادشاہ کی مدح لکھی، اور عربی اشعار کا ترجمہ بھی کر دیا، لیکن مصنف کے دیباچہ کو حذف کر دیا، ترجمہ کے پہلے نسخہ کی نقل راجہ صاحب سلیم پور کے کتب خانہ مین اور دوسرے نسخہ کی نقل برٹش میوزیم مین ہے،

---

[۵] خاتمہ مرآۃ احمدی اردو لاہور ص۴۵ [۵] النور السافر عن اخبار القرن العاشر بغداد

اردو کی دو قدیم کتابین

از
جناب ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی، لکچرار اردو، لکھنؤ یونیورسٹی

"دیوان منعم اور مثنوی واقعات امامیہ کے زمانہ تصنیف کے بارہ مین جو موافق اور مخالف مضامین معارف مین شائع ہوئے تھے، اس سلسلہ مین جناب سید نور الحسن صاحب ہاشمی کی یہ ذاتی اور فیصلہ کن تحقیق موصول ہوئی ہے، اس لئے اس کی اشاعت کے بعد آیندہ اس سلسلہ مین اور کوئی مضمون شائع نہ کیا جائے گا" "م"

رسالۂ معارف شمارہ جنوری ۱۹۴۵ء مین دیوان منعم اور مثنوی واقعات امامیہ کے متعلق پھر محمد خلیل صاحب بی ایس سی علیگ کا مضمون نکلا ہے، چونکہ مین انجمن ترقی اردو کی طرف سے پچھلے سال ان کتابون کے جانچنے پر مامور کیا گیا تھا، اس لئے میرا فرض ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار ان کتابون کے متعلق کرون،

پچھلے سال جناب ولی محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ تجارہ عرس حضرت نظام الدینؒ اولیا مین شرکت کی غرض سے تشریف لانے والے تھے، تو قبلہ مولوی عبدالحق صاحب نے انھین لکھ دیا تھا، کہ اگر آپ اپنے ہمراہ یہ دونون کتابین لیتے آئین تو یہان دیکھنے پر واضح ہو سکے گا، کہ یہ کس عہد کی کتابین ہین، چونکہ مولوی صاحب قبلہ اُس زمانہ مین دہلی سے باہر جانے والے تھے، اس لئے یہ کام میرے سپرد کر گئے تھے،

مین نے مسجد قاضی حوض دہلی مین سجادہ نشین صاحب موصوف سے ملاقات کی؛ وہ صرف دیوان منعم اپنے ہمراہ لائے تھے، اور وہ بھی اوّل و آخر سے ناقص، اور بیچ کے اوراق بھی جگہ جگہ سے غائب تھے، مثنوی واقعات امامیہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کے برادر کلان اُسے دہرہ دون اپنے ہمراہ لے گئے ہین، بعد کو دکھائی جا سکے گی،

دیوان منعم کو ایک نظر ہی دیکھنے سے معلوم ہو گیا، کہ یہ وسط بارھوین صدی سے پیشتر کا کلام نہین ہو سکتا، ولی کی غزلون پر کئی غزلین اس مین موجود ہین، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ولی کے دیوان کے پہنچنے پر دلی مین، حاتم، آبرو، مضمون، احسن، فائز وغیرہ نے اردو مین شاعری اور دیوان سازی شروع کر دی تھی، اور شعر و شاعری کی دنیا مین ایک ہل چل مچ گئی تھی، منعم نے بھی اپنا دیوان دوسرے شاعرون کی طرح ترتیب دینا شروع کیا، یہ صحیح ہے کہ اس عہد کے شاعرون مین سے جس کا کلام یا مکمل دیوان دستیاب ہو جائے تو وہ اردو ادب و شعر مین ایک اچھا اضافہ کریگا، لیکن منعم کے دیوان کو دسوین صدی ہجری کا کلام بتانا سرتا سر غلط اور بے سر و پا بات ہے،

حالانکہ مثنوی واقعات امامیہ سجادہ نشین صاحب موصوف اپنے ہمراہ نہین لائے تھے، لیکن اس کی قدامت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے محمد خلیل صاحب نے اپنے مضامین مین غلام رسول صاحب مصنف مثنوی مذکور کو منعم کا چچا تبلایا ہے ظاہر ہے کہ اگر چچا بھتیجے کی عمر مین چالیس پچاس یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال کا فرق بھی فرض کر لیا جائے تو بھی غلام رسول صاحب کسی طرح ہمایون کے زمانہ تک نہین پہنچتے، اس کے علاوہ اُن اشعار سے بھی جو مثنوی کے نمونتہً پیش کئے گئے ہین، یہ مثنوی

فرخ سیر یا زیادہ سے زیادہ اواخر عہد عالمگیری سے پیشتر کی نہین معلوم ہوتی، خود محمد شاہ کے زمانہ تک اس قسم کے ریختون کا رواج رہا، اور جس کے نمونے بھی کافی ملتے ہین، جس مین افعال اور حروف روابط فارسی کے ہوتے ہین، خود میر نے بھی اس قسم کے ریختہ کا ذکر اپنے زمانہ کے اقسام ریختہ مین کیا ہے اور اس قسم ریختہ کو قبیح گردانا ہے،

مین نے اپنے یہ سب خیالات سجادہ نشین صاحب موصوف سے عرض کر دیئے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ باوجود اس کے کہ یہ چیزین خارجی اور داخلی شواہد کی بنا پر اتنی قدیم ثابت نہین ہوتین، جتنا کہ خیال تھا، پھر بھی اپنے عہد کا اچھا نمونہ ہین، بہتر ہوگا کہ آپ یا تو ان کی نقلیں انجمن کو بھجوا دین نقل کی اجرت انجمن کے ذمہ ہوگی، یا انجمن کے ہاتھ یہ نسخے فروخت کر ڈالین، کیونکہ وہان یہ چیزین زیادہ محفوظ رہ سکین گی، سجادہ نشین صاحب موصوف نے وعدہ بھی فرمایا تھا کہ وہ اپنے برادر بزرگ سے مشورہ کے بعد اپنے فیصلہ سے مطلع کرین گے، لیکن بعد کو باوجود یاد دہانیون کے سجادہ صاحب نے کوئی جواب عنایت نہین فرمایا، نہ خود ان چیزون کو شائع کرایا، نہ اس کے مزید نمونے کسی رسالہ میں شائع کئے،

مین اس کے بعد خاموش ہوگیا، کہ نصیر الدین صاحب ہاشمی کے مضمون اور راقم کی گفتگو کے بعد غالباً سجادہ نشین صاحب اس کی قدامت کے متعلق مزید کاوش نہ کرین گے، لیکن معارف شمارہ جنوری ۴۵ء مین پھر اس کوشش کو دیکھکر یہ مضمون سپرد قلم کرنا پڑا،

بہرحال اب رسالۂ ہذا کے ذریعہ پھر سجادہ نشین صاحب موصوف سے گذارش ہے کہ ان دونون کتابون کی قدامت کو خواہ مخواہ قدیم ترین مشہور کرانے کی کوشش نہ کیجائے، اگر ان کے پاس خارجی و داخلی ثبوت واقعی اس کے ہون تو بہتر ہوگا کہ وہ ان دونون کتابون کو ارباب بصیرت کے سامنے پیش کرین تاکہ عینی شاہدہ کے بعد کھوٹے کھرے کی تمیز یقینی طور پر ہو سکے، مولوی عبد الحق صاحب قبلہ کے خط نمبر ۹۴۳ ۵ کا حوالہ قدامت کے ثبوت مین دینا بالکل غلط طریقہ ہے، مولوی صاحب کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر مثنوی مذکور ہمایون کے عہد کی ہوئی تو واقعی قابل قدر ہوگی، اور چونکہ وہ نہین ہے اسلئے مولوی صاحب بھی اس کے قائل نہین ہو سکتے،

محمد خلیل صاحب نے یقین دلانے کی کوشش کی ہے، کہ مثنوی مذکور پر سنہ کتابت اور دیباچہ مین ہمایون کی تعریف وغیرہ درج ہے لیکن مجھے اب بھی گمان یہی ہے کہ خلیل صاحب کو مضمون کے سیاق و سباق نیز تاریخ کتابت مثنوی مذکور کو پڑھنے اور سمجھنے مین سہو ہوا ہے، بہتر ہوگا کہ وہ بالاستیعاب مطالعہ فرمائین، اور مکرر سہ کرر، کیونکہ قرائن ایسے ہین کہ کسی صورت سے یہ مثنوی اتنی قدیم نہین ہو سکتی جتنا کہ کہا جاتا ہے، رہا دیوان نعم تو اس کے متعلق تو کوئی گفتگو کی گنجایش ہی نہیں ہے، وہ وسط بارھوین صدی سے پیشتر کی چیز ہو ہی نہیں سکتی،

آخر مین پھر عرض کرونگا کہ ان چیزون کی صحیح قدر اسی وقت ہو سکے گی جب ان کی قدامت کے شواہد دوسرون کے سامنے عینی طور پر پیش کئے جائین،

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار اردو مین شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس مین آب حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، قیمت ﷲ ضخامت ۵۴۰ صفحے، "منیجر"

ادبیات

تابشِ سہیل

از جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

قفس مین بھی میری سعی پرافشانی نہیں جاتی
یہ فطرت کی تڑپ ظالم بہ آسانی نہین جاتی

نظرا سرار تک بے نورِ ایمانی نہیں جاتی
حقیقت پہلے مانی جاتی ہے جانی نہین جاتی

بصیرت وہ ہے جو ادراک کو حدِ نظر سمجھے
حقیقت وہ حقیقت ہے جو پہچانی نہین جاتی

رگِ سودا بہت کھولی جفائے حُسن نے لیکن
مزاجِ عشق کی شوریدہ سامانی نہین جاتی

شررتک بجھ چکے خاکسترِ دل کے مگراب تک
نگاہِ شوق کی آلودہ دامانی نہین جاتی

اگر ڈوبے تو گمنامی جو بچ نکلے تو رسوائی
وہ کشتی جو قریبِ موجِ طوفانی نہین جاتی

قیامت ہے جنون کی وادیِ پُرخار مین مرنا
یہ خاکِ پاک ہرنا اہل سے چھانی نہین جاتی

رہِ سعی و طلب مسدود گم ہین قافلے والے
سہیل اب تک مگر تیری حدی خوانی نہیں جاتی

غزل

از جناب عزیز احمد صاحب ہلال جھانسی

درد ہے، غم ہے، خلش ہے، آرزو ہے، یاد ہے،
دل کے ہر گوشہ مین اک دنیا نئی آباد ہے

صرف تو ہے دل مین یا پھر اک جہان آباد ہو
قید ہے اتنا ہی انسان جس قدر آزاد ہے

بے نیازانہ چلا آیا ہون بزمِ حُسن مین
شکر کرنا ہے کہ شکوہ یہ مجھے کب یاد ہے

شاد مانی کے لئے ناشاد رہتا ہے جہان
اور دل ناشاد رہنے کے لئے ناشاد ہے

شہرِ غم کچھ بھی نہین، قیدِ محبت کچھ نہین
آپ فرمادین جسے برباد وہ برباد ہے

عشق گویا ظاہر و باطن پہ ہے چھایا ہوا
لب پہ تیرا نام ہے دل مین بھی تیری یاد ہے

ڈوب کر دل سے نکلنا سحر ہے آواز کا
یہ خدا جانے کہ وہ نغمہ ہے یا فریاد ہے

جب چٹکتی ہے کلی جھکتا ہے سر دیوانہ وار
مین سمجھتا ہون کہ شاید مجھ سے کچھ ارشاد ہے

موت کیا ہے ان کی رحمت کا فرشتہ ہے ہلال
زندگی کیا خون مین ڈوبا ہوا جلاد ہے

مطبوعات جدیدہ

The Road to Peace and Pakistan (انگریزی)

جناب ضیاء الدین احمد صاحب سویری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ اوسط، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ؏، ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور،

یہ کتاب یورپ کی موجودہ جنگ کے خاتمہ سے پہلے لکھی گئی، لیکن مؤلف نے کتاب کو تحریر کرتے وقت یہ خطرہ محسوس کیا تھا کہ بڑی طاقتیں ایک بین الاقوامی نظام کا خواب دیکھ رہی ہیں، جس کے اقتدار سے کوئی ریاست باہر نہیں ہوگی، گویا ایک دوسری مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) قائم ہوگی جس میں پھر وہی تفریق اور کمزوروں پر طاقتوروں کا غلبہ ہوگا، اور یہ نظام آیندہ ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا، لائق مولف کا خیال ہے کہ گو سائنس کی ترقی نے دنیا کی ہیئت بدل دی ہے، اور دنیا کے مختلف ممالک پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کی حد بندیوں سے علٰحدہ اور دور نہیں کئے جا سکتے، لیکن ان ممالک کے باشندوں کے خیالات میں اب تک اتحاد پیدا نہیں ہو سکا، جس کا لازمی نتیجہ ان میں اختلاف ہے، چنانچہ آج دنیا کی فلاح و بہبود کا دعوٰی کرنے والے مفکرین کے سیاسی اتحاد سے پہلے انسانی خیالات کے اتحاد کا مسئلہ قابلِ غور ہے، مؤلف کی رائے ہے کہ دنیا کی بھلائی اس میں ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے ملکوں کا جو اپنے خیالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوں، ایک منطقہ قائم کیا جائے، سوویٹ روس کی متحدہ جمہوری ریاستیں اسی کی مثال ہیں، امریکہ اور برطانیہ کے اتحاد کی استواری اسی کا نتیجہ ہے، اسی اصول کے ماتحت مؤلف کا خیال ہے کہ اسلامی ریاستوں کا وفاق بھی قائم ہو سکتا ہے، ان منطقیانہ دلائل سے ہندوستان میں پاکستان کی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے، گو پاکستان کے مخالفین کے لئے یہ دلائل و مباحث قابل قبول نہیں کہے جا سکتے، مگر مولف کا طرزِ تحریر اور انداز بیان جذبات پر مبنی نہیں، بلکہ ہر مسئلہ کو سنجیدگی سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ کتاب اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے لائق مطالعہ ہے،

Through Pakistan to Freedom (انگریزی) از جمیل الدین احمد لکچرار

شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۳ صفحے، کاغذ اوسط طباعت بہتر قیمت ۱-۸؍ ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

جناب جمیل الدین احمد صاحب لکچرار شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی کو ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل سے گہری دلچسپی ہے، اس سے پہلے وہ ہندوستان کی آئینی گتھی، اور محمد علی جناح کی تازہ تحریریں اور تقریریں مرتب کرکے پیش کر چکے ہیں، اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست پر ان کی رائے قابلِ غور ہے، زیرِ نظر کتاب میں مؤلف نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے اسباب و علل کی تاریخ پر ہر زاویۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور پاکستان کے مخالفین کے اعتراضات سے بھی بحث کی ہے، انداز بیان متین و سنجیدہ ہے، گو پاکستان کی حمایت میں کہیں کہیں استدلال کی بنیاد کمزور ہے، مثلاً کسی انگریز کا خواہ کیسا ہی ذمہ دار عہدہ دار یا سیاسی مفکر کیوں نہ ہو، یہ کہدینا کہ مسلمان ایک علٰحدہ انفرادیت کے مالک ہیں

کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، مسلمان خود ایک مستقل مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام رکھتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ایک علیحدہ قوم ہو سکتے ہیں، تو اسی اصول پر اس بحث کی بنیاد ہونی چاہئے، ورنہ ایک انگریز کی موافق رائے کو دوسرے انگریز کی مخالف رائے سے معترضین آسانی سے رد کر سکتے ہیں،

The Arab Civilization از جوزف ہیل، مترجمہ صلاح الدین خدابخش تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۰ صفحے، کاغذ اوسط طباعت بہتر قیمت سے ۲ ناشر شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار لاہور،

یہ کتاب جرمنی کے مشہور مستشرق ڈاکٹر جوزف ہیل کی تصنیف ہے، جس کو صلاح الدین خدابخش مرحوم نے جرمن زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، بعض یونیورسٹیوں میں یہ تاریخ اسلام کے نصاب میں داخل ہے، اس لئے شیخ محمد اشرف لاہور نے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی جامعہ ملیہ دہلی سے ۲۹ء میں شائع ہو چکا ہے، مگر اس کتاب میں جرمن مصنف نے اپنے مستشرقانہ تبصرہ میں کچھ ایسے قیاسات و نتائج استنباط کئے ہیں جن کا مقصد دلنشین پیرایہ میں مسلمانوں کے مذہب، تاریخ اور تمدن کے خلاف محض زہر چکانی ہے، گو فاضل مترجم جناب صلاح الدین خدابخش نے جابجا تردیدی حواشی ضرور لکھ دیئے ہیں، مگر وہ بالکل ناکافی ہیں، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانوں میں جب انگریزی اور اردو کے ذریعہ سے اس کتاب کو روشناس کرنے کی کوشش کی گئی تو اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں، چنانچہ معارف (مئی ۳۹ء) میں بھی اس پر ایک بہت ہی طویل تبصرہ شائع ہو چکا ہے جس کا اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہے، لیکن جن یونیورسٹیوں میں یہ کتاب نصاب میں پڑھائی جاتی ہے، وہاں کے اساتذہ خصوصاً مسلمان اساتذہ سے یہ گذارش ضرور ہے، کہ اگر اسلام کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کتاب کو اہمیت دی گئی تو یہ اسلام سے سراسر نادان دوستی ہوگی،

A Shi'ite Creed (انگریزی) مترجمہ جناب اے۔ اے۔ اے فیضی، ضخامت ۱۴۴ صفحے، کاغذ و طباعت بہتر، قیمت ندارد، ناشر اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، بمبئی،

یہ رسالہ شیعوں کے مشہور مجتہد عالم ابوجعفر محمد بن علی ابن بابویہ القمی المعروف بہ شیخ صادوق کی کتاب رسالۃ الاعتقادات الامامیہ کا انگریزی ترجمہ ہے، مصنف اثنا عشری شیعوں کے بڑے مستند عالم سمجھے جاتے ہیں، اور ان کی یہ تصنیف شیعی عقائد کی تشریح و توضیح میں بڑی قدیم کتاب سمجھی جاتی ہے، مترجم نے کئی نسخوں کی مدد سے انگریزی ترجمہ کیا ہے، شروع میں مصنف کے حالات اور ان کی تصانیف پر مفید معلومات ہیں اور انگریزی متن کے ساتھ ضروری حواشی بھی ہیں۔

پارلیمانی طرز حکومت از جناب منظور الحسن صاحب ہاشمی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ ر پتہ دار الاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین، اشاعت منزل اردو گلی حیدرآباد دکن،

موجودہ ضروریات کے پیش نظر حیدرآباد کے ادارہ دار الاشاعت سیاسیہ نے سیاسیات پر چھوٹے چھوٹے مفید رسالوں کا سلسلہ شروع کیا ہے، مذکورہ بالا کتاب پارلیمانی طرز حکومت پر ہے، اس میں اس طرز حکومت کا اجمالی خاکہ بیان کرکے برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا کی جمہوریتوں کے نظام اور اس کے اجزاء پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے پارلیمانی حکومتوں کے دستوری نظام کا اندازہ ہو جاتا ہے، برطانوی نظام کے حالات کسی قدر تفصیلی ہیں، آخر میں چند سیاسی اصطلاحات کی تشریح ہے جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں کتاب گو مختصر ہے لیکن مفید ہے،

"ع - ۱"

[illegible]

[illegible]

۱- [illegible]

[illegible]

۲- [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۳- [illegible]

[illegible]

۴- [illegible]

۵- [illegible]

[illegible]

[illegible]

۶- [illegible]

[illegible]

۷- [illegible]

۸- [illegible]